احتساب

۱۹۷۸ ـ ۷۹

"جبر کے ماحول میں، پرندے تک اپنے
گھونسلوں میں مرجاتے ہیں۔"

(حدیثِ نبوی)

"ایک انگلی بندوق کی لبلبی پر ہے
ایک آنکھ نشانہ باز پر جمی ہے
ایک سپاہی کی انگلی
کہ جو یورپ ایشیا
چین، افریقہ
ہندوستان اور سمندروں
کے دریاؤں اور زبانوں کے اس پار تک نشانہ مارتی ہے
ہمیں اپنی انگلیاں مجتمع کرنی چاہئیں
کہ وہ اس انگلی سے طاقت چھین لیں
کہ جو انسانیت کو نوحہ کناں رکھتی ہے"

عثمانے سمبین ——— سینی گال





احتساب

مرتب

عبداللہ ملک

جلد نمبر ۸

مارچ، اپریل، مئی ۷۹ء

شمارہ ۲، ۳، ۴

تعداد
گیارہ سو
تزئین
انور سجاد
طباعت
پرنٹ آرٹس
قیمت
۲۵ روپے

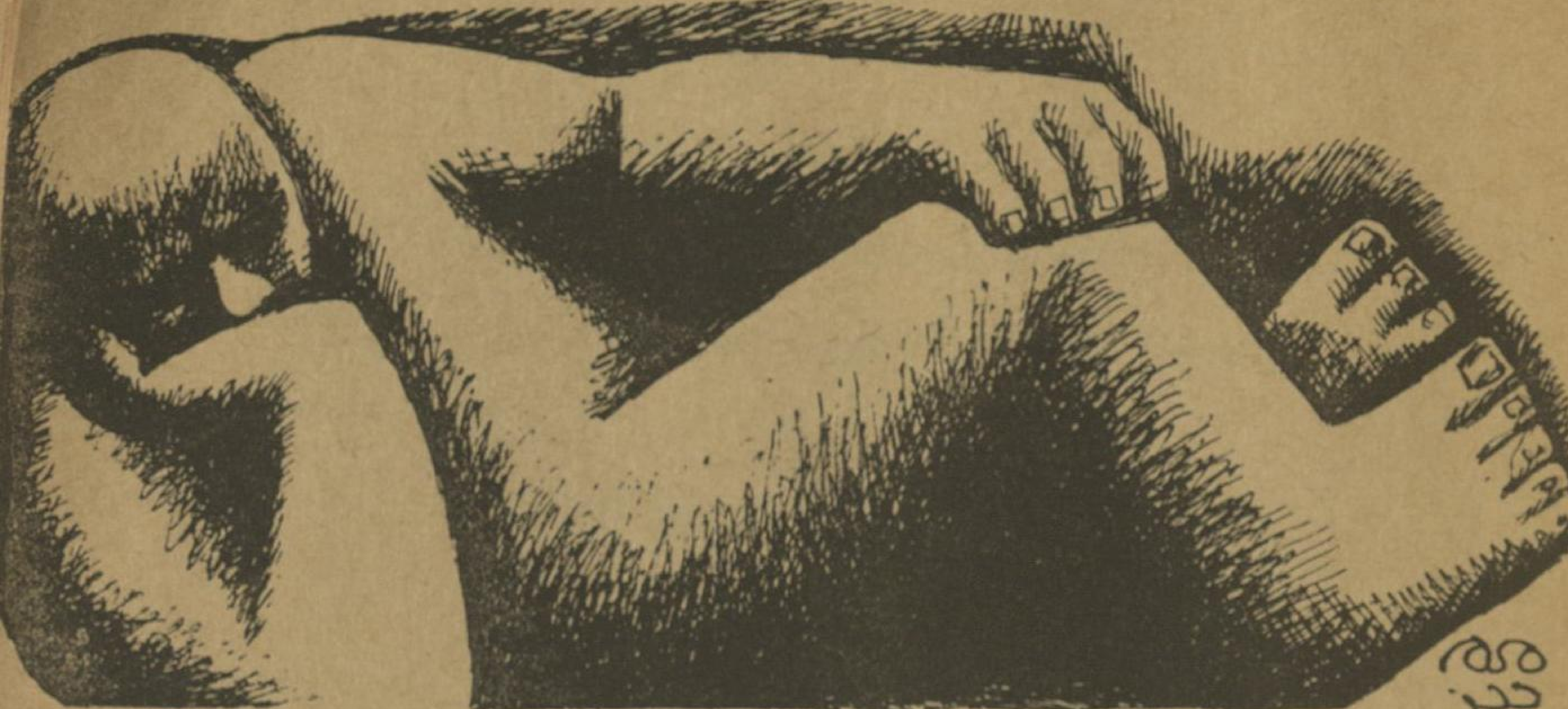


یہ انتخاب ان تمام ادیبوں کے نام
معنون ہے کہ جن کی تخلیقات اِس
میں شامل ہیں۔
قلم کی سر بلندی کی قسم ہم اور آپ لفظ
کے جہاد میں ایک ہیں۔

فون۔ ۸۵۱۴۰۰

رجسٹرڈ ایل نمبر: ۷۹۵۳

پبلشر:۔ چاندنی بیگم نے پرنٹ آرٹس کارواں بلڈنگ لنک میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر
دفتر ۴۶۔ شوکت حیات کالونی ماڈل ٹاؤن لاہور سے شائع کیا۔



ترتیب

احتساب کیوں؟

زندگی اور ادب کے رشتوں کی بحث تو اب قریب قریب ایک صدی پرانی ہو چکی ہے، اور بغیر اعلان کئے اب اس بحث کے نتائج بھی مرتب ہو چکے اور اس بحث کا فیصلہ بھی سنایا جا چکا اور لکھنے والوں کی پوری ایک نسل نے اسے تسلیم بھی کر لیا۔ یہ بھی بات پرانی ہو چکی کہ ادب میں کومٹ منٹ لازمی ولابدی ہوتی ہے، الجزائر کی جنگِ آزادی اور ویت نام کی امریکہ کے خلاف جدوجہد کے دوران ہمارے ہاں یہ سوال بہت شدت سے اٹھایا گیا تھا اس پر بہت تند و تیز لہجوں میں بحثیں ہوئی تھیں اور وقت نے اس بحث کا بھی فیصلہ سنا دیا ہے اور اب اعلان ہو یا نہ ہو غزل ہو یا نظم، افسانہ ہو یا ڈرامہ کسی نہ کسی انداز میں اور کسی نہ کسی حد تک اس کومٹ منٹ کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔

بہرحال کسی بحث میں الجھنا مقصود نہیں بلکہ صرف اتنا کہنا مقصود ہے کہ احتساب کا اجرا بھی ایک کومٹمنٹ ہے، ایک عہد ہے۔ اس عہد سے وفاداری کا اعلان ہے۔ یہ کومٹ منٹ، یہ عہد، اس عہد سے وفاداری کا اظہار آپ کو ان صفحات میں یقیناً ملے گی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے بہت سی جبینوں پر شکنیں ابھر آئیں گی، کچھ کے ہونٹ غصّے سے کپکپانے بھی لگیں گے اور کچھ حلقوں میں غیظ و غضب کا اظہار بھی ہوگا۔ لیکن یہ ہمارا مقدر ہے اور اس مقدر کو ہم ایک ربع صدی سے تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم نہ کسی ردِّ عمل سے گھبرائیں گے نہ پریشان ہوں گی۔ ہر جائز ردِّ عمل کو تسلیم کریں گے، ہر صحیح نکتہ چینی کو ہم قبول کریں گے۔ اپنی ہر غلطی کی نشاندہی ہم کو دل و جان سے قبول ہو گی۔

یہ تو تھا معاملہ کومٹ منٹ کا! لیکن احتساب میں ہم نے اس کومٹ منٹ کے اظہار کے لئے نئی راہوں کا اظہار کیا ہے، ہمارے ہاں مختلف دنیاؤں کا تذکرہ پوری دنیا کی طرح عام ہے، لیکن ہم نے کبھی بھی ان دنیاؤں کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ مثلاً ہم یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ ایک تیسری دنیا ہے یہ مجبوروں اور مقہوروں کی دنیا ہے، یہ پسماندہ اور پسے ہوئے لوگوں کی دنیا ہے لیکن آج اس دنیا میں ہنگامے پر ہنگامہ برپا ہو رہا ہے، سماجی تبدیلیوں کا سلسلہ جاری ہے، انقلاب کی آندھیاں چل رہی ہیں اور شہنشاہوں کے تاج و تخت الٹے جا رہے ہیں۔ افریقہ ہو یا ایشیا، لاطینی امریکہ ہو یا مشرقِ وسطیٰ کوئی بھی ان آندھیوں کی لپیٹ سے محفوظ نہیں ہے۔

تو پھر ان ممالک کے متعلق، ان کی زندگی کے بارے میں، زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بارے

میں ہم کتنا جانتے ہیں؟ ہم ان کے گوریلوں کے بارے میں، ان کی جہدِ آزادی کے بارے میں، اس جہدِ آزادی کے دوران تخلیق ہونے والی نظموں، افسانوں، ڈراموں کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟ جنگلوں میں لڑی جانے والی اُن لڑائیوں کے دوران میں بنائی جانے والی فلموں کے متعلق ہم کیا جانتے ہیں؟ ہم کو دن رات یہ بھی سُنا دیا جاتا ہے کہ ان ممالک میں ان دور دراز خطوں میں کمیونسٹ گڑبڑ کر رہے ہیں، لیکن ہم ان کمیونسٹوں کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟ سچ یہ ہے کہ ہمارا مبلغ علم امریکی رسائل ٹائمز، نیوز ویک اور بی۔ بی۔ سی کی نشریات تک محدود ہوتا ہے۔ اور ہمارے تمام اخبارات انہی مغربی ذرائع کے حدود و قیود میں مقید ہوتے ہیں اور ہم شعوری طور پر مغرب کے پراپیگنڈا کے اسیر ہوتے ہیں ایران کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں اُن کے حوالے سے ہی افغانستان کے متعلق جو مانتے ہیں وہ بھی انہی کے حوالے سے غرضیکہ ہم مختلف ممالک میں لڑی جانے والی قومی آزادی کی لڑائیوں، مختلف ممالک میں بپا ہونے والے انقلابوں کے بارے میں جو بھی کچھ جانتے ہیں وہ ان ذرائع سے ہی جانتے ہیں۔ جن ذرائع کے مالکوں کے خلاف یہ لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں اور جن سامراجی عناصر کے خلاف انقلاب بپا کئے جا رہے ہیں ہم انہی سامراجی عناصر کی ملکیت ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے سچ اور جھوٹ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم ٹھوکر کھاتے ہیں اور ہماری سوچ غیر شعوری طور پر ان سامراجیوں کی سوچ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، یہ ایک مہلک عمل ہے جو جاری و ساری ہے۔

اس لئے ہم احتساب کے ذریعے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس لحاظ سے ہم یہ یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ "احتساب" پاکستان کے ادب اور صحافت میں ایک نئی قسم کا رسالہ ہے۔

ہاں تو یہ نیا پن کیا ہے؟

یہ نیا پن ہے۔

- ہم دنیا میں۔ تیسری دنیا میں رونما ہونے والی قومی آزادی کی تحریکوں کو مغربی ذرائع ابلاغ کے توسط سے ہی نہیں دیکھیں گے بلکہ ان ممالک میں لڑی جانے والی لڑائیوں کے رہنماؤں، ان کی جماعتوں، ان کے قائدین کے اپنے افکار کو جوں کا توں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔
- ان ممالک کے اندر تخلیق ہونے والا ادب، آرٹ اور شاعری کے نمونے پیش کریں گے اور ان پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔
- ہم ان صفحات میں سامراجی اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور سرمایہ داری نظام کے مظہر ممالک کے اندر کی تحریکوں کا بھی ذکر کریں گے۔ ان کے ادب اور شاعری سے بھی روشناس کرائیں گے۔
- ہم ان صفحات میں سوشلسٹ ممالک کی دنیا کے اندر بھی جھانکیں گے اور ان کی زندگی کے بارے میں بھی بتائیں گے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں، کیسے رہتے ہیں، کب ادب تخلیق کرتے ہیں؟ آخر پورے مغربی اخبارات اور ان کے دیکھا دیکھی ہمارے اخبارات بھی ان کے خلاف کیوں دن رات ایک کئے ہوتے ہیں؟
- ہم پاکستان کے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ یہاں کی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں تحقیقی مضامین شائع کریں گے۔

- ہم پاکستان اور دوسرے ممالک کی فلموں اور ٹیلی ویژن میں نئے رجحانات اور نئے اسلوب کے بارے میں بھی مضامین شائع کریں گے۔
- ہم دنیا بھر میں عورتوں کی طرف سے اپنی آزادی، جمہوریت اور مساوات کی لڑائیوں کا بھی بھرپور تذکرہ کریں گے، ہم اس جدوجہد کے دوران جنم لینے والی نظموں اور کہانیوں کو بھی ان صفحات پر شائع کریں گے،
- عالمی صحافت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی ہم ذکر کریں گے، ہم یہ بحث کریں گے کہ ہمارے ہاں اور دوسرے ہم جیسے ملکوں کی صحافت کتنی آزاد ہے۔

ان عزائم کے ساتھ ہم احتساب کا اجراء کر رہے ہیں، یہ عزائم بہت بلند ہیں، ہمارے وسائل بہت ہی محدود ہیں، ہمارے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں لیکن پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیروں کا بھی پورا پورا احساس ہے۔

اس پہلی شمارے میں ہم نے پاکستان، ہندوستان، ویت نام، ایران اور افغانستان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

پاکستان کی سیاست کے سلسلے میں "بھٹو بنام جنرل ضیاء الحق" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون دیا جا رہا ہے اس کے ساتھ ہی ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء میں پاکستان کے اندر تخلیق کیا جانے والا بہترین ادب بھی شامل کیا جا رہا ہے، اس کے ساتھ ہی تمام علاقائی زبانوں کے شہ پارے بھی شامل کئے گئے ہیں۔

ہندوستان کے سلسلے میں غالباً پہلی بار اردو ادب کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں بنگالی، مرہٹی، تیلگو، ہندی اور پنجابی کی نظمیں اور افسانے دیئے جا رہے ہیں۔

اسی طرح سے ویت نام اور چین کی جنگ کا تذکرہ کے ساتھ ہی پہلی بار امریکی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے چینی کمیونسٹ پارٹی کے نام ایک حالیہ مکتوب بھی دیا جا رہا ہے۔

ایران کے انقلاب کے سلسلے میں ایرانی کمیونسٹ پارٹی جو تودہ پارٹی کے نام سے موسوم ہے کے قائدین کے مقالات اور انٹرویو دیئے جا رہے ہیں۔

افغانستان کے انقلاب کے سلسلے میں ایک تفصیلی مضمون دیا جا رہا ہے اور ساتھ افغان انقلاب کے قائدین جن میں افغانستان کے صدر اور حکمران خلق پارٹی کے سیکرٹری جنرل نور محمد ترکئی اور افغانستان کے وزیر اعظم حفیظ اللہ امین کے مقالات اور رپورٹیں دی جا رہی ہیں۔ جن میں افغان انقلاب کے خصوصی کردار پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے اور "علماء اور مشائخ" کی مخالفت اور مزاحمت کا پس منظر بھی دیا گیا ہے۔

ویسے یہ رسالہ ماہ نامہ ہے لیکن جس قسم کا ہم رسالہ نکالنا چاہتے ہیں اس کے لئے فی الحال ہر ماہ اتنا مواد حاصل کرنا خاصا وقت طلب ہے۔ اس لئے فی الحال ہم اس سال ہر سہ ماہی کے بعد ایک شمارہ شائع کیا کرینگے پہلا شمارہ جو آپ کے ہاتھ میں اپریل میں آیا ہے، دوسرا شمارہ انشاء اللہ جولائی میں آجائے گا، تیسرا اکتوبر میں اور چوتھا جنوری ۱۹۸۰ء میں۔ اس کے بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ ہم یہ رسالہ آپ تک پہنچا سکیں۔

ہم اس پہلے شمارے میں جو مواد دیا ہے وہ اپنی جگہ بہت ہی اہم ہے لیکن اس کے باوجود اس میں بہت سا مواد وقت پر نہ مل سکنے کی وجہ سے ہم شامل نہیں کر سکے۔

اس دفعہ ہم فلم اور ٹیلی ویژن کے سلسلے میں مضمون نہیں دے سکے، نہ ہی ہم عالمی پیمانے پر بڑی جانے والی خواتین کی جمہوری تحریک کے بارے میں ہی کچھ دے سکے ہیں، اس طرح سے اور بھی کوتاہیاں رہ گئی ہیں لیکن اگلے شماروں سے یہ خامیاں ہم دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، کیونکہ ہم افریقہ، لاطینی امریکہ، جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ، امریکہ، یورپ اور سوشلسٹ ممالک میں اپنے خصوصی نامہ نگار متعین کر رہے ہیں وہاں سے بھی سیاست و ادب، فلم، ٹیلی ویژن، شاعری اور ڈرامہ سے متعلق مواد بھیجتے رہیں گے، اس طرح سے ہم اس رسالے کو اپنے محدود ذرائع کے باوجود ایک ہمہ گیر رسالہ بنانے کا عزم رکھتے ہیں، ہم کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، اس کا انحصار قاری اور اہلِ قلم کے تعاون پر ہے۔ اور ہم سب کے تعاون کے خواہاں ہیں، ہم اس رسالے کی زینت میں ان تمام دوستوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے مواد کی فراہمی، ترتیب، تراجم اور ترتیب میں ہماری مدد ہی نہیں کی بلکہ رہنمائی بھی فرمائی۔

آخر میں ایک اور تشکر کا اظہار کرنا ہے، اس شمارے میں پاکستان اور ہندوستان کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات ہم نے جمع کی ہیں، ہم ان سے فرداً فرداً اجازت نہیں لے سکے لیکن صرف اس اعتماد پہ کہ ان کا ہمارا درد مشترک ہے اسلئے ہم نے یہ جسارت کی ہے اور اس امید پر کہ وہ ہماری اس کوتاہی کو کھلے دل سے معاف کر دیں گے، باقی جن ادیبوں اور شاعروں کی غیر مطبوعہ نگارشات ہیں ان میں سے اکثر نے تو اس رسالے کے سلسلے میں ہمارے درد اور ہماری کاوش کو اپنی کاوش سمجھا ہے اور ہم نے مشترکہ طور پر اس بار کو اٹھانے کا عہد کیا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔

عبداللہ ملک

پاکستان







”رات، محض سونے سے مختصر نہیں ہوتی ہے
اور دن محض غلط کاموں سے
دن نہیں بنتا ہے۔“

(حدیث نبوی)

فیض احمد فیضؔ

اے اہلِ قلم تم کس کے ساتھ ہو؟

"چند برس ہوئے جب مَیں کراچی میں تھا۔ مَیں نے چند لکھنے والوں کو آمادہ کیا کہ وہ دوسرے لکھنے والوں کو ایک پیغام دیں (یہ پیغام مَیں نے تیار کیا تھا) اس وقت اس پیغام کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب مَیں وہی پیغام اس امید کے ساتھ دوبارہ شائع کر رہا ہوں کہ شاید چند لکھنے والوں کو اس سے تحریک ہو اور وہ مل کر کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔"

وہ اس عہد میں دُنیا بھر کے عوام کا وفادار ہے اس کا کام ہے کہ وہ عوام کے دشمنوں اور دوستوں میں امتیاز کرے اور عوام کو ان کی پہچان کرائے اور انہیں بتائے کہ کون انہیں آزادی دلانے ان کی زندگی میں حسن اور پاکیزگی لانے ہر قسم کے استحصال کو ختم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور کون انہیں غلام بنانے انہیں لوٹنے انہیں کرپٹ کرنے اور ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں مصروف ہیں اور مکر و فریب اور ظلم و جبر سے اپنے اقتدار کی عمر بڑھانے میں لگے ہوتے ہیں۔

پاکستان کے سنجیدہ لکھنے والوں کو بلا خوف و خطر اور برملا سچی باتیں کہنا چاہئیں اور اظہارِ رائے کی آزادی پر عمل کرنا چاہیئے۔ انہیں جبر اور ظلم کو بے نقاب کرنا چاہیئے۔ اور جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں انہیں ننگا کرنا چاہیئے۔ اور سماجی معاشی اور ثقافتی منافقت کو بے نقاب کرنا چاہیئے۔

آج لکھنے والوں کا کام یہ ہے کہ وہ سامراج نسل پرستی۔ نوآبادیاتی نظام اور جدید نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کریں اور مشرق و مغرب کے عوام سے محبت کریں اور آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے عوام کی پُرزور حمایت کریں۔

انہیں سامراج کی مداخلت، سازش اور غارت گری اور جنگی تیاریوں کی مخالفت کرنی چاہیئے اور آزادی اور امن کی حمایت کرنی چاہیئے۔

ہمارے نزدیک لکھنے والوں کو آزادی ملنی چاہیئے کہ وہ اپنی نجات کا راستہ خود تلاش کریں اور ان پر کسی خاص سیاسی پروگرام کو ماننے کی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔

لیکن ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ اُوپر لکھی ہوئی باتیں وہ کم از کم باتیں ہیں جنہیں سب لکھنے والوں کو

قبول کرنا ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے تمام لکھنے والے جو اوپر لکھی ہوئی باتوں کو زیرِ بحث لانے کے لیے تیار ہیں مل بیٹھیں اور اپنے تخلیقی کاموں کے لیے ایک نیا عہد نامہ تیار کریں جو آج کے لکھنے والوں کی راہ نمائی کرے اور نئی نسل کے فکری دھاروں اور تخلیقی کاموں میں مشعلِ راہ کا کام دے۔ اور عوام شعور کی روشنی سے منور ہو کر اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں۔

ہم عصر لکھنے والو! ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ کیا آپ پاکستان میں ہونے والے تخلیقی کام سے مطمئن ہیں۔ کیا آج کے لکھنے والوں کے ہاں وہی سرخوشی اور وہی کرب موجود ہے جو آزادی سے پہلے کے اس برِصغیر کے لکھنے والوں کے ہاں تھا۔ (جن میں شاید آپ بھی شامل ہوں۔)

کیا ان کے الفاظ میں وہی حُسنِ ترتیب اور تخیل میں وہی بلندی اور صفائی موجود ہے۔ کیا ان کے ہاں تجربے اور شخصیت میں وہی ہم آہنگی، وہی جرأت وہی صداقت وہی محبت وہی ترحم اور خوش آئند مستقبل میں وہی پُر امید اعتماد موجود ہے۔

کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ آج لکھا جا رہا ہے اس کا بڑا حصّہ بے مقصد اور سطحی ہے اور نظریاتی الجھنوں سے بھرا ہوا ہے اس میں جن جذبات کا اظہار ہوتا ہے وہ اخلاص سے عاری ہیں۔ اس میں لالچ اور ہوس جھلکتی ہے اس میں خوف پایا جاتا ہے۔ ہمارے ادب میں یقین اور اعتماد کی کمی ہے اور یہ کمی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے ادب میں منافقت اور زندگی سے بیزاری کی بھرمار ہے۔

اگر پہلے سوال کا جواب نفی میں ہے اور دوسرے سوال کا جواب ہاں میں ہے تو کیا اب وقت نہیں آ گیا ہے کہ ہم سب سر جوڑ کر بیٹھیں، اور اس کے بارے میں کچھ کریں۔ غور کا مقام یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ ہمارے خیال میں ہم لکھنے والوں کے لیے بنیادی اصول وضع کریں تاکہ وہ اپنی ذات کو دریافت کر سکیں۔ اور اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کو نبھا سکیں۔

ایک طرح کی سوچ رکھنے والوں کے درمیان پھر سے تعلق جوڑا جائے اور ان میں رفاقت قائم کی جائے تاکہ لکھنے والے تنہائی اور بیگانگی کے خول سے باہر نکلیں۔

ہمارا یقین ہے کہ ہر سنجیدہ لکھنے والا کومٹ منٹ رکھتا ہے اس کی اپنی ذات سے وابستگی ہوتی ہے اور اپنے فن سے ہوتی ہے۔ اسے اس کی وفاداری کو جو اسے اپنی ذات اور فن سے ہے نبھانا چاہیئے۔ اور کسی قسم کے خوف سے اپنی وفاداری اور اپنی رائے ترک نہیں کرنی چاہیئے۔ موقع پرستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے اسے چند ٹکوں کے عوض اپنا فن اور اپنا نظریہ نہیں بیچنا چاہیئے۔

اسے اپنے تجربات اور مشاہدات سے بیوفائی نہیں کرنی چاہیئے اور نہ اسے مصلحت آمیز رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور نہ کوئی بیرونی دباؤ قبول کرنا چاہیئے۔

لکھنے والا اپنے ملک اور اپنے عوام کا وفادار ہوتا ہے اور وہ عوام کا دوست اور ان کا دانشور اور ان کا راہ نما ہوتا ہے اس کا کام ہے عوام کو جہالت، توہمات، روایات اور تعصبات کے اندھیرے سے نکالنا اور علم و دانش کی روشنی کی طرف لے جانا۔ اور اس کا کام ہے عوام کو جبر سے آزادی کی طرف اور مایوسی سے امید کی طرف لے جانا۔

صنم دکھلائیں گے راہِ خدا

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ، ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ، ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل ، حسابِ خون بہا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ، ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں ، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ، ایسے نہیں ہوتا

بازی ہے اب کے جان سے بڑھ کر لگی ہوئی

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستم گر لگی ہوئی
جیتے تھے یوں تو پہلے بھی ہم جاں پہ کھیل کر
بازی ہے اب کے جان سے بڑھ کر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
"کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی"

فیض احمد فیض

دلِ من مسافرِ من

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا

ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
جو بلا نہ کوئی پرساں
بہم التفات کرنا

تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

احمد ندیم قاسمی

غزل

عالمِ ہجر میں سویا ہوں نہ سونا چاہوں
میں تری ذات سے مایوس نہ ہونا چاہوں

گل ترے دل میں کھلیں اور مہک جاؤں میں
اسی رشتے میں ہر انسان کو پرونا چاہوں

کیوں گوارا ہو ترے درد میں بھی شرکتِ غیر
تو جو یاد آئے تو تنہائی میں رونا چاہوں

چھا رہا ہے مرے اندر غمِ انجام کا ابر
خوش بھی ہوتا ہوں تو آنکھوں کو بھگونا چاہوں

میں ہوں اک طرفہ بھکاری کوئی میری بھی سنو
رات کے فرش پہ کرنوں کا بچھونا چاہوں

میرا منصب نہیں پیغمبرِ فن بننے کا
میں تو احساس کو لفظوں میں سمونا چاہوں

اِس زمانے کا عجب طرزِ تصوف ہے ندیمؔ
کہ میں قطرے میں سمندر کو ڈبونا چاہوں

احمد ندیم قاسمی

مرا طرزِ مسلمانی

میں قرآن پڑھ چکا تو اپنی ہی صورت نہ پہچانی
مرے ایمان کی ضد ہے مرا طرزِ مسلمانی
ہے صدیوں سے بسیرا مسندِ اضداد پر میرا
مرے اعمال جامد ہیں مرے اقوال طوفانی
ارادے منفعل ہیں آرزوئیں مضمحل میری
عدوئے ارتقا ہے میرے روز و شب کی یکسانی
عجب کیا ہے مجھے میرے مقاصد ہی سے اکتا دے
مرا ذوقِ خود آرائی مرا شوقِ تن آسانی
خدا اس پر بھی جانے کیوں اُفق پر مسکراتا ہے
قبائے شب سے جب چھنتی ہے صبحوں کی زرافشانی

تخلیق و ترجمہ
گل خان نصیر

بلوچی سے ترجمہ

ہوس

اس میں شک نہیں کہ
دُرنژاد حسیناؤں کے نظارے بہت ہی دلکش ہوتے ہیں
لیکن اس دنیا میں جو کامیاب و کامران انسانوں کی دنیا ہے

جہاں آزاد منش لوگوں نے اپنی چاہتوں اور تمناؤں کے مطابق خود اپنی دنیا بسائی ہے
اس میں بھی شک نہیں کہ اسے خون سے رنگین کیا ہے
مگر ان لوگوں کے خون سے جو غریبوں اور مظلوم محنت کشوں کا شکار کیا کرتے تھے

اس میں کیا حرج ہے اگر دو سو کانٹے نکال دیئے جائیں
اور گلستان کو گل اندا موں کے لئے بہشت بنا دیا جائے

کبھی کبھی میں کہتا ہوں کہ خون اور پسینے کی تیز بُو
دن[1] اور زباد[2] کی خوشبو سے کمتر نہیں ہوتی

کبھی کبھی میں کہتا ہوں کہ وہ زندگی جو زندان میں گزرتی ہے
اس زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے جو قبادوں (سرمایہ داروں) کا محتاج رہ کر گزاری جائے

۱۔۲ یہ دو مقامی عطریات جو عورتیں گھروں میں خود بناتی ہیں۔

کبھی کبھی میں کہتا ہوں کہ گولیوں کی سنسناہٹ
زندہ باد کے نعروں سے زیادہ خوش آہنگ ہوتی ہے

میں کہتا ہوں کہ شبِ سیاہ، قیر (تارکول) کی طرح اور زیادہ سیاہ ہو
تا کہ جب روزِ حساب آجائے تو زیادہ تند اور تیز حساب لیا جائے

زمانہ سو طرح اور سو رنگ کے جلوے دکھاتا ہے
مگر میں کیا کروں کہ میرے دل کو رعد و برق اور طوفانوں کی ہوس ہے

یقین کرو کہ میں خود اپنے دل کا حال نہیں جانتا
کبھی تو وہ نازوں اور اداؤں کا شکار ہوتا ہے
اور کبھی نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے

کبھی پتھر اور فولاد کی طرح سنگین اور سخت ہوتا ہے
اور کبھی حسیناؤں کے عارضِ گلگوں کی طرح نرم اور نازک بن جاتا ہے

نصیرؔ کی زبان اس لئے کڑوی کسیلی لگتی ہے
کہ بھوکے ننگے انسانوں کے لئے اس کا دل رکھتا ہے

منیر نیازی

گھر بنانا چاہتا ہوں

گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں
دامنِ کُہسار میں یا ساحلِ دریا کے پاس
اُونچی اُونچی چوٹیوں پر سرحدِ صحرا کے پاس
متفق آبادیوں میں وسعتِ تنہا کے پاس
روزِ روشن کے کنارے یا شبِ یلدا کے پاس
اس پریشانی میں میرا راہ بر کوئی نہیں
خواہشیں ہی خواہشیں ہیں اور ہنر کوئی نہیں
گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں

غزل

شکارِ گردشِ لیل و نہار وہ بھی تھے
سکوں ہمیں بھی نہ تھا بے قرار وہ بھی تھے

(ق)

سزا قبول مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے با اختیار وہ بھی تھے

سوادِ شہر سے بھی خاک اُڑ گئی جن کی
کبھی تمہاری طرح شہریار وہ بھی تھے

وہ جن کے ہم تھے خطاوار فردِ جرم کے بعد
لگی قطار تو ہم میں شمار وہ بھی تھے

تھے کل جو مسندِ قاتل پہ جلوہ فرما آج
ہمارے ساتھ سرِ تختۂ دار وہ بھی تھے

ظہیر کاشمیری

غزل

بے سبب بیٹھے رہے دیدۂ بیدار کے ساتھ
ظلمتیں کم نہ ہوئیں، صبح کے آثار کے ساتھ

ہم ہواخواہِ چمن آج بھی یہ سوچتے ہیں
گل نے کیوں پیار کیا شاخ کی تلوار کے ساتھ

ابھی کچھ اور کڑی دھوپ میں چلنا ہو گا
ربط اتنا نہ بڑھا سایۂ دیوار کے ساتھ

ہم وہی کشتۂ بیدادِ خزاں ہیں جو کبھی
رقص فرماتے رہے، نکہتِ گلزار کے ساتھ

ورنہ ہم کیا تھے جو اعزازِ اسیری ملتا
متصل حلقۂ زنداں تھا درِ یار کے ساتھ

کھل گئے پھر لبِ منصور انا الحق کے لئے
پھر چلے آتے ہیں وحشی رسن و دار کے ساتھ

ہم کہ ہیں مسلکِ منصور کے پابند ظہیرؔ
خاص نسبت ہے ہمیں جرأتِ اظہار کے ساتھ

غزل

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلق کے بھی قابل نہ رہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کارواں نیّتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرفِ ہم سفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تو ہو تو سو خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کے مری آنکھوں میں مرا دل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فرازؔ
کہ وہ اُٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

حرف کی شہادت

آؤ جس عیسا کو ہم نے سولی لٹکایا ہے
اس کے لہو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پورے اتر چکے
اب قرض چکائیں
اس کی کھڑاؤں وہ لے جائے
جس نے صلیب اُٹھائی تھی
خونیں چادر اس کا حصہ
جس نے کیل لگائی تھی
اور کانٹوں کا تاج ہے اس کا
جس کی آنکھ بھر آئی تھی

آؤ
اب ہم سب عیسا ہیں
لوگوں کو بتلائیں
مردوں کو چھو کر دیکھیں
اور کچھ اعجاز دکھائیں
لیکن اس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں

غزل

میں کس کا بخت تھا مری تقدیر کون تھا
تو خواب تھا تو خواب کی تعبیر کون تھا

میں بے گلیم لائقِ دشنام تھا مگر
اہلِ قبا میں صاحبِ توقیر کون تھا

اب قاتلوں کا نام و نشاں پوچھتے ہو کیا
ایسی محبتوں سے بغل گیر کون تھا

میں زخم زخم اس سے گلے مل کے کیوں ہوا
وہ دوست تھا تو صورتِ شمشیر کون تھا

میزاں بدست کون لرزتا رہا فرازؔ
منصف تھا کون صاحبِ تقصیر کون تھا

احمد فراز

غزل

میں تو ہر طرح کے اسبابِ ہلاکت دیکھوں
اے وطن کاش تجھے اب کے سلامت دیکھوں

وہ جو قاتل تھے وہ عیسا نفسی بیچتے ہیں
وہ جو مجرم ہیں انہیں اہلِ عدالت دیکھوں

وہ جو بے ظرف تھے اب صاحبِ مےخانہ ہوئے
اب بمشکل کوئی دستار سلامت دیکھوں

گردنیں ٹوٹی ہوئیں سر ہیں خمیدہ جن کے
ان کو سرگشتۂ پندارِ امارت دیکھوں

قیمتِ بے ہنراں نیلم و مرجاں ٹھہری
قسمتِ دیدہ وراں سنگِ ملامت دیکھوں

کذب کی ریگِ رواں یوں ہے کہ اس کے آگے
خشک ہوتا ہوا دریائے صداقت دیکھوں

جانے کب دشنہ کو پیوست رگِ جاں کر دیں
ہر گھڑی میں جنہیں معروفِ عبادت دیکھوں

شہرت بخاری

غزل

جب گھر سے نکل آئے پھر کس کا پتہ رکھنا
یہ شوق کی بازی ہے، کیا کھونا ہے، کیا رکھنا

جز موجِ ہوا اس تک کوئی نہ پہنچ پائے
زینے میں دھواں بھرنا، کوٹھے پہ دیا رکھنا

غیروں پہ نہ کھل جائے جو دل پہ گزرتی ہے
رخساروں پہ آسودہ کچھ رنگِ حنا رکھنا

اب تک اسی کہنے پر ہر حال میں کاٹی ہے
کانٹوں پہ لازم ہے اُمیدِ صبا رکھنا

سناٹے کی چھاؤں میں، مایوسی کے برتے میں
شاید کوئی آ جائے، دروازہ کھلا رکھنا

جی بھر کے کرو گریہ آج اپنی ہی لاشوں پر
قاتل پہ بھی رونے کو کچھ اشک بچا رکھنا

ناموسِ محبت کو درکار لہو ہو گا
یہ فرض ادا کرنا، یہ قرض ادا رکھنا

چنگاریاں سینوں کی جسموں سے بھڑک اٹھیں
پروانو! یہی قائم معیارِ وفا رکھنا

بیعت کا تقاضا پھر شامی نہ کرے کوئی
زنجیر زنو! زندہ یہ رسمِ عزا رکھنا

ہیں ہاتھ تو اپنے ہی پر تیغ ہے اوروں کی
تسلیم و رضا والو! گردن نہ جھکا رکھنا

صیاد کا سایہ بھی جب تک ہے گلستاں میں
طوفان شہادت کا سینے میں بپا رکھنا

ہلکان ہوئے شہرت سُن سُن ترا افسانہ
باقی جو رہا اس کو، کل شب پہ اُٹھا رکھنا

تخلیق :- شیخ ایاز
ترجمہ : احمد سلیم

سندھی سے ترجمہ

نظم

میرے دیدہ ورو!
میرے دانش ورو!
پاؤں زخمی سہی!
ڈگمگاتے چلو،
راہ میں سنگ و آہن کے ٹکراؤ سے
اپنی زنجیر کو جگمگاتے چلو
رد کشِ نیک و بد
کتنے کوتاہ قد
سر میں بادل لئے
ہیں تہیّہ کئے
بارشِ زہر کا
اک نئے قہر کا

میرے دیدہ ورو!
اپنی تحریر سے
اپنی تقدیر کو
نقش کرتے چلو
تھام لو ایک دم
یہ عصائے قلم
ایک فرعون کیا
لاکھ فرعون ہوں
ڈوب ہی جائیں گے

پنجابی سے ترجمہ

نظم: نجم حسین سید

ترجمہ: نسرین انجم بھٹی

"خانہ بدوشوں کا گیت"

(برسات کی برساتوں میں خانہ بدوش یہ گیت گاتے ہیں)

بھیگی بوسیدہ چھتوں کو چاٹ رہے ہیں
بوندوں کے انجانے ہاتھ
سیم زدہ چوبارے چاٹیں
بوندوں کے انجانے ہاتھ
اشتہاروں سے سجی دیواریں چاٹ رہی ہیں
بوندوں کے انجانے ہاتھ
نئے نکور سات منزلے چاٹ رہتے ہیں
بوندوں کے انجانے ہاتھ
ایک بیسی کے رنگ اور روغن چاٹ رہے ہیں
بوندوں کے انجانے ہاتھ
دور کہیں اندر ہی اندر ڈھلتے ہیں انجانے ہاتھ
باہر سے اکیلے دکھتے ہیں
سانسوں میں رس بستے
ہمارا دم ٹپری کا بسنا
کوئی آگا اور نہ پیچھا
اِن انجانے ہاتھوں کی ہمیں تو بہت ضرورت ہے
ساری دھرتی گھر اپنا
اور آنگن آکاش
اندر بارش ڈولے ـــــ جوڑیں فوج انجانے ہاتھ
یہ فوج تو امڈے گی ـــــ سر چڑھے گی
آتے چیت میں رنگ نکالے گی
بوندوں کی انجانی داب

عباس اطہر

ایک تھا بادشاہ

یہ اس بادشہ کی کہانی ہے
جس کی ہدایت پہ
خلقت خدا کو خدا مانتی تھی

اور اس پر ستارے بہت مہرباں تھے

اسی بادشہ کے زمانے میں دیکھا گیا
جو خدا سے نہ ڈرتے تھے
اِک، اس کی آواز پر
اگلے ہی روز
ہر جیل خانے میں، تھانے میں اور دفتروں میں
صفیں باندھ کر سجدے میں گر گئے
اور جو رشوتیں لیتے اور ظلم کرتے تھے
ہر روز اپنے گناہ بخشوانے لگے
بادشاہ خوش رہا اور خدا خوش رہا
اور اُس نے بتایا
خدا، بس خدا ہے
وہ عاشق نہ معشوق ہے اور نہ محبوب ہے
وہ زمینوں کا اور آسمانوں کا
سارے جہانوں کا مالک ہے
اور ضابطوں کے مطابق یہ دنیا چلاتا، سزائیں سناتا ہے

اور رحم کی کوئی درخواست سنتا نہیں

یہ اُسی بادشاہ کی کہانی ہے
جس کے زمانے میں چوراہے میں پھانسیاں گڑ گئیں
اور آدھی رعایا کی، جیلوں میں عمریں کٹیں
جو کوئی سر اُٹھا کر چلا
اس کی گردن کٹی
جو علَم لے کے نکلا
وہ بازو کٹائے ہوئے، گھر کو لوٹا
جو بولا، زباں کٹ گئی
جس کسی نے کہا — ظلم ہوتا ہے
اس کو زمیں سے رہائی دلادی گئی کہ وہ خود جا کے
اپنی تسلی کرے اور آنکھوں سے دیکھے
خدا آسمانوں پہ خوش ہے
نہ ہوتا، تو یہ شان و شوکت نہ دیتا
یہ طاقت نہ دیتا
یہ انصاف کرنے کی مہلت نہ دیتا

اور لوگ کہتے ہیں
اس بادشاہ کو خدا نے بہت عمر دی
جس قدر سال اور جتنی صدیاں زمینوں سے گزریں
وہ ہر اک میں موجود تھا
اب بھی موجود ہے
اور ستارے بھی اس پر بہت مہرباں ہیں

عباس اطہر

پہاڑی کی آواز

لڑکیوں نے کہا، وہ ہمارے خیالوں میں ہے
اور ماؤں نے آواز دی، وہ ہماری دعاؤں میں ہے
اس کو گھر لوٹ آنے دو

وہ آسمانوں کا پیغام بن کر
پہاڑی پہ اترا تھا
بھٹکی ہوئی اپنی اُمت کو آواز دیتا تھا
لوگو! ــــ اُٹھو آنکھیں کھولو
میں غاروں میں گم روشنی ساتھ لے کر
تمہاری زمینوں پہ اترا ہوں۔ بھیجا گیا ہوں
یہ مشعل اٹھا کر بڑھو اور اندھیرے مٹا دو

سنو میری اُمت کے لوگو
خدا آسمانوں پہ ہے
اور نیچے زمینوں پہ ہم سب برابر ہیں
دیکھو! جہاں روشنی ہے، وہ اللہ کا گھر ہے
جو اللہ کی نعمت ہے
اس پر تمہارا برابر کا حق ہے
میں جگنو سے بھی روشنی لاؤں گا
اور اپنی زمینیں منور کر دوں گا

تمہارے لئے ہاتھیوں سے لڑوں گا
جو دنیاؤں کی روشنی اور سب نعمتیں
لوٹ کر اپنے غاروں میں بیٹھے ہیں، پرمٹ پہ تقسیم کرتے ہیں
اپنے لئے دن، تمہارے لئے رات لکھتے ہیں

جب اس کی آواز سارے زمانے میں گونجی
پہاڑی پہ ہلچل مچی
اس پہ شب خون مارا گیا اور ہاتھی اسے گھیر کر لے گئے
صبح اُمت کی آنکھیں کھلیں
تو فضاؤں میں چنگھاڑتے ہاتھیوں کو سُنا
جن کے کھانے، دکھانے کے دانت اور تھے
شہر کے شہر روتے ہوئے
اپنے سر پیٹتے، بال کھولے گھروں سے نکل آئے
"ہم سولیوں پر چڑھیں گے، اسے چھوڑ دو"

اور سلام اس پہ
جس نے رہائی نہ مانگی
وہ اُمت سے کہتا رہا ـــــ آسمان کی طرف دیکھتے جاؤ، تم کو اشارہ ملے گا،
ابھی چپ رہو
جب تلک یہ پہاڑ اور پتھر نہ بولیں پرندے نہ رو دیں

وہ سچا تھا
اور جس پہاڑی پہ اترا تھا
دور اس پہاڑی سے آواز اٹھتی ہے
اے سونے والو!
بہت رونے والو!

اُٹھو اور فارس کی جانب افق کا نظارہ کرو
وہ ابابیلیں دیکھو، جو چونچوں میں کنکر لئے
بجلیوں کی طرح لشکروں پر گریں
فیل اور فیل باں کٹ گئے
شاہ میدان سے ہٹ گئے

یاد ہے اس نے تم سے کہا تھا، اشارہ ملے گا

عباس اطہر

سالگرہ کے پھول

موت کی کوٹھری میں
اس کا جنم دن آیا
اور کہا ـــــ سچ کبھی مرتا نہیں
کہ ہو نیزے کی انی پر تو حسین
اور لٹکا ہو صلیبوں پہ تو ابنِ مریم
زہر کا پیالہ پیئے تو سقراط

موت کی کوٹھری میں
اس کا جنم دن دیکھو
اور پہچانو کہ وہ کون ہے
وہ، وہ تو نہیں ہے کہ جو تھا،
روشنی ہے، جلتی ہوئی شمع ہے
جو راہ دکھاتی ہے

کہو قافلے والوں سے
اُٹھیں! بیڑیاں چھنکائیں
تھکے ہاروں کو آواز لگاؤ کہ بڑھیں
آگے بڑھیں
آج کی رات بہت ناچیں
بہت زور، بہت شور سے، اتنا ناچیں
بیڑیاں گھنگرو بنیں

دیکھنا

اس بار پہاڑوں سے
چٹانوں سے، گھنے جنگلوں
میدانوں سے
اور ریت سے
تم بادِ صبا بن کے گذرنا
کہ زمیں پھر نہ دکھے

اور ہر اک وقت میں
یہ وقت تمہیں یاد رہے
صبح کو یہ صبح یاد رہے
رات کو یہ رات تمہیں یاد رہے

عباس اطہر

اس رات

ــــــ اور اس رات میں نے سلاخوں کے پیچھے سے آواز دی
سنو! موت کے اور مصیبت کے ماتم کے سال
نحوست کے سال
تمہاری کہانی تو اب مختصر ہے
ٹھٹھرتے دسمبر کی چند ایک راتوں کا قصہ ہے
پھر تم نے آتے ہوئے سال کے
پہلے سورج کے قدموں میں گرتا ہے
اپنے ہی ظلموں کی زنجیر اپنے گلے میں لپیٹے ہوئے، دور تاریکیوں میں کہیں ڈوب جانا ہے
اور یہ بھی تیرے مقدر میں لکھا گیا ہے کہ جانے سے پہلے
تجھے دیکھنا ہے کہ تیرے لئے اس بھرے ملک میں
ایسا کوئی نہیں، جو دعا بھی کرے
ایسا کوئی نہیں ہے جو آنسو بہا دے، جو پھولوں کی چادر چڑھا دے
کوئی بھی نہیں، جس کے ہونٹوں پہ تیرے لئے ایک بوسے کی ہی بھیک ہو
تم مٹنے والے ہو، تم مٹ رہے ہو
تمہیں کوئی روئے نہ روئے
مگر وہ جو تم نے مٹایا ہے
اُسے رونے والے بہت ہیں، بہت روئیں گے اور بہت دیر روتے رہیں گے

سلاخوں میں اُبھرے ہوئے
اس کے ماتھے پہ کالی لکیریں تھیں
ویسی ہی کالی لکیریں، جو اس نے کہا تھا کہ ہر مرد کی پیٹھ پر کھینچ دو
جس میں مردانگی ہو
سو بھائی بچے اور نہ بیٹے بچے

اور نہ وکلا نہ طلبا بچے اور نہ شاعر ادیب اور صحافی بچے

میں نے اس سے کہا ـــــ الوداع اے مصیبت کے ذلت کے سال
زمانے کی قوموں سے چہرے چھپائے
سلاخوں کے پیچھے میری قوم جسموں سے پردے اُٹھائے ہوئے
پیٹھ پر اپنی غیرت کے عزت تمغے سجائے ہوئے
سر جھکائے، تمہیں الوداع کہہ رہی ہے

اور اس نے کہا ـــــ نہیں میں تو تم پر اتارا گیا ہوں
ازل سے ابد تک تمہارے مقدر میں لکھا گیا ہوں
نہیں جاؤں گا، میں تو زندہ رہوں گا کہ میں موت ہوں
اپنے شہروں میں سب لڑکیوں اور لڑکوں سے کہہ دو
وہی خواب دیکھیں جو میں دیکھتا ہوں
بتا دو انہیں
وہ جو باغوں میں پھولوں سے مل کر مری خواہشوں پر ہنسیں گے
جو راتوں کو چاند اور ستاروں سے باتیں کریں گے
جو سورج نکلنے پہ سچ بولتے دیکھے جائیں گے
سارے خلا کے گنہگار ٹھہریں گے
اور بیویوں، بیٹیوں اور ماؤں سے کہہ دو
کہ دروازوں میں بیٹھ کر اپنے پیاروں کی راہ دیکھنا چھوڑ دیں
ان کے پیارے جو سورج کے کہنے پہ سچ بولتے تھے
خدا کے گنہگار تھے اور سلاخوں کے پیچھے اندھیرے انہیں کھا گئے

مگر اے مصیبت کے اور موت کے اور ماتم کے سال
تمہاری حقیقت تو چند ایک راتوں کا قصہ ہے
تم اب نہیں رُک سکو گے کہ گزرے ہوئے اور گذرتے ہوئے وقت ہو

اور ہم آنے والے ہیں، آتا ہوا وقت ہیں
اور ہمارا بھی کوئی خدا ہے
ہمارا خدا، جو فقیروں، غریبوں کا
مظلوموں اور قیدیوں کا خدا ہے

تو اے خالی ہاتھوں گزرتے ہوئے سال
خونِ شہیداں سے لتھڑے ہوئے سال
تم مٹ رہے ہو
مگر ڈوبتے ڈوبتے
آخری ہچکیاں لیتے لیتے
اُدھر سے گزرنا، جہاں موت کی کوٹھری کی سلاخوں کے پیچھے
وہ صبحوں کا سورج چھپایا گیا تھا
گذرتے ہوئے، اس کا دیدار کرنا
وہ اس کربلا کا حسین
وہ موجود ہے اور پھر سے طلوع ہونے والا ہے
اور وہ تمہاری پہنچ سے بہت دور، دل کے جزیروں میں بستا ہے
اور اس کے چاروں طرف، بے گناہوں کے، مظلوموں کے، آنسوؤں کا سمندر ہے
سر پہ دعاؤں کا، ماؤں کا، بہنوں کا
اور بیٹیوں کے دوپٹوں کا سایہ ہے
اس کا خدا
حق پہ لڑتے ہوئے
آگے بڑھتے ہوئے لشکروں کا خدا ہے

عباس اطہر

غزل

گرے دیوار اُٹھانے والے
مر گئے موت سنانے والے

ڈگمگائے نہ سرِ مقتل بھی
عشق کی رسم نبھانے والے

اس سیہ رات پہ بھاری ہوں گے
خون سے شمعیں جلانے والے

انہی راہوں میں بکھر جائیں گے
صبح کی راہ میں آنے والے

اپنی صورت بھی دکھانے سے گئے
آئینہ سب کو دکھانے والے

کشور ناھید

اے رات تو بتا!

دوستی کی صبح طلوع ہو تو
آنگن میں گزشتہ کے سوکھے
پتوں کے ڈھیر تلے
سانس لیتی کونپل کی رونمائی ہو
زندگی کے سمندر میں تو
لوگ رات سے دوستی کا رشتہ
باندھا کرتے تھے
اندھے جہازوں کو رستہ دکھاتے تھے
اور گھروں کی دیواروں پر
چراغ جلا کر
انتظار کا تعویذ پہن کر
مجسم دعا بن جاتے تھے
اس زمانے میں
گھروں سے نکلنے والوں کو
شک کی وردی نہیں
درویشی کی قبا پہنائی جاتی تھی
اُس زمانے میں میرے گناہ کا شاہد
بس میرا خدا ہوتا تھا
کہ پردے رکھنے کی گواہی
کبھی انحراف میں تبدیلی نہیں ہوتی تھی

اُس زمانے میں بھی
اگر دس بجے رات کے بعد گھروں سے نکلنے والوں کی
تلاشیاں لی جاتیں
تو پھر
ستاروں کے ذریعہ راستہ تلاش کرنے والے
منزل پہ کیسے پہنچتے
ہمیں بھی اسی لئے منزل نہ ملی
کہ ہم ستارۂ سحری کی صداقت
کی گواہی نہ بن سکے
اور سوتے رہے
ہمیں بھی منزل اسی لئے نہ ملی
کہ کوتوالِ شہر
خود اپنی تلاشی کے خوف سے
گھروں سے باہر نکل کر
خلقت کی ڈیوڑھیوں پر
مفلسی کی ڈائنوں کا رقص نہ دیکھ سکے
قیامت کے دن
جب ہم اپنی اپنی قبروں سے اُٹھائے جائیں گے
تو ان حق تلفیوں کا کفارہ کون ادا کرے گا

کشور ناہید

روزنامچہ

میرے ہر آج کو گزشتہ بنانے والوں نے
اپنے نام کے سامنے اوصاف
اور میرے نام کے سامنے دشنام لکھی ہے
میری تاریخ کو زنجیر پہنانے والوں نے
میرے گھر کے سامنے سلاخیں
اور اپنے گھر کے سامنے
عشقِ پیچاں کی بیل سجالی ہے
میری گویائی کو تصویر بنانے والوں نے
اپنے لئے لونگ پلے
اور میرے لئے کنویں بنائے ہیں
سروں کے ڈول سے
گویائی کی رسی باندھ کر
سچائی کا پانی بھرنے
پنہارنیں کب آئیں گی
کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد
دنیا میں مرد کم ہو گئے تھے
تو عورتوں نے چھنی چھنی
دھوئیں کے بادلوں سے
خوشحالی کا مینہ برسایا تھا
امن کا میگھ

خوشحالی کا مہینہ
اندھی اور دیکھنے والی آنکھوں سے نکلتے آنسو
بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں
ان ہاتھوں کو بلند رکھو
کہ نیچے آئے
تو بریدہ ہوں گے
ان ہونٹوں کو مصروفِ گفتار رکھو
کہ خاموش ہوئے
تو سِی دیئے جائیں گے
سنو
آگ کو آگ نہیں بجھا سکتی

كشور ناهيد

آخری فیصلہ

کانٹوں کی چٹان پہ کھڑی
میں آنکھوں کی سوئیاں نکال رہی ہوں
یہ علاقہ کس سلطنت میں شامل ہے
ملوکیت، میری زبان پہ کانٹے
حلق میں پھندا
آنکھیں باہر
شاہ بلوط کے لمبے درختوں جیسے
لمبے پوت، بہت ہوگئے ہیں
جنگل میں درخت زیادہ ہوجائیں
تو آگ لگا کر درخت کم کردیئے جاتے ہیں
باہر نکلی ہوئی آنکھ سے زعفران کا کھیت
اور کٹے ہوئے بازؤں سے گنے کی پوریاں بن گئی ہیں
ہم نے ایک جھوٹ بولا تھا نا
اب ساری عمر اس کو سچ ثابت کرنے میں گزار دیں گے
ہم کہ جو زندگی بھر
اپنے حصّے کی روٹی کمانے کی کوشش کرتے ہیں

اور بھو کے رہتے ہیں
جھوٹی آس کی چھتری تلے
بلبلے جیسے آنسو
بتاشوں کی طرح تھال میں سجائے
کب تک یہ جھٹلاتی رہو گی
کہ وہ تمہارا قاتل نہیں ہے

قتل محض ثانیے میں
زندگی کا رشتہ ختم کرنے کا نام نہیں

موجود سے انکار بھی
تو قتل کے مترادف ہوتا ہے
میرا جی کرتا ہے
وہ جو سب میرے قاتل ہیں
میں انہیں ہوا کی طرح نگل جاؤں

کشور ناہید

تیرے پیچ — میری ڈھیل

مجھے علم ہے تمہیں پتنگ کاٹنے کا بہت شوق ہے
میری پتنگ فضا میں اکیلی نہیں
اور بھی بہت ، رنگ برنگی پتنگیں
فضا میں لہرا رہی ہیں
میری ڈھیل دیکھ کر تم نے سوچا تھا
اتنی ڈور پہ پیچ پڑیں
تو پتنگ نہیں سنبھلتی ہے
مجھے یہ علم تھا کہ میری ڈھیل اور میری اڑان
نئی پتنگوں والوں کو
شوقِ رزم آرائی میں اڑائے لئے جا رہی ہے
آؤ کہ کھلی فضا کا معرکہ
رجز بن کے گونجتا ہے
مجھے معلوم ہے
میری ڈور پہ ، میرے ناخن اور میرے دانت
گھس کر لگائے گئے ہیں
اور تمہاری ڈور پہ
دیواروں پہ لگے حفاظتی شیشوں کی ٹکڑیوں کو بھی
پیس کر لگا دیا گیا ہے

میں اپنے آنگن سے جھانکتے آسمان کے کنارے کو
اپنے پتنگ سے ڈھک دیتی ہوں
اور تم دوسروں کی چھتوں پہ کھڑے ہوکر
پتنگ اونچی کرنی چاہتے ہو
میں تو یہ سوچ رہی ہوں
تمہاری پتنگ کٹے گی تو تمہارے مانجھے سے

لوگوں کے سروں کی چادریں نہ کٹ جائیں
گردنیں نہ کٹ جائیں
بس اسی لئے
میں اپنی اُونچی پتنگ کو اور ڈھیل دیتی جارہی ہوں

کشور ناھید

خود کلامی

مجھے سزا دو
کہ میں نے اپنے لہو سے تعبیرِ خواب لکھی
جنوں بریدہ کتاب لکھی
مجھے سزا دو
کہ میں نے تقدیسِ خوابِ فردا میں جاں گزاری
بہ لطفِ شب زادگاں گذاری
مجھے سزا دو
کہ میں نے قاتل کو وصفِ تیغ و علم سکھایا
سروں کو اوجِ قلم سکھایا
مجھے سزا دو
کہ میں عدو کی صلیب کی محتسب رہی ہوں
ہوا کی زد پہ جلے چراغوں کی روشنی ہوں
مجھے سزا دو
کہ میں نے دوشیزگی کو سودائے شب گماں سے رہائی دی تھی
گھروں کے بجھتے دیوں کو شانِ خدائی دی تھی
مجھے سزا دو
کہ میں جیوں تو، تمہاری دستار گر نہ جائے
یہ بے ضمیری کا خوابِ بیمار گر نہ جائے
مجھے سزا دو

کہ میرے بیٹوں کے ہاتھ اٹھے تو تم نہ ہو گے
کہ ایک بھی تیغِ حرف توسِ بیاں سے نکلے تو تم نہ ہو گے
مجھے سزا دو
کہ میں تو ہر سانس میں نئی زندگی کی خوگر
حیات و بعدِ حیات بھی زندہ تر رہوں گی
مجھے سزا دو
کہ پھر تمہاری سزا کی میعاد ختم ہو گی

تخلیق و ترجمہ
پروفیسر پریشان خٹک

خیبر

یہ کون ہے کس ارادے سے آگے بڑھ رہا ہے
شاید کوئی راہ رو ہے
اے راہ رو! ذرا احتیاط سے
تمہیں معلوم بھی ہے جہاں سے گزر رہے ہو

یہ خیبر ہے
یہ جو پہاڑ تمہیں دکھائی دے رہے ہیں
مغموم و حسرت زدہ جیسے نشے میں مدہوش
یہاں پھول کھلتے ہیں نہ کبھی بہار آتی ہے
ان پہاڑوں میں جہاں مٹی کے گھروندے پھیلے ہوئے ہیں
یہاں کے مکین جو آج تک کسی غیر کے بنائے ہوئے قانون کے آگے نہیں جھکے
ہاں! یہاں ایسے جری اور مردِ میدان بستے ہیں جن کی زیارت کے لئے
دور دراز سے لوگ آتے ہیں
جہاں کے ذرّے ذرّے پر چشمِ بینا کے لئے اقوامِ عالم کی تاریخ
کے ان مٹ نقوش ثبت ہیں
اس سربلند چوٹی کو دیکھ رہے ہو
یہ "تقترہ" ہے یہاں کے مکینوں کے ارادوں کی طرح سربلند
یہ علامتِ آزادی ہے
اس چوٹی کو جس کسی نے بھی ترچھی نظروں سے دیکھا
چاہے وہ کتنا بڑا بہادر اور اپنے وقت کا عظیم تاجدار ہی کیوں نہ ہو
تاج و تخت سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے

یہاں گھاس کا ہر تنکا نشتر اور پتھر خنجر ہے
اے راہ رو! ذرا احتیاط سے!
یہ جگہ ایشیا کے حکمتوں کا گہوارہ بھی ہے
اور غیرتِ حُبِّ وطن کے لئے میزان بھی
یہاں نہ مکر و فریب ہے نہ سیاست کی چالبازیاں
بلکہ مکاروں اور فریب کاروں کے لئے مقبرہ ہے
یہاں کئی طوفان اُٹھے اور آندھیاں چلیں
استعماری قوتوں نے اپنا پورا زور لگایا
لیکن وہ ان سربلند پہاڑوں کے مکینوں کو سرنگوں نہ کر سکے
سکندر جیسا بہادر بھی اس راہ سے کترا کر آگے بڑھا

اے راہ رو! ذرا احتیاط سے!
یہ وہ مقام ہے جو مکتبِ حریت ہے
جو پشتو بھی ہے اور پشتونولی بھی
جو کلچر بھی ہے اور ثقافت بھی
وہ پشتونولی جو یہاں والوں کی زندگی کا معیار ہے
جو غیرت شجاعت آدمیت اور شرافت کا دوسرا نام ہے
یہاں دوستی میں خلوص ہوتا ہے اور محبت کے جذبے کو اپنے خون سے
سینچا جاتا ہے
ہاں البتہ ــــــ دشمنی یہاں مصیبت بن جاتی ہے
آزادی ان کو ازل سے نصیب ہوئی ہے
اور یہی آزادی اس زمین کی کرامت ہے
بابر اور نادر دونوں ہی یہاں سے بھاگ کر نکلے تھے

اے راہ رو! ذرا احتیاط سے۔ یہ خیبر ہے
اگر میری بات، تیرے سمجھ میں نہ آئی ہو تو ذرا آریاؤں سے پوچھ آؤ
یونانیوں یا تاتاریوں سے پوچھ آؤ
چاہے سفید و سیاہ ہنوں سے پوچھو چاہے ساکلو سے

بدھوں سے پوچھو یا ہندوؤں سے
ہری سنگھ نلوہ کا غرور انہی پہاڑوں نے خاک میں ملا دیا تھا
تاریخ شاہد ہے جا کر سکھوں سے پوچھو
انگریز کے مکر و فریب کا جادو بھی یہاں نہ چل سکا
یہاں کا ذرہ ذرہ ان تاریخی واقعات کی گواہی دیتا ہے
اے راہ رو! ذرا احتیاط سے ——
جو اپنی طاقت پہ قادر تھے وہ یہاں نگونسار ہوئے
دوسری جگہوں سے جو جیت کر آتے تھے یہاں ہار جاتے تھے
میں کس کس کا ذکر کروں
کہ یہاں کونسے اور کیسے کیسے کج کلاہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے
میں ان جانبازوں کو سلام کرتا ہوں
جنہوں نے جان دے دی لیکن اپنی آزادی پر حرف نہ آنے دیا
یہ پشاور جو خیبر کے نزدیک واقع ہے اس کے مکینوں کو بھی سلام
اے راہ رو! —— ذرا احتیاط سے —— یہ خیبر ہے!

تخلیق و ترجمہ
پروفیسر پریشان خٹک

عید کی صبح

تم نے زحمت کی مبارک باد کے لئے
عید کی صبح تم مبارک باد دینے چلی آئی ہو
عید کا دن ہے۔ ہر سو خوشیوں اور مسرتوں کا چرچا ہے، مبارک سلامت کا شور ہے
تم نے تکلیف کی ازراہ عنایت مبارک باد کہنے چلی آئی ہو
اس زحمت کے لئے پر خلوص شکریہ ـــــ مگر
یہ عید تمہاری عید ہے ـــــ تمہیں اس عید کی خوشیاں مبارک ہوں
تم صدا خوش رہو پھولو پھلو ایسی ہزاروں عیدیں مناؤ
مجھے تمہاری خوشیوں کی قسم
میں یہ عید نہیں منا سکوں گا
کاش! آج کے دن میں بھی ہنس سکتا ـــــ مگر میں آنکھیں موند نہیں سکتا
میرے سامنے اسی معاشرے کے وہ یتیم و بے آسرا بچے ہیں
جو نہ تو عید کے دن خوبصورت کپڑے پہن سکتے ہیں ـــــ نہ اچھے اچھے کھانے کھا سکتے ہیں
پھر میں عید کیسے مناؤں
کیا یہ بچے ـــــ یہ غریب و خوار نادار بچے ـــــ بچے نہیں ہیں
کیا ان بچوں کے دل ان چیزوں کے لئے للچا نہیں رہے ہیں

کیاان کی یہ خواہش نہ ہو گی کہ وہ بھی مسرت کے ان لمحوں سے حظ اٹھائیں
اگر یہ سب کچھ ہے ـــــ تو پھر اے میری دولت مند محبوبہ!
میں ان پھولوں جیسے بچوں کے غم واندوہ کو کیسے بھولوں
تم عید منا رہی ہو ـــــ ہاں تمہیں حق ہے ـــــ جاؤ اور خوشیاں مناؤ
خوشبوؤں میں بسے ہوئے تمہارے ریشمی لباس کی سرسراہٹ کی قسم
میں ان غریب ولاچار والدین کے پسینوں کی بو نہیں بھول سکتا
میرا گرم لہو مجھ سے محبت کا طلب گار ہے
مگر وہ محبت نہیں
جو تم دولت کے ذریعے خرید سکتی ہو
وہ محبت جو میں زر وجواہر کے بدلے بیچ نہیں سکتا
کاش میری محبوبہ ـــــ دولت کی ملکہ ایسے کردار کی مالک ہوتی
جس کی گود میں سر رکھ کر مجھے حقیقی خوشی ملتی
جاؤ! تم اپنا وقت ضائع مت کرو ـــــ خوشیاں مناؤ
میں اسی حال میں اچھا ہوں ـــــ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو
میں اس وقت تک عید نہیں مناؤں گا جب تک ـــــ
یا تو ان خوشیوں میں یہ غم واندوہ کے مارے لوگ
حقیقی خوشیاں نہ مناسکیں ـــــ اور یا پھر
یہ سر وقت کے پتھروں سے چکنا چور نہ ہو

سلیم شاہد

شُنید

رم دریا بھی دیکھ اے چشمِ گریہ
کئی موسم پرانا واقعہ ہے
زمیں زادوں کی محکومی کے دن تھے
جزیرہ رینگتا ۔ تنہا سفینہ
مسافر شوخ بچے
شبِ بارش ہوا نے زور باندھا
چمکتا رعد ...... آئینہ شکستہ
گرجتے بادلوں سے حشر برپا
کتابوں میں یہ اب قصہ نیا ہے
کئی موسم پرانا واقعہ ہے

(۲)

مرا سر دیکھ اے صحرائے وحشت
کئی منزل گزشتہ رہگذر ہے
مسافر پر بریدہ فاختائیں
شجر انکار خانہ
جبل ۔ بے شیر پستانوں کے کوزے
زمیں تشنہ دہن ۔ بے آب چشمے
جہاں میں پاؤں کا پہلا سفر تھا
مری افتاد آدم سے دگر ہے
کئی موسم گزشتہ رہگذر ہے
کتابوں میں یہ اب قصہ نیا ہے
کئی موسم پرانا واقعہ ہے

(۳)

یہ فتنہ دیکھا اے آشوبِ محشر
فقط یہ دو برس پہلے کا غم ہے
یہ دن تھا موسموں کے درمیاں کا
ابھی دہلیز پر تھے شب کے سائے
ابھی سورج کی مسند نیم وا تھی
یہ پہلے پھول تھے دوشیزگی کے
یہ پہلی دھوپ تھی خورشید لب کی
سخن کرنا
حدیث گفتنی تھا
قدم اُٹھنا چمن آرائیاں تھیں
پھر اس کے بعد اک لمبی مسافت
بدن پر دھوپ اور سائے مسلسل
ادھر مریم اُدھر شہوت کا جنگل
خدا جانے
یہ بچہ بھی خدا ہو
سنو
شاید انا الحق بولتا ہو
یہ مجرم منصفوں کی قید میں ہے
خدا خود نائبوں کی قید میں ہے
یہ بستی کی طرف دریا کا خم ہے
فقط یہ دو برس پہلے کا غم ہے
کتابوں میں یہ اب قصہ نیا ہے
کئی موسم پرانا واقعہ ہے

محسن احسان

غزل

اب کے اُٹھے در و دیوار سے شعلہ ایسا
دہر نے دیکھا نہ ہو شہر کا جلنا ایسا

تو نے آنکھیں مجھے بخشی ہیں کہ دنیا دیکھوں
ورنہ میں تو نہیں مشتاقِ تماشا ایسا

کیا خبر کونسے پل مشعلِ جاں بجھ جائے
زندگانی کا نہیں کوئی بھروسا ایسا

حکمرانی ہے در و بام پہ سناٹوں کی
اب کے آباد ہوا شہر میں صحرا ایسا

کسی سورج کی تمنا نہیں باقی محسنؔ
روشنی چھوڑ گئی دل میں اندھیرا ایسا

سلیم شاھد

غزل

عمر بھر منصف ہمیں انصاف کیا دیتے رہے
قتل اوروں نے کئے ہم خوں بہا دیتے رہے

آنکھ کو رکھا گیا خوابوں کے زنداں میں اسیر
سورجوں کو کالے پانی کی سزا دیتے رہے

عمر بھر جلتے رہے محرومیوں کی آگ میں
سانس کیا لیتے تھے شعلوں کو ہوا دیتے رہے

اب کھلا دیوار پر دستک تھی فعلِ رائیگاں
عمر بھر سنسان جنگل میں صدا دیتے رہے

زندہ لوگوں کے لئے بیماریاں بکتی رہیں
اور معالج مردہ جسموں کو دوا دیتے رہے

وہ بھی چل نکلے ہیں دشمن منزلوں کی راہ پر
فرشِ رہ بن کر جنہیں ہم راستہ دیتے رہے

جاوید شاہین

غزل

جدا تھی بام سے دیوار، در اکیلا تھا
مکیں تھے خود میں مگن اور گھر اکیلا تھا

تھی آرزو کہ رہوں جبر سے محاذ آرا
میں ڈر گیا کہ یہ لمبا سفر اکیلا تھا

نگاہِ غیر جسے معتبر بہت ٹھہری
میں اس کو کیسے دکھاتا نگر اکیلا تھا

کہاں تلک میں شجاعت کی داد دیتا یہاں
کہ اس کی ساری سپہ، میں ادھر اکیلا تھا

بہت مزے میں رہے سرنگوں خجل پودے
ہوائے تیز کی زد میں شجر اکیلا تھا

عبث شریک تھا بے وقت رزم میں شاہینؔ
دیارِ غیر میں وہ بے خبر اکیلا تھا

سرمد صہبائی

ہمارے لئے صبح کے ہونٹ پر بدّعا ہے

بدّعا ہے
ہمارے لئے صبح کے ہونٹ پر بدّعا ہے
گھروں میں اترتی اذانوں میں
حکمِ سزا ہے
سنو بدعا ہے
ہمارے لئے صبح کے ہونٹ پر بدّعا ہے

سنو ہم نے شب بھر
اسے یاد رکھا
اندھیرے کی دیوار کے سرد سینے سے لگ کر
اُسے اپنے دل کے اُفق سے صدا دی
کبھی اپنی سانسوں کے دُکھ میں پکارا
دلاسوں کی دہلیز پر
ٹوٹتے خواب کی دھجیاں
رات بھر جاگنے کا صلہ ہے
سنو بدّعا ہے
ہمارے لئے صبح کے ہونٹ پر بدّعا ہے

سنو شہر والو
کہاں ہے ہمارے لہو کی بشارت ؟
ہمارے پراسرار خوابوں کا موسم
جسے ہم نے بچوں کی پلکوں سے سینچا
جسے ماؤں کی التجاؤں سے مانگا
ہمارا مقدر
ہواؤں میں اُڑتا ہوا موت کا ذائقہ ہے
سنو بد دعا ہے
ہمارے لئے صبح کے ہونٹ پر بد دعا ہے

افتخار عارف

آخری آدمی کا رجز

مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
فغانِ خلق اہلِ طائفہ کی نذر ہو گئی
متاعِ صبرِ وحشتِ دعا کی نذر ہو گئی
اُمیدِ اجرِ بے یقینیٔ جزا کی نذر ہو گئی
نہ اعتبارِ حرف ہے نہ آبروئے خون ہے
سکون ہی سکون ہے

مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں
سمیت شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے

پروین شاکر

اذن گنی

خیمۂ بے گناہی سے میں شہرِ انصاف کی سمت جونہی چلی
اپنی اپنی کمیں گاہ سے
میرے قاتل بھی نکلے
کمانیں کسے تیر جوڑے ملنچے چڑھائے
مچانوں پہ ناوک بدستوں کو تیار رہنے کے احکام دیتے ہوئے
شاہراہوں پہ پیاسی سنانیں لئے فتنہ گر صف بہ صف
چوک پر قاضیٔ شہر خنجر بکف
راستے دشنہ در آستیں
گھات میں شہر کا ہر مکیں
میرے تنہا کجاوے کی آہٹ کو سنتے ہوئے
عنکبوتی ہنر میرے چاروں طرف جال بنتا ہے
کوئی میرے علم کا طلب گار
کوئی مرے سر کا خواہاں
تو کوئی ردا کا تمنائی بن کر جھپٹنے کو ہے
حلقۂ دشمناں تنگ ہونے کو ہے
موت سے آخری جنگ ہونے کو ہے
کوفۂ عشق میں
میری بے چارگی
اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے
ہاتھ باندھے ہوئے
سر جھکائے ہوئے
زیرِ لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی
یا غفور الرحیم
یا غفور الرحیم

پروین شاکر

تقیہ

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سنا ہے ــــ باطل قرار پائے
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف ہوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی
بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
روح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں
خموشی و مصلحت پسندی میں خیریت ہے
مگر مرے شہرِ منحرف میں
ابھی کچھ ایسے غیور و صادق بقیدِ جاں ہیں
کہ حرفِ انکار جن کی قسمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غلام زادے
انہیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ سرد پتھر میں چننے دینا
کہ آج سے جب
ہزارہا سال بعد ہم بھی
کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہڑپہ بن کر تلاشے جائیں
تو اس زمانے کے لوگ
ہم کو
کہیں بہت کم نسب نہ جانیں

حفاظ الرحمٰن

جنگل شہر کے اندر

جنگل ایک بار پھر پھیلتے پھیلتے شہر کے اندر پہنچ گیا ہے
بھیڑیوں کا لشکر شہر کی اونچی عمارتوں پہ مورچہ جمائے بیٹھا ہے
لوگوں کے ہاتھوں پہ زنجیروں کی فصلیں اُگ آئی ہیں
لیکن ان کی آنکھیں ان کے پیٹ میں دفن ہیں

جنگل کی خواہش کس کس نے کی تھی ؟
سب کے منہ کف آلود تھے اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں
ہاں ، ہر ایک رستم بنا ہوا تھا اور کالا سفید ایک ہی دائرے میں رقص کر رہے تھے
اور ایک نامانوس زبان میں چیخ چیخ کر صحرا کے نشان اپنی ہتھیلیوں پہ منتقل کرنے کا "حق"
طلب کر رہے تھے
سارے بیوپاری ، تمام جنسوں کے بیوپاری رنگ برنگے جھنڈے لئے کھڑے تھے جن کے
پھریرے آسمان سے باتیں کر رہے تھے
نیچے ، ہزاروں کباڑیئے جوان بیوپاریوں کے منہ سے گرے ہوئے الفاظ پہ "جادو" پڑھ کر
نیچے والوں کو فروخت کرتے تھے
اُوپر ، سب سے اُوپر ، آسمان سے بھی اوپر ، سات سمندر پار کا "دیوتا" ــــــ جو سب سے
پہلے بحری جہاز پہ آیا تھا اور جس نے انہیں طوطوں میں تبدیل کر دیا تھا
نیچے ، سب سے نیچے ، کروڑوں آنکھیں پیٹ کے اندر دفن تھیں
اور ہاتھوں پہ زنجیروں کی فصلیں اُگ آئی تھیں

جنگل شہر کے اندر پہنچ گیا ہے
بھیڑیے شہر کی اُونچی عمارتوں پہ مورچہ جمائے بیٹھے ہیں
میرے لوگوں کے جسم زنجیروں کے پیچھے چھپ گئے ہیں

جنگل پھیل رہا ہے، لیکن
ننھے ننّھے کروڑوں ذرّے پہاڑوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں
(یہ میرے لوگوں کا "جادو" ہے)
جنگل پریشان ہے کہ ذرّوں کے لئے کس کونے سے زنجیریں درآمد کی جائیں
یہ اس کا بہت پُرانا مسئلہ ہے
بہت پُرانا، اس کی پچھلی اگلی تمام پسپائیوں کا امین

اقبال ساجد

غزل

میں بھوک پہنوں ، میں بھوک اوڑھوں، میں بھوک دیکھوں، میں پیاس لکھوں
برہنہ جسموں کے واسطے میں، خیال کاتوں ، کپاس لکھوں

سِسک سِسک کر جو مر رہے ہیں ، میں ان میں شامل ہوں اور پھر بھی
کسی کے دل میں اُمید بوؤں، کسی کی آنکھوں میں آس لکھوں

لہو کے قطرے بدن کے طائر، ہر ایک خواہش ہے شاخ میری
کسی زباں میں مہک اُگاؤں ، کسی کے لب پر مٹھاس لکھوں

تھمے جو بارش تو لوگ دیکھیں، چھتوں پہ چڑھ کے دھنک کا منظر
میں اپنے دل کو اجاڑ پاؤں ، تمام عالم اُداس لکھوں

مرا سفر ہے سمندر ایسا ، جدھر بھی جاؤں بپھر کے جاؤں
کہیں اُچھالوں میں موجِ وحشت، کہیں میں خوف و ہراس لکھوں

یوسف کامران

نیا عہد نامہ

روح القدس کی قدرت اور خوابوں میں ہدایتیں نہ سہی
عورتیں
اب بھی حاملہ ہوتی اور بچے جنتی ہیں
اُمتوں کی گلہ بانی سے
آسمان کی بادشاہت پانے والی
معصوم روحوں پر سلام
کہ تم آنے والے وقت سے خوفزدہ
ان کی جان کے خواہاں ہو
حاکمیت کی شان وشوکت اور مطلب برآریوں کے لئے
کتنے بچوں کو قتل کرو گے ؟
ریاکار روزہ دار کی طرح اُداس صورت نہ بنو
فضیلت کو کھلی چھاتیوں پر سجے تمغوں سے نہ ناپو
عذابِ دردناک سے ڈرو
کہ پوشیدگیوں میں دیکھنے والی آنکھ
آج بھی زندہ ہے

اصغر ندیم سیّد

میں پوچھوں گا

جو بھی مری تاریخ کی وردی پہن کے اب آئے گا
میں تو اس سے اس کا پیشہ پوچھوں گا
میں تو اس سے اپنی زمیں پہ اگنے والے پھلوں کی قسمیں پوچھوں گا
میں تو اس سے پوچھوں گا
کہ کون سے گیت ہماری فصل پکاتے ہیں
اور ان میں کس کے خون کا سورج اونچے سر میں بولتا ہے
جو بھی میرے لفظ کو اپنا غلام بنانے آئے گا
میں اس کو اپنی کھال اتار کے دے دوں گا
اور اپنے سارے لفظ ہوا میں اڑا دوں گا
اور اپنی آنکھیں شہر کے اونچے میناروں پہ نصب کروں گا
جو بھی میرے نام کے لفظ بگاڑے گا
میں اس کی یاد میں رہنے والے سارے اسم بھلا دوں گا
جو بھی دریاؤں کا پانی گدلا کرنے آئے گا
میں اس کے دل میں پھیلاؤ کے سارے رستے تاریکی سے بھر دوں گا
میں اس کے سارے رستے داغی کر دوں گا

جمال احسانی

غزل

پرندے سرِ شاخ پیوند ہیں
شجر جنگلوں میں نظر بند ہیں

ہمیں لوگ ہوتے تھے آئینہ گر
ہمیں لوگ آئینہ پابند ہیں

جنہیں ہونا تھا میری پوشاک پر
مرے رزق پر سب وہ پیوند ہیں

کوئی شب میں رستہ سجھاتا نہیں
سروں پہ ستارے بھی ہر چند ہیں

ہمیں بھی جمالؔ ایسی جلدی نہیں
کبھی تو کھلیں گے جو در بند ہیں

عذرا عباس

نیند کی مسافتیں

ہم اپنا راستہ بناتے ہیں، ان راستوں پر جنہیں ہمارے لئے
ناہموار کیا گیا
ان فاصلوں کو مجروح نہیں ہونا چاہیے جو درمیان
میں بنائے گئے کوئی خوشخبری سننے کے لئے
اور جیسے اچانک کوئی آتش فشاں آبادیوں میں داخل
ہو جاتا ہو
گھروں کے راز باہر آجاتے ہوں
اور سڑکوں پر برسرِ عام بکنے لگے ہوں
ہمیں اپنی زبانیں منہ زور گھوڑوں کے حوالے نہیں کرنا
چاہیے
کہ فائر بریگیڈ سڑکوں پر روندنا شروع کر دیں گے
شاید دکھ ہمیں کوئی بھی نہ ہو اور ہم صرف زندہ
رہنے کے لئے زندہ ہوں
شاید آسماں ہم پر مہربان نہ ہو
یہ دکھ نہیں ہے کہ ہمارے مکانوں کی کھڑکیوں کو
بند کرنے کا حکم دے دیا گیا
مگر ہمیں سوچنا تو ہوگا، باہر نکلنے کے لئے
آج ہمارے بچوں کو روٹی ملنی چاہیے

نسرین انجم بھٹی

میں آؤں ؟

ہاتھوں کے چھاج
دانوں سے بھرے
کھلیان خالی
مٹھی بھر اناج
کےَ دن ؟
بوری بھر پیٹ آنسوؤں سے بھر جاتے ہیں
کبھی نہیں
ابھی کچھ اور ...... کچھ اور ......
گردن کے نیچے پسینے کے قطرے
ڈھلک ڈھلک کر آخر کہاں جائیں ؟
کھیتوں میں کھلیانوں میں
زمیں میں
پیٹ میں
آگ ، پانی ، اناج
ہاتھوں کے چھاج
گلے تک بھرے
گلے تک خالی

آسمان بادلوں سے اور کھلتے جائیں گے
گلے تک
پھانسی کی رسی اور چھاج کی بنتر میں
کس کا ہاتھ ہے کس کا گلا ہے کس کا پیٹ ہے ؟
مرے ہاتھوں کے چھاج میں ایک گردن ہے
لکشن گیتوں سے بھری بھری
، زندہ زندہ
تنی تنی
لہولہان ـــــ سندھور کھلاؤ گے ـــــ آؤں، میں آؤں ؟

نسرین انجم بھٹی

"حکم کا یکہ"

کوئی دعویٰ نہ کرو کہ تاریخ دعویداروں کے ساتھ نہیں ہوتی
دکھ میں توانائی گھستی ہے!
نہیں تو! یہ دکھ کم ہے ___ اس سے بڑا دکھ پیدا کرو
پہلا دکھ اپنے آپ کم ہو جائے گا
میں نے اپنا آسمان دیکھا!
میں نے اپنی زمین دیکھی!
آسمان پر ستارے نہیں تھے۔ زمین پر فصل نہیں
یہ میری نسل ہے
یہ میری نسل نہیں
بند وقتوں کی نالیاں کیسی نیندیں لاتی ہیں منفی منفی سی
دن میں چاند نکل بھی آئے
تو رات کو سورج نہیں نکلے گا
سزائے موت سے بڑا حکم، مانگے کی زندگی ہے
حکم کا یکہ کھیل کو آگے نہیں بڑھاتا ___ ختم کر دیتا ہے
سب دعوے ختم کر دیتا ہے
تاریخ نے اپنی آنکھیں لکھیں جغرافیے نے اپنے ہاتھ پھیلائے
عشق کہاں مقید ہے
گنے کا بوٹا مرا محبوب اور میری پوریں پاؤں کے ناخنوں تک
زخم زخم زخم زخم
زخم گھنگھرو۔ گنا گداز۔ شہد شیریں
کونسا حکم لگاتا ہے
حکم کا یکہ

نظم: طاہر یعسوب
ترجمہ: نسرین انجم بھٹی

پنجابی سے ترجمہ

نظم

کیا پوچھا تھا؟ کون ہوں میں؟
میں نے بھی کبھی پوچھا تم سے ــــ تمہارے بارے میں
یا کون ہو تم؟
اندھے ہوئے ہو ـــــ دیدے نہیں ہیں
پھر میرا تمہیں نہ پوچھنا بھی ـــــ پوچھنا ہی ہے
"چپ اوئے ــــ کارڈ دکھا
کہاں سے آ ٹپکا ہے ـــــ کدھر چلا ہے"
آنا جانا ان کا بھائی ـــــ جن کا کوئی ٹھکانہ
ہم تو آئے ــــ چلے، ہمیں پھر کس نے دیکھا؟
ملک بنے، محلات بنے
بستیاں بَس بَس گئیں
بادل ہنسے ہم بسے
بادل برسے، ہم نہ ہنسے
تو مٹی بھی بول پڑی۔ اور ہم کو لگ لی چپ
مل گئے پاؤں پہاڑوں کو
گئے شوق مسافری والے
سارا کچھ تو ہو بھی لیا ہے۔ کیا کچھ نہیں ہوا ہے
ہم کو کن نے آتے دیکھا
جاتے سمے دیکھے گا کون
"اوئے تم سے تمہارا نام پوچھا تھا؟ بڑ بڑ باتیں کب پوچھی تھیں؟"

چھوڑو بھی ـــــ کوئی بھی ہوں میں ـــــ تم کو کیا
کون ہوں ؟ کون نہیں ہوں ؟
کرلو جو کرنا ہے تم کو ـــــ اور بھی اک بار
"عادی مجرم لگتے ہو
(پیں پیں) چلو ہٹو اب خادم! کیا باوا کی کچہری لگا لیتے ہو
اِدھر ہٹو ۔ خبر نہیں کیا، ڈپٹی صاحب نے آنا ہے
ان کے لئے کچھ مال بھی لے کر جانا ہے ـــــ جلدی کرو
ارے لعنت بھیجو کیوں کھواؤ گے مری کھال!"
ٹھہرو ۔ رکو میں تم کو نام بتاؤں ـــــ کون ہوں میں
"میں رانجھے کی بانسری کی تیکھی بھیرویں بھور
نین آکاش سے ستی کے ٹوٹا اک تارا ہوں میں
میں نیلی کے سُموں سے اڑتی چنگاری
میں قہرِ فلک کی پینگ کا بے رحم ہلارا
مَیں شاہ حسین کی عاجزی
میں ہیر کی ٹھنڈی آہ
میں دریا جہلم لال ـــــ سوتوں کا دل دہلاؤں
میں پیاس ۔ کھیڑوں کے خون کی
جو بجھتے بجھ نہ پائے
میں پچھم موت کا مول
میں اپنی آپ شہادت
میری ضامن رہی ہوا

سندھی سے ترجمہ

نظم : سحر امداد
ترجمہ : نسرین انجم بھٹی

نظم

مہاساگر، شہد سندھو۔ بہتا رہے گا۔ بہتا رہے گا۔ کہانیاں کہتا رہے گا
جب بھی کوئی سورما ـــــ نوجواں
اس سرزمیں پہ قرباں ہوتا ہے
مجھے یوں لگتا ہے
سچ اور جھوٹ کی جنگ نے میرا سُرجن بیٹا چھین لیا ہے
میرا زخمی من
تپتے تھلوں میں ریت سا بکھرتا ہے
میرے بھورے نینوں میں
مہاساگر ۔ شہد سندھو
رک سا جاتا ہے
لیکن ۔ سدا سہاگن سندھڑی امر ہے
بیٹے
بیٹوں کے بیٹے
سندھڑی میری پیاری ماں
ایسے سورما
جنتی رہیں گی
مہاساگر شہد سندھو کی امرت دھارا بہتی رہے گی
بہتی رہے گی
ابد تک

ستّار سیّد

جسم نہیں یہ .....

جسم نہیں، یہ جلی بجھی روحوں کے درد لبادے ہیں
بھیگی اوس، دہکتی آگ میں جمتے تپتے جسموں پر
دھول جمی ہے سال ہا سال کی خاک اور خون میں گندھی ہوئی
ظالم رسموں کی
تیز ہواؤ! اِن جسموں پر کوڑے بن کر برس رہی ہو؟
برسو اور بھی زور سے برسو!
اتنا برسو
ادھڑیں جسم۔ اور پھوٹ بہیں،
اس خون کے دھارے
جو گردش سے عاری ہے ـــــ
شٹ، شٹا شٹ
برسو، کوڑو!
شٹ شٹا شٹ، برسو
تاکہ خاک اور خون میں لتھڑی
بے حس کر دینے والی رسموں کی
دھول تو اُترے
جما ہوا خوں پگھلے
پھوٹے ـــــ
کھولتے خون، دہکتی آگ کی اوٹ سے
رنگلا موسم
جسموں کی خوشحالی کا۔ روحوں کی ہریالی کا

افضال احمد سیّد

اگر کوئی پوچھے

اگر کوئی پوچھے کہ درخت اچھے ہوتے ہیں یا چھتریاں
تو بتانا کہ درخت
جب ہم دھوپ میں ان کے نیچے کھڑے ہوں
اور چھتریاں جب ہم دھوپ میں چل رہے ہوں
اور چلنا اچھا ہوتا ہے ان منزلوں کے لئے
جہاں جانے میں کئی سواریاں اور کئی ارادے بدلنے پڑتے ہوں
حالانکہ سفر تو انگلی میں ٹوٹ جانے والی سوئی کی نوک کا بھی ہوتا ہے
اور اس آنکھ کا بھی جو اسے دل میں جاتا ہوا دیکھتی ہے

اگر کوئی پوچھے کہ دروازے اچھے ہوتے ہیں یا کھڑکیاں
تو بتانا کہ دروازے دن کے وقت
اور کھڑکیاں شاموں کو
اور شامیں ان کی اچھی ہوتی ہیں جو ایک انتظار سے دوسرے انتظار میں سفر کرتے ہیں
حالانکہ سفر تو اس آگ کا نام ہے
جو درختوں سے زمین پر کبھی نہیں اتری

مانگنے والے کو اگر کچی روٹیاں ایک دروازے سے مل جائیں تو اسے
دیا سلائی اگلے دروازے سے مانگنی چاہیئے
اور جب بارش ہو رہی ہو تو کسی سے کچھ نہیں مانگنا چاہیئے

نہ بارش رکنے کی دعائیں
دعا مانگنے کے لئے آدمی کے پاس ایک خدا کا ہونا بہت ضروری ہے
جو لوگ دوسرے کے خداؤں سے اپنی دعائیں قبول کروانا چاہتے ہیں
وہ اپنی دائیں ایڑی میں گڑنے والی سوئی کی چبھن بائیں میں محسوس نہیں کر سکتے

بعض لوگوں کو خدا ورثہ میں ملتا ہے
بعض کو تحفہ میں، بعض اپنی محنت سے حاصل کر لیتے ہیں
بعض چُرا لیتے ہیں
بعض قرض کر لیتے ہیں
میں نے خدا قسطوں میں خریدا تھا
قسطوں میں خریدے ہوئے خدا اس وقت تک دعائیں نہیں پوری کرتے جب تک
ساری قسطیں ادا نہ ہو جائیں

ایک بار میں خدا کی قسط وقت پر ادا نہ کر سکا
خدا کو میرے پاس سے اٹھا لے جایا گیا
اور جو لوگ مجھے جانتے تھے
انہیں پتہ چل گیا
کہ نہ اب میرے پاس خدا ہے اور نہ قبول ہونے والی دعائیں
اور میرے لئے ایک خدا قرض کر لینے کا موقع بھی جاتا رہا

انتظار حسین

کشتی

باہر مینہہ برس رہا تھا، اندر حبس بہت تھا۔ حبس سے پریشان ہو کر کسی کسی نے سر باہر نکالا، پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔

"بارش کچھ کم ہوئی؟"

"بالکل کم نہیں ہوئی۔ اسی شور کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی ہے۔ یہ بارش ہے یا قیامت ہے؟"

"اندر کے حبس سے تو بہرحال بہتر صورت ہے۔"

"کوئی بہتر صورت نہیں۔ اندر حبس باہر بارش۔ آدمی آخر کہاں جائے۔"

"سب کچھ تو ڈوب گیا۔ اب آخر بارش کیوں ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"ہم جو باقی رہ گئے ہیں۔"

"ہاں بس ہم ہی باقی رہ گئے ہیں۔ مگر ہم ہیں کتنے، انگلیوں پر گن لو۔ باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔"

"ہاں باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔ شاید اس لئے بھی حبس بہت ہو گیا ہے۔ جانوروں کے درمیان سانس لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک ہم اس طرح جانوروں کے درمیان بسر کرتے رہیں گے۔"

"ہاں پتہ نہیں کب تک۔ بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ کتنے دن گذر گئے کہ اسی ایک رفتار سے ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"شروع کس دن ہوئی تھی؟"

"کس دن۔ ہاں کم از کم حساب تو کرنا چاہیئے کہ کس دن شروع ہوئی تھی اور اب کتنے دن ہو گئے۔" سب نے اپنے اپنے طور پر یاد کیا۔ پر کسی کو یاد نہ آیا کہ وہ کونسا دن تھا اور کونسی تاریخ تھی جب برسنا شروع ہوا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب کچھ اندازہ نہیں کہ کتنے دن سے سفر میں ہیں۔"

کتنے دن سے ہم سفر میں ہیں، سب سوچ میں پڑ گئے۔ کتنے دن سے، کتنے برس سے، کتنی صدیوں سے۔ بارش اور سفر میں یہی ہوتا ہے۔ لگاتار برسے تو لگتا ہے کہ برس برس سے برس رہا ہے اور برس برس برسے گا۔ سفر کے بیچ کوئی پڑاؤ نہ آئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنم جنم سے سفر میں ہیں۔

"بہرحال جس دن بارش شروع ہوئی ہے اسی دن ہم گھروں سے نکلے تھے۔ سو اگر ہم میں سے کسی کو یہ یاد ہو کہ ہم نے کس روز اپنے گھر کو چھوڑا تھا تو ...."

"گھروں کو؟"

گھروں کو چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گھروں کا نام کسی کے لب پہ آیا تھا۔ تو ہمارے گھر بھی تھے۔ یہ سوچ کے وہ حیران ہوئے اور چھوڑے ہوئے گھر دفعتاً ان کے تصوّر میں یوں ابھرے جیسے ابھی ابھی وہ انہیں چھوڑ کر نکلے ہیں۔

"کاش وہ بھی میرے ساتھ سوار ہو جاتی۔ جانے اب کن پانیوں میں گھری ہو گی۔"

"وہ کون تھی؟"

"وہ جو زینے سے اترتے ہوئے سیڑھیوں کے بیچ مجھ سے ٹکرائی تھی۔" اور وہ سارا منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی کہ اپنے لبادے کے اندر دو پکے پھل لئے پھرتی تھی۔ اور جب ان سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے اسے تھاما تو لگا کہ دو گرم دھڑکتے پوٹے والی کبوتریاں اس کی مٹھیوں میں آگئی ہیں دوسرے ہی لمحہ وہ اس کی گرفت سے آزاد تھی اور وحشی ہرنی کی مثال قلانچیں بھرتی بھاگی چلی جارہی تھی۔ پہ بعد اس کے وحشت اس ہرنی کی کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ بھری دوپہر میں ٹیلے کے پیچھے کھجور تلے وہ اس کے گرم بوجھ سے ڈھیتی چلی گئی۔

زینے، ڈیوڑھیاں، آنگن، ٹیڑھی میڑھی راہیں، ٹیلے، پھلوں سے لدے پرندوں سے بھرے اونچے پیڑ، ایک دم سے انہیں کتنا کچھ یاد آگیا تھا۔

"ان گھروں کو کیا یاد کرنا جو ڈھے گئے اور بہہ گئے۔"

ہاں یہ تو انہیں ابھی تک خیال ہی نہیں آیا تھا کہ جو پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہا ہے اس نے ان کے گھروں کو کہاں چھوڑا ہو گا۔

"مگر ہم ان گھروں کو کیسے بھول جائیں کہ ہم نے ان گھروں میں بیٹھ کر اترنے والی دلہنوں کے لئے گیت گائے اور گزرنے والوں کے لئے گریہ کیا۔"

تب سب آنکھیں ڈبڈبائیں۔ پھر ان سب نے مل کر اپنے گھروں کو یاد کیا اور وہ روئے۔

"عزیزو ان گھروں کی بربادی مقدر ہو چکی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

تب گاگامش دو زانو ہو بیٹھا اور یوں گویا ہوا کہ ہمسفرو دیدۂ عبرت نگاہ رکھتے ہو تو مجھے دیکھو کہ میں کن کن پرغرور سمت مردوں سے گزر کر اس اقلیم میں پہنچا جہاں آتناپشتم استراحت کرتا تھا۔ میں نے فریاد کی کہ اے آتناپشتم میں نے سنا تھا کہ حرکت میں برکت ہے اور سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ پر مجھ درماندۂ راہ نے حرکت کو بے برکت پایا اور سفر کو لاحاصل جانا جب تو حیات جاودانی کے مزے لوٹتا ہے اور اس بہشت بنیاد اقلیم میں آرام کرتا ہے۔ یہ سخن سن آتناپشتم نے تامل کیا۔ پھر یوں لب کشا ہوا کہ اے تیرہ بخت میں دیکھتا ہوں کہ رنج سفر نے تجھے ہلکان کر دیا ہے اور رالم نے تیرے اندر گھر کر لیا ہے۔ سو تو گھڑی بھر کے لئے دم لے۔ پھر مودب ہو بیٹھ اور گوش ہوش سے سن کہ کیونکر میں نے حرکت میں برکت دیکھی اور سفر کو وسیلۂ ظفر جانا اور اس راہ حیاتِ جاوداں پائی۔ میں نے اپنا گھر ڈھایا۔ پھر

کشتی بنائی۔ اس پر میں حیران ہوا یوں بولا کہ اے بزرگ یہ میں کیا سنتا ہوں۔ کہیں کوئی اپنے ہاتھوں سے بھی اپنا گھر ڈھاتا ہے۔ اتناپشتم یہ سن کر افسردہ ہوا۔ پھر بولا کہ میرے خداوند کی مرضی یہی تھی۔ وہ میرے خواب میں آیا اور خبر دی کہ انیلیل غصّے میں ہے کہ زمین پہ شور بہت ہو گیا ہے کہ یہ شور اسے سونے نہیں دیتا۔ سوائے اتناپشتم تیری عافیت اس میں ہے کہ گھر اپنا ڈھادے اور کشتی تعمیر کر۔ تو اے گلگامش گھر اپنا میں نے خداوند کی مرضی سے ڈھایا اور کشتی بنائی۔

تب انہوں نے سوچا اور یاد کیا کہ ہوا کیا تھا۔ بھلا یوں کہ زمین آدمیوں سے بھر گئی، آدمیوں سے دنیز ظلم سے۔ خداوند نے تو بس آدمی کو پیدا کیا۔ پر اس نے آگے سے بیٹیاں پیدا کر ڈالیں۔ اور خداوند کے بیٹوں نے ان بیٹیوں کو خوبصورت پایا اور اپنی جورو میں بنا لیا۔ اور ان بیٹیوں نے جورو میں بن کر مزید بیٹیاں جنیں کہ مزید خدا کے بیٹے ان پر ریجھے اور انہیں جورو ئیں بنا کر اپنے گھروں میں لوٹے۔ بس اس طور زمین آدمیوں سے بھرتی چلی گئی۔ آدمیوں سے دنیز ظلم سے۔ اور ایسا ہوا کہ خداوند نے زمین پر نظر کی اور دیکھا کہ زمین بگڑ گئی ہے۔ تب خداوند زمین میں انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا۔ خداوند پچھتایا اور دلگیر ہوا اور پھر یوں بولا کہ میں نے آدم زاد کو بھر پایا۔ سو میں رب انسان کو جسے میں نے خلق کیا تھا نابود کروں گا کہ زمین بہت بگڑ گئی ہے اور ظلم سے بھر گئی ہے۔

پر انہیں بگڑے ہوؤں کے بیچ ایک نیک بندہ تھا کہ خداوند کے ساتھ چلتا تھا۔ اور خداوند نے اس سے کہا کہ اے ملک کے بیٹے میں تجھے بچاؤں گا۔ سو تو ایسا کر کہ ایک کشتی بنا۔ اور دیکھ جب طوفان اٹھے تو تو ہر ذی روح کے ایک جوڑے کو اپنے ساتھ لے اور کشتی میں بیٹھ جا۔ اور اس بندے نے ویسا ہی کیا جیسا اس کے خداوند نے اس سے کہا تھا۔

پر وہ بندہ بھی جورو والا تھا۔ اور اس جورو نے بیٹے جنے جنھوں نے بڑے ہو کر خوبصورت بیٹیوں کو اپنی جورو بنایا۔ اور وہ جورو کو کشتی بناتے دیکھتی تو ٹھٹھا کرتی اور بیٹوں کو جمع کر کے کہتی کہ دیکھو تمہارے باپ نے یہ کیا کھڑاک پھیلا رکھا ہے کہ دن بھر اور رات بھر لکڑیاں کاٹ کاٹ کے کچھ بناتا رہتا ہے

یہ طعنے سن سن ملک کے بیٹے نوح نے آخر زبان کھولی اور کہا کہ اے مری زندگی کی شریک مَیں اس دن سے کہ تیرا گرم تندور ٹھنڈا ہو جائے اور تو آ کر مجھے طوفان کی خبر سنائے۔ اور بھور بھئے منوجی یہ دیکھ بھوچک رہ گئے کہ مچھلی بڑی ہو گئی ہے اور باسن چھوٹا رہ گیا ہے۔ کل ہی تو اشنان کرتے سمے ان کے چلو میں یہ مچھلی آ گئی تھی کہ اس سمے چھنگلیا انگلی کے سمان تھی۔ وہ اسے پھینکنے لگے تھے کہ اس نے دہائی دی کہ پربھو شا نتی۔ میں تمہارے شرن لینے آئی ہوں کہ میں چھوٹی مچھلی ہوں اور ندی اندر بڑی مچھلیوں کے بیچ نہیں رہ سکتی کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ انھوں نے اسے اپنے شرن میں لیلیا اور ایک کونڈے میں جل بھر کے اسے اس میں ڈال دیا۔ پھر اب وہ دیکھ رہے تھے کہ کونڈا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہو گئی ہے۔

منوجی نے مچھلی کو کونڈے سے نکال کے گھڑے میں ڈال دیا اور پانی اس میں بھر دیا۔ پر اگلے دن بھور بھئے جب منوجی پوجا کے لیے اٹھے تو دیکھا کہ گھڑا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہو گئی ہے کہ دُم اس کی گھڑے سے باہر نکلی ہوئی ہے۔ اب انہیں اور بھی اچرج ہوا کہ تنک سی مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ گھڑے میں نہیں سماتی۔ مچھلی نے دہائی دی کہ پربھو کرپا کرو۔ گھڑے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

منوجی کی کٹیا کے باہر ایک جل کنڈ تھا۔ انھوں نے مچھلی کو گھڑے سے نکال کے جل کنڈ میں ڈال دیا اور نچنت ہو گئے پر

اگلے دن پھر انہیں چنتا لگ گئی۔ جل کنڈ چھوٹا رہ گیا تھا، مچھلی بڑی ہو گئی تھی کہ پونچھ اس کی جل کنڈ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ مچھلی نے پھر دہائی دی کہ پربھو تم نے مجھے اپنے شرن میں لیا ہے پر مجھے تمہارے شرن میں چین نہیں ملا۔ منوجی نے یہ سن کے مچھلی کو جل کنڈ سے نکالا اور نگر سے باہر تلیا میں کھسکا دیا۔ کہا کہ رے اب تو تلیا میں تیرا اور چین کر۔

منوجی مچھلی کو تلیا میں چھوڑ کے گھر ایسے آئے جیسے سر سے بڑا بوجھ اتار کے آئے ہیں۔ اس رات وہ چین سے سوئے۔ پر جب تڑکے میں ان کی آنکھ کھلی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مچھلی کی پونچھ تلیا سے نکلی لمبی ہوتے ہوتے ان کے آنگن میں آن پھیلی تھی۔ وہ جھٹ پٹ اٹھ تلیا پہ گئے کیا دیکھا کہ تلیا چھوٹی رہ گئی ہے۔ مچھلی بڑی ہو گئی ہے، اتنی بڑی کے تلیا کے اندر تو بس اس کا منہ تھا۔ باقی دھڑ اور پونچھ سب باہر۔ مچھلی بولی کہ ہے پربھو، تمہارے شرن میں میں تیرنے اور سانس لینے کو ترستی ہوں۔

منوجی نے مچھلی کو تلیا سے نکالا، کمر پہ لادا اور چلے گنگا ندی کی اور۔ وہاں جا کے انہوں نے اسے ندی میں چھوڑا اور کہا کہ ہے ری مچھلیا۔ میں نے تجھے گنگا میا کی گود میں دیا۔ میا کی گود میں چاہے سمٹ جا ہے پر وہ ابھی یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی۔ اتنی پھیلی کہ گنگا کی گود چھوٹی رہ گئی مچھلی بڑی ہو گئی۔

منوجی یہ دیکھ ہکا بکا رہ گئے۔ بولے کہ اری تو نرالی مچھلی ہے کہ پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ جگ کا نیم یہ ہے کہ جتنی چادر دیکھے اتنے پاؤں پھیلائے۔ پر تیرے لچھن یہ ہیں کہ جتنا جل دیکھتی ہے اس سے زیادہ پھیل جاتی ہے۔ اچھا اب تیرا اپائے یہی ہے کہ میں تجھے ساگر کے بھینٹ کر دوں۔ یہ کہہ کے انہوں نے مچھلی کو گنگا کی گود سے لیا اور کندھے پہ لاد چلے ساگر کی اور۔

ساگر کی اور جاتے ہوئے منوجی کو دھیان کی لہر بہا کے بیتے سمے میں لے گئی جب وشنوجی بونے کے روپ میں پرگھٹ ہوئے تھے۔ انہوں نے اس دشٹ راجہ سے تین ڈگ دھرتی مانگی تھی۔ اس مورکھ نے سوچا کہ بونے کے تین ڈگوں میں کتنی دھرتی جاتی ہے۔ مانگ مان لو۔ یہ سوچ اس نے مانگ مان لی۔ پر وشنوجی ایک دم سے بونے سے دیو بن گئے۔ انھوں نے تین ڈگ ایسے بھرے کہ دھرتی اور آکاش دونوں تین ڈگوں میں سمیٹ لئے۔ اس دھیان نے انہیں چونکا دیا۔ ایک سندیہہ کے ساتھ انہوں نے مچھلی کو دیکھا۔ پرنت دھیان کی اک اور لہر آئی۔ جی میں کہا کہ اس سمے تو دھرتی راکشسوں کے چنگل میں تھی۔ سو وشنو مہاراج نے انہیں اس پرکار چل دیا اور دھرتی کو ان کے چنگل سے نکالا۔ آج کے دشٹ ایسے کونسے بڑے راکشس ہیں کہ وشنو مہاراج ایسا سوانگ بھریں گے۔ انھیں وہ چاہیں تو ابھی چیونٹیوں کے سمان مسل ڈالیں۔

بس یہی سوچتے سوچتے منوجی ساگر کنارے پہنچ گئے۔ مچھلی کو ساگر میں دھکیلا اور کہا کہ اب تو میرا پنڈ چھوڑ۔ اس وشال ساگر میں جتنا من چاہے اتنا پھیل جا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی۔ پھیلتے پھیلتے پورے ساگر پر چھا گئی۔ منوجی نے ایک بھے کے ساتھ یہ کچھ دیکھا۔ پھر شردھا سے ان کا سر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کے آنکھیں موند کے کھڑے ہو گئے اور لگے کہنے، پربھو شانتی۔ پربھو شانتی۔ آواز آئی کہ ہے منو دھرتی ادھرمیوں کے ہاتھوں اشانت ہے۔ پر تجھے شانتی ملے گی۔ سو تو ناؤ بنا۔ جب ساگر امنڈے اور دھرتی ڈوبے تو پنچھیوں پکشوؤں میں سے ایک ایک جوڑا سنگ لے اور ناؤ میں بیٹھ جا۔

منوجی یہ سن بولے کہ ہے پربھو جب ساگر امنڈے گا تو میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی بودی نیاڈوبے گی یا ترے گی۔ آواز آئی کہ ہے منوتو اسے میری مونچھ کے بال سے باندھ دیجیو۔ بولے کہ باندھوں گا کاہے سے۔ میرے پاس کوئی رسی نہیں ہے۔ ترنت ایک سانپ رسی سمان لہروں میں لہرایا۔ ہے منو یہ رہی رسی، اس سے نیا باندھ لیجیو۔

تب زوجہ حضرت نوح کی حضرت کے پاس پہنچی اس حال سے کہ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے اور ہوش اڑے ہوئے تھے۔ بصد تشویش بولی کہ اے مرے والی، ہمارا گرم تنور ٹھنڈا ہو گیا ہے اور پانی اس کی تہہ میں سے ابل رہا ہے۔ حضرت نے تامل کیا۔ پھر یوں بولے کہ دیکھ ربِّ ذوالجلال کے جلال کا دن آ پہنچا ہے۔ تو یوں کر کہ اپنے جنوں اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس پر وہ جورو یہ بولی کہ میں تنور پہ طشت ڈھکے دیتی ہوں۔ پھر پانی نہیں ابلے گا۔ یہ کہہ وہ دوڑی ہوئی اندر گئی۔ طشت اٹھا کر کے تنور پہ ڈھکا اور اوپر اس کے بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ یہ کر کے وہ باہر آئی اور اپنے والی سے بولی کہ دیکھ میری ترکیب کام آئی۔ پانی ابلنا بند گیا ہے۔ وہ یہ کہتی تھی کہ پانی انگنائی سے نکل کے باہر امنڈنے لگا۔ طشت اور پتھر اس کے بیچ تیر رہے تھے۔ اور اسی ساعت برابر کے گھر والے کی زوجہ حواس باختہ آئی اور چلائی کہ میرے گھر کے تنور سے فوارہ چھوٹ رہا ہے کہ انگنائی میری جل تھل ہو گئی۔ پھر مختلف گھروں سے بیبیاں نکلیں اس حال سے کہ ہوش ان کے اڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے لب پہ یہ خبر تھی کہ تنور ان کے گھر کا گرم سے ٹھنڈا ہوا اور پانی اس سے ابلنے لگا۔ اور سیلاب باہر سے امنڈے تو اسے روکا جا سکتا ہے مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے تو کیونکر اس پہ بند باندھا جائے۔

سو یوں ہوا کہ دم کے دم میں اس بستی کے سب تنور ٹھنڈے ہو گئے۔ اور وہ ایسا وقت تھا جب ابھی ابھی گھر والیوں نے اپنے اپنے تنور گرم کیے تھے۔ ہر تنور میں انگارے دہک رہے تھے اور روٹیاں پک کر گرم گرم نکل رہی تھیں کہ دفعتاً ایک تنور ٹھنڈا ہوا پھر دوسرا تنور ٹھنڈا ہوا۔ پھر کسی تیسرے تنور میں اگ بجھی اور نمی پیدا ہوئی۔ پہلے نمی پیدا ہوئی۔ پھر ہلکا ہلکا پانی رسنے لگا۔ پھر جیسے تہہ پھٹ گئی ہو ایک دم سے پانی ابلنے لگا۔ پانی تنوروں سے ابلا۔ انگنائیوں میں امنڈا اور شاہراہوں میں پھیلا۔ اور پھر بارش شروع ہو گئی ایسے جیسے آسمانوں کے سب دریچے کھل گئے ہوں تب حضرت نوح نے کہا کہ بیشک خداوند کے قہر کا دن آ پہنچا ہے۔ اور تب حضرت نوح نے کشتی نکالی، سب جانوروں کے جوڑوں کو اس میں بٹھایا، اور زوجہ سے کہا کہ اے مری زوجہ دیکھ قہر کی ساعت آن پہنچی۔ تنور پہ ڈھکا ہوا تیرا طشت پتے کی مثال پانی میں بہہ گیا اور انگن تیرا پانی سے بھر گیا۔ اب یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔

تس پر وہ زوجہ یہ بولی کہ اے مری والی اس گھر میں میں نے تیرے سنگ پانچ سو سے اوپر برس کھینچے، دن گزارے راتیں بسر کیں۔ یاد کر کہ ہم دونوں نے مل کر اس گھر میں کتنے دکھ دیکھے اور کتنے سکھ پائے۔ کتنی بار میں بار آور ہوئی، دودھوں نہائی پوتوں پھلی اور پوتوں پڑپوتوں کی بہاریں دیکھیں۔ سوچ کہ میں کیونکر اس گھر کو چھوڑ دوں۔''

تب نوح نے فرمایا کہ اے مری رفیقہ، خانۂ ہستی بے بنیاد ہے اور گھر کہ آدم کے بیٹوں نے بنائے بودے ہیں۔ اور وائے خرابی میری کہ میں نے گھر بنایا بیچ ان لوگوں کے جن کے ظلم سے زمین بھر گئی اور ٹیڑھی ہو گئی۔ سو ڈھینا اس گھر کا مقدر ٹھہرا۔ سو اس سے پہلے کہ دیواریں اس کی بیٹھ جائیں اور چھت اس کی آن پڑے تو یہاں سے نکل اور کشتی میں بیٹھ کہ آج زمین و آسمان کے بیچ وہی ایک پناہ گاہ ہے۔''

پھر زوجہ ان حضرت کی تو ھیٹ ہو کے یہ بولی کہ اگر میرا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو پھر مجھے کہاں پناہ ملے گی۔

تب حضرت اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوا اور کہا کہ اے مرے بیٹو تمھاری ماں نے تو زمین پکڑی ہے اور ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئی ہے۔ تم باپ کی سنو اور جلد کشتی میں بیٹھ جاؤ مبادا تم بھی نافرمانوں میں شمار کئے جاؤ اور ہلاکت کے گھیرے میں آجاؤ۔

یہ سن سب بیٹے کشتی میں سوار ہوئے سوائے بڑے بیٹے کنعان کے کہ اس نے ماں کی راہ کو اپنایا اور باپ سے کہا اے مرے باپ میں کیونکر اس گھر کو جس میں مری نال گڑی ہے چھوڑ کر اور کیونکر اس مٹی سے جس نے مجھے رس اور جس دیا ہے منہ موڑ کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤں جس میں تو نے ہر رنگ کا جناور جمع کر لیا ہے۔

حضرت نے بیٹے کی بات سن کے کہا کہ اے مرے بیٹے دیکھ یہ قہر کا دن ہے۔ سو انسان اور حیوان سب ایک کشتی میں سوار ہیں کہ طوفان بے احسان ہے اور زندگی کی ضمانت اس کشتی کے سوا کہیں نہیں ہے۔

بیٹا بولا کہ اے مرے باپ تنہائی کی موت ہجوم کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ اور گھر کے اندر پانی میں غرق ہو جانا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی اجنبی پانیوں میں جانوروں کے درمیان بسر کرے۔

تب حضرت نوح اپنی بی بی سے اور اپنے بیٹے سے مایوس ہوئے کہ انھوں نے زمین پکڑی اور نافرمانوں میں شمار ہوئے۔ اور تب کشتی رواں ہوئی اور حضرت نے کہ سلام ہو ان پر ہمارا مڑ کے بعد یاس اس گھر کی جانب دیکھا جسے وہ چھ سو برس تک رس بس کر چھوڑ رہے تھے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے باپ کا بنایا ہوا بڑے پھاٹک والا وہ گھر کہ کل تک شاد آباد تھا اب امنڈتی موجوں کے بیچ خالی ڈھنڈار پڑا تھا اور ان کی زوجہ نے اور ان کے بیٹے نے برستے آسمان تلے چھت پہ پناہ لی ہوئی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ وہ گھر آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور پانی کا زور بڑھتا چلا گیا۔

مینہ ایسے برسا جیسے آسمان کے سب دروازے اور دریچے چوپٹ کھل گئے ہوں مینہ دن برسا رات برسا دن دن برسا، لگاتار برسا کہ دن اور رات کا، صبح اور شام کا دن اور دن کا فرق مٹتا چلا گیا۔ اور زمین نظروں سے یوں اوجھل ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ کوے کو کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے بیکلی ہوئی۔ اس نے پر پھڑپھڑائے اور کائیں کائیں کرتا باہر اڑ گیا مگر چکر کاٹنے کے بعد پھر واپس آگیا اور اس کی واپسی اعلان تھی کہ اب کہیں خشکی نہیں ہے کہ پنجے ٹکائے جا سکیں۔

پھر چوہوں کے جوڑے کو بیکلی ہوئی۔ انھوں نے پوری کشتی کا چکر کاٹا کہ کہیں کوئی بل ملے اور وہ اس میں گھس جائیں۔ پر انھوں نے کشتی میں کوئی بل نہ پایا۔ مگر بل تو ہونا چاہیئے کہ وہ اس میں گھس سکیں، یہ سوچ انھوں نے کشتی کے پیندے کو کترنا شروع کر دیا۔ کشتی کے جانوروں نے یہ دیکھا کہ ہراساں ہوئے یہ سوچ کر کہ مبادا کشتی میں چھید ہو جائے اور اس میں پانی بھر جائے اور وہ غرق ہو جائے۔ تب انہوں نے فریاد کی حضرت نوح سے اور افسوس کیا حضرت نوح نے کہ وائے خرابی میری کہ میں نے کشتی میں سوار کیا چوہوں کو جن کا شیوہ ہی یہ ہے کہ کترو اور سوراخ کرو۔ حضرت نے انہیں اس فعل سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر وہ باز نہ آئے۔ تب حضرت نے تنگ آکر شیر نے منہ پہ ہاتھ پھیرا کہ ہاتھ

پھیر تے ہی نکلی اس کے نتھنوں سے ایک بلی جھپٹی چوہوں پر اور چٹ کر گئی انہیں دم کے دم میں۔

تب کشتی کے سب جانوروں نے شادمانی کی اور بلی پر آفرین بھیجی کہ اس نے انہیں آنے والی تباہی سے بچا لیا۔ پھر یوں ہوا کہ اسی ساعت کبوتری نے پر پھڑ پھڑائے اور کشتی سے نکل کر اڑ گئی اور دیکھا انہوں نے کہ مینہ تھم گیا ہے اور کبوتری زیتون کی پتی چونچ میں دبانے واپس آ رہی ہے۔ اور وہ شادمان ہوئے یہ سوچ کر کہ پانی اترنے لگا ہے اور خشکی نمود کرنے لگی ہے۔ مگر پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ جونہی وہ زیتون کی پتی سمیت کشتی میں اتری تو نہی بلی اس پہ جھپٹی اور اسے چٹ کر گئی۔ یہ کیا ہوا۔ انھوں نے دیکھی اور دم بخود رہ گئے۔ ساتھ میں زیتون کی پتی بھی عجیب بات ہے۔

"اب ہم بیچ پانیوں میں ہیں۔ اور کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ خشکی کہاں ہے"

مینہ بینک ختم گیا تھا۔ بادل کی گرج کتنی دیر سے سنائی نہیں دی تھی۔ مگر پانی کی دھار اسی شور سے گرج رہی تھی اور اونچے پہاڑیوں کی چوٹیوں سے گزر رہی تھی۔ کسی کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا۔ پھر فوراً ہی اندر کر لیا "بہت پانی ہے"

اندر حبس بہت تھا اور بلی بیٹھی تھی۔ باہر پانی گرج رہا تھا اور زمین و آسمان ملے نظر آ رہے تھے۔ زمین و آسمان اور زمین و زمان۔ لگتا تھا کہ ایک زمانہ ہو گیا انہیں گھروں سے نکلے ہوئے اور ایک زمانہ ہو گیا انہیں پر شور پانیوں کے بیچ ڈولتے ہوئے۔

"کیا ہم کبھی واپس نہیں جا سکیں گے ؟"

"کہاں ؟"

"اپنے گھروں کو۔"

اپنے گھروں کو ؟ ایک بار پھر انہیں حیرانی نے آ لیا۔ گھر۔ ایک بار پھر گھروں کی یاد نے انہیں ایسے آ لیا جیسے کوئی بڑا جھکڑ پیڑوں کو آلے اور انہیں ہلا ڈالے۔

"عزیزو، کونسے گھر، باہر جھانک کے دیکھو۔ کوئی بستی کوئی دیوار و در کہیں دکھائی پڑتے ہیں۔ کیا تم نے گلگامش سے نہیں سنا کہ اتنا پشتم نے گھر ڈھا کر کشتی بنائی تھی۔"

"اتنا پشتم نے اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں مگر اتنا پشتم کے خداوند کی تو تسلی ہو گئی کہ اب زمین پر پانی کے شور کے سوا کوئی شور نہیں ہے کہ اس کی نیند میں خلل ڈالے۔"

مارکنڈے نے باہر جھانک کے دیکھا۔ چاروں اور گھور اندھیرا۔ اندھیرا اور سناٹا اور جل کی گرجتی دھارا۔ پرم آتما نیند میں تھی اور اننت ناگ کے پھن پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے سر اندر کر لیا۔ نارائن۔ نارائن، نارائن، گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خداوند کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ پانی جس کا کوئی اور شور نہیں تھا۔ پانی کی گرجتی دھار میں ازل اور ابد کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور زمین اور زماں گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں کچھ یاد نہیں تب کہ کب سے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور کب سے پر شور پانیوں میں بہہ رہے ہیں۔ تنکوں کی طرح۔ اور کوا پھر بیکل ہوا۔ پر پھڑ پھڑائے۔

کوا اڑ گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ انھوں نے باہر جھانک کے دیکھا مینہ بینک ختم گیا تھا۔ مگر پانی اسی طرح امنڈ رہا

تھا اور گرج رہا تھا۔ کوے کا دور دور پتہ نہیں تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی اترنا شروع ہو گیا ہے اور کہیں نہ کہیں زمین کا کوئی ٹکڑا خشک ہو گیا ہے کہ کوے کو پنجے ٹکانے کی جگہ مل گئی اور وہ لوٹ کے نہیں آیا۔"

"مگر وہ خشکی کی خبر لیکر آنے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔"

"کوا اسیانا جانور ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گا۔"

"خیر یہ تو پتہ چل ہی گیا کہ کہیں نہ کہیں خشکی ہے سو ہماری کشتی بھی کسی نہ کسی کنارے جا ہی لگے گی۔ سوائے ہمارے رب ہمیں برکت کی جگہ اتاریو اور تحقیق تو سب سے بہتر آتارنے والا ہے۔"

"ہمسفرو، برکت کی جگہ کہاں ہے۔ ہم گہرے پانیوں کے بیچ میں ہیں اور کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ خشکی کہاں ہے اور برکت کی جگہ کونسی ہے۔ ہاں اگر نوح ہمارے بیچ میں ہوتا تو ......"

"نوح؟ .... نوح یہاں نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

سب نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ نوح کہاں ہے۔ تب حاتم طائی نے زبان کھولی اور یہ کلام لب پر لایا کہ "اے ہمسفران عزیز و اے عزیزان باتمیز صبر کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو۔ دیکھتے رہو کہ پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے مجھے دیکھو کہ میں نے بھید بھری ندیوں کے بیچ ایسی کشتیوں میں سفر کیا ہے جن کا کوئی کھویا نہیں تھا۔ کان دھر کر سنو کہ کوہ ندا کے کی مہم میں مجھ پہ کیا بیتی۔ حیران سرگرداں چلا جاتا تھا کہ ایک پہاڑ بلند عظیم الشان نظر آیا۔ اسی کی طرف متوجہ ہوا۔ تین دن کے بعد اس کے نیچے جا پہنچا اور جب پتھر کو اٹھا کر دیکھا اس کے تلے لہو ہی بہتے پایا۔ فکر کرنے لگا کہ کوئی یہاں نہیں ہے جس سے اس کا احوال پوچھوں پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بڑے زور و شور سے بہہ رہا ہے اور اس کا اور چھور بھی نہیں ملتا۔ نہایت متفکر ہوا۔ دل میں کہا کہ یا الٰہی رب اسے کیونکر پار اتروں۔ اتنے میں ایک ناؤ نظر پڑی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے۔ جانا میں نے کہ کوئی ملاح لیے آتا ہے۔ جب کنارے آ لگی تو اس پر کسی کو نہ دیکھا۔ متعجب ہوا۔ پھر شکر خدا کا بجا لا کر سوار ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دسترخوان میں کچھ لپٹا دھرا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی فوراً ہاتھ بڑھا کر کھولا تو دو گرم گرم نان اور کباب۔ حیران ہوا کہ یا الٰہی یہ گرم نان کس تندور سے آئے ہیں۔ دھیان آیا کہ شاید ملاح نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ پرائے کا حق کھانا خوب نہیں اتنے میں ایک مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا کہ اے حاتم۔ یہ روٹیاں اور کباب تیرا ہی رزق ہے۔ شوق سے کھا۔ کچھ اندیشہ جی میں نہ لا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار گئی۔ میں حیران کہ کشتی کون لایا۔ کباب روٹی کون دھر گیا۔ مچھلی کون تھی۔"

"مچھلی؟" سب چونک پڑے۔ مچھلی تو ان کے دھیان سے اتر ہی گئی تھی۔

"مچھلی کون تھی۔ ہاں پہلے تو پر جا پتی بھوچک رہ گئے تھے پر پھر اسی کی مونچھ کے بال سے انہوں نے ناؤ کو باندھا۔" سب نے باہر جھانک کے دیکھا۔ باہر چاروں اور گھور اندھیرا اور اندھیارا اور گرجتے جل کی ڈھارا۔ مانو بھوساگر امنڈا تھا۔ پر مچھلی کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

"مچھلی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

"متر و اسے ڈھونڈو۔ اسی کے بال سے تو ہم بندھے ہوئے ہیں۔"

سب نے باہر دور تک دیکھا۔ بس لہراتی رسی دکھائی پڑی۔ مچھلی کہیں نہیں تھی" متر و رسی تو ہے کہ سانپ سمان ناؤ کے چاروں اور لہرا رہی ہے۔ پر مچھلی نہیں ہے۔

"یہ تو بہت چنتا کی بات ہے۔"

سوچنتا نے انہیں گھیرا اور سندیہہ نے آن پکڑا۔ دور دور کی بات دھیان میں آئی۔ پر گتھی نہ کھلی۔ ناؤ ڈول رہی رہی تھی اور چاروں اور جل کی دھارا گرج رہی تھی۔

انور سجاد

ماں اور بیٹا

۹ نومبر ۱۹۷۷ء

پیارے منیر، آج سے قریباً سولہ برس پہلے میں نے ایک کہانی، ایک امریکی جریدے میں پڑھی تھی۔ مجھے لکھنے والے کا نام یاد رہا نہ کہانی کا۔ جریدہ غالباً ایور گرین ریویو تھا۔ اس کہانی نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ ان دنوں جانے کیوں یہ کہانی مجھ پر پھر آسیب کی طرح سوار ہے۔ میں اس آسیب سے نجات کی کوشش میں وہ کہانی تمہارے لئے اپنے حساب بیان کرتا ہوں ———— تمہارا، انور

راستے میں دھول، جو اس کے جاتے بیٹے کے قدموں سے اٹھی تھی، ابھی تک نہیں بیٹھی۔

زمانے نے ماں کو پہلے اپنا شوہر پھر دو بیٹے قربان کرتے دیکھا ہے۔ اب اس نے یہ آخری، نوجوان بیٹا، خوبصورت توانا، چوڑے چکلے سینے والا اپنے وطن، اپنی قوم پر قربان ہونے کو بھیجا ہے۔

وہ گھر کی دہلیز سے باہر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی مسلسل اس راستے کو تکتی ہے جس پر جاتے اس کے بیٹے کے قدموں سے اٹھی دھول ابھی تک فضا میں معلق ہے۔

جب گولیوں کی آواز، دھواں اور بارود کی بو چھٹتی ہے تو لوگ ماں کو گھر کے ملبے کے نیچے سے نکالتے ہیں، بغیر بازوؤں، بغیر ٹانگوں کے اب یہ اعضا ملبے میں ملبہ ہو چکے ہیں۔ صرف آنکھیں ہیں جو اس ادھر ہیں جس اور اس کا بیٹا گیا ہے۔

ہسپتال سے واپسی پر، اس کی خواہش کے مطابق اسے اس کے گھر کی بچی کھچی چار دیواری میں ادھ گرے دروازے کی دہلیز میں دیوار کے ساتھ ٹکا کے بٹھا دیا جاتا ہے۔ جب اسے بھوک پیاس لگتی ہے تو راستے پر آتے جاتے کسی سے بھی کہہ دیتی ہے۔ لوگ اس کی خدمت کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنا آخری بیٹا بھی وطن کی سالمیت، آزادی کے لئے داؤ پر لگا دیا ہے ـــ طالع آزماؤں، غاصبوں کی سنگینوں، گولیوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار میں اپنی آخری اینٹ چن دی ہے۔

ماں کو ہر وقت احساس ہوتا ہے کہ اس کے بازو اور ٹانگیں سلامت ہیں۔ لیکن جب مانوس قدموں کی آواز سن کر چونکتی ہے کہ سر سے ڈھلکتی چادر کو سر پہ درست کر کے، اٹھ کر، دو قدم بڑھ کر، بازو وا کر کے

انے والے کو سینے سے لگا سکے، تو ہاتھ، بازو اور ٹانگیں حرکت میں لانے کے باوجود وہ وہاں سے ہلتے ک نہیں۔ وہ حیرت سے اپنے ہاتھوں، بازوؤں اور ٹانگوں کو دیکھتی ہے جو اپنی جگہ پر نہیں ہیں اور اس کے گھر کے ملبے میں ملبہ ہو چکے ہیں۔ تب اس کی آنکھوں سے شوہر اور دو بیٹوں کی یاد اور تیسرے بیٹے کیلئے امید قطرہ قطرہ ٹپکنے لگتی ہے۔ وہ اس راستے کی فضا میں معلق دھول سے نظریں چرا کر آنکھیں جھکا لیتی ہے کہ وہ بہت باوقار ماں ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اس کے آنسوؤں سے غلط معنی اخذ کرے۔

کبھی کبھار اس کے بیٹے کا خط آجاتا ہے، اس کی تاریک راتوں اور تاریک دنوں میں روشنی لے کر۔

پھر ایک عرصہ گزر جاتا ہے کہ اس کے بیٹے کا خط نہیں آتا۔ جو اچھی بری خبریں لوگ اسے سناتے ہیں، وہ ان پر اعتبار نہیں کرتی۔ اسے صرف اپنے بیٹے پر ایمان ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کا دکھ، درد، غم، بازو، ٹانگیں سب مسکراہٹ کی صورت اس کے ہونٹوں پہ بکھرے رہتے ہیں، اس کا دل کبھی کبھار ایک دھڑکن رک جاتا ہے کہ ابھی کوئی خط، کوئی خط، کوئی تار آیا، جس میں ——————

پھر رفتہ رفتہ دن رات کی تاریکی، بڑھتی تاریکی کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ بھی تاریک پڑنے لگتی ہے۔

اور جب سوچ تاریک پڑ جاتی ہے تو یاس اور ناامیدی کے لئے غذا بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ماں کی بھوک کی طرح اذیت بھی سرد پڑ جاتی ہے۔ یوں ہی ہوتا ہے کہ جب جسم و جان کو اذیتیں ڈستی رہیں تو جسم اس زہر کا عادی ہو جاتا ہے اور جان بھی۔ پھر لمبی نیند ہوتی ہے یا نیم بے ہوشی۔ لیکن دیکھو کہ اس نیند، اس نیم بیہوشی میں بھی ماں کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور اس راہ کو تکتی ہیں جس راہ میں، اس کے جاتے بیٹے کے قدموں سے اٹھی دھول ابھی تک نہیں سمٹی۔

پھر ایک بڑی ہی عام صبح کو گولیوں کی چنگھاڑتی آوازیں ماں کو جھنجھوڑ کے جگا دیتی ہیں۔ وہ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس راہ پر ان گنت لوگوں کو دیکھتی ہے جو چیختے کراہتے، لنگڑاتے، گرتے پڑتے، اٹھتے راستے کی دھول کا پردہ اوڑھے اس کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ماں کے سینے میں کوئی طوفان نہیں اٹھتا۔ محبت اور آنسوؤں سے بھرے دل میں کوئی موج نہیں اٹھتی۔ اس کی تمام حسیں، تمام جذبے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سو چکے ہیں، نیم بے ہوش ہو چکے ہیں۔

—— بھاگو، جان بچاؤ —— ہمیں شکست ہو گئی ہے۔ دشمن آرہا ہے۔

یہ آواز گولیوں کی طرح چیختی اس کے کانوں کے قریب سے گزر جاتی ہے۔

ماں کے ہونٹوں پر سارا دکھ، درد، غم، ٹانگیں اور بازو مسکراہٹ کی صورت اس کے ہونٹوں پہ اور بھی پھیل جاتے ہیں۔

چشم زدن میں راستہ سنسان ہو جاتا ہے اور چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔

پھر اس نقطے سے جہاں، سناٹے میں رچا راستہ افق میں اترتا دکھائی دیتا ہے، دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ ایک ساتھ زمین پر پڑتے بہت سارے بھاری قدموں کی آواز اسے اپنی طرف بڑھتی سنائی دیتی ہے۔ ماں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ساتھ زمین پہ پڑتے ان قدموں کی آواز اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ

کیوں ہے۔

چند لمحوں بعد اس دھول سے، جو اس کے بیٹے کے جاتے قدموں سے اٹھی تھی اور ابھی تک فضا میں معلق تھی، نوجوانوں کا دستہ نمودار ہوتا ہے جنہوں نے اس کے اپنے وطن کی زرہ بکتریں پہن رکھی ہیں۔ ان سب کے آگے، ان سب میں خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہے جسے دیکھتے ہی ماں کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ سینے میں طوفان اُمڈ آتا ہے اور محبت اور آنسوؤں سے بھرا دل پھٹ جاتا ہے۔

——— میرے بیٹے، میرے لعل

سب اس آگے والے خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والے نوجوان کے حکم پر ہالٹ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے ہتھیاروں کا رُخ اس عورت کی جانب کر کے دھول کے پردے سے اسے دیکھتے ہیں، جس کے منہ سے اچانک گولیوں کی طرح یہ لفظ نکلے تھے، میرے بیٹے، میرے لعل۔ وہ خوبصورت، توانا، نوجوان، جس کے چوڑے چکلے سینے پر دمکتے تمغے دم بھر کے لئے دم سادھ لیتے ہیں، ایک قدم اس عورت کی طرف بڑھتا ہے۔

——— تم یہاں کی حاکم ہو؟

——— نہیں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔

——— میں فوج کا کمانڈر ہوں۔ اور میں نے تمہارے ملک کو فتح کر لیا ہے۔

ماں، آنسوؤں میں رچے اس پیار سے جو ماؤں کے دلوں سے نکل کر زبانوں پر آمڈ آتا ہے، مسکرا کے کہتی ہے۔

——— یہ ملک تمہارا ہی ہے میرے بیٹے۔

——— جھوٹ۔ تمہیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنا ہوں گے ——— ورنہ گولی ———

——— میں تمہاری ماں ہوں۔ اور یہ ملک تمہارا ———

وہ سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے۔

——— کمانڈر ہونے کی حیثیت سے مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اب یہ تمہارے ضمیر پر منحصر ہے کہ تمہارے لئے کون سا فرض متعین کرتا ہے۔

کمانڈر کے یہ الفاظ اس عورت کی اس روح، اس جذبے اس جرأت کو جھنجھوڑ دیتے ہیں، جس سے اس نے پہلے اپنے شوہر کو، پھر دو بیٹوں کو، پھر اپنے آخری نوجوان، خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والے بیٹے کو اس راہ پر روانہ کیا تھا۔ وہ چیختی ہے۔

——— غنڈے، بدمعاش، قاتل، غاصب ——— میں کبھی ہتھیار نہیں ڈالوں گی، میں تمہیں فنا کر کے۔

کمانڈر یک لخت آگے بڑھ کر اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ اور بڑے اطمینان سے اس عورت کو گود میں اٹھا کے اس راستے پر ڈال دیتا ہے جہاں دھول ابھی فضا میں معلق ہے۔ اس کے ساتھیوں کے ہتھیاروں کی نالیوں کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر اس عورت کا سینہ، نحیف و نزار، فاقہ زدہ سینہ جس پر کوئی تمغہ نہیں اور جس میں ایک دل فخر سے دھڑکتا سنائی دیتا ہے، پورے فخر سے پھول جاتا ہے۔

چند سیکنڈ بعد جب گولیوں کی آواز، دھواں اور بارود کی بو چھٹتی ہے تو کمانڈر یہ اطمینان کئے بغیر کہ وہ عورت ٹھیک سے مری بھی ہے یا نہیں اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے۔

ماں کی نظریں اپنے بیٹے سے ہٹ کر اس راہ کو تکتی ہیں جس پر اس کے جاتے بیٹے کے قدموں سے اٹھی دھول، ابھی تک نہیں بیٹھی۔

کارل چاپیک

ترجمہ:۔ محمد سلیم الرحمٰن

وہ بھی کیا دن تھے

تھیبس کا شہری، یوپاتور، جو ٹوکری ساز تھا، اپنے صحن میں بیٹھا ٹوکریاں بن رہا تھا کہ اس کا پڑوسی فیلاگورس لپکا ہوا آیا اور خاصی دور ہی سے شور مچانے لگا۔

"یوپاتور! یوپاتور! ٹوکریوں کا پنڈ چھوڑو اور میری سنو! بڑے ڈراؤنے واقعات پیش آ رہے ہیں۔"

"کس کے گھر کو آگ لگ گئی؟" یوپاتور نے پوچھا اور یوں لگا جیسے وہ بس کھڑا ہوا ہی چاہتا ہو۔

"جو کچھ ہو رہا ہے وہ آگ لگنے سے بھی بدتر ہے" فیلاگورس بولا۔ "پتہ ہے کیا ہوا؟ لوگ ہمارے جنرل نیکوماخوس پر مقدمہ چلانا چاہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے بقول وہ تھسالونیا والوں سے مل گیا تھا اور سازش کرنے کا مجرم ہے۔ بعضے اس پہ شورش پسندوں کی جماعت کے ساتھ ملی بھگت کا الزام لگا رہے ہیں۔ جلدی چلو۔ ہم لوگ بازار والے چوک میں جمع ہو رہے ہیں۔"

"اور میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" یوپاتور نے بے دلی سے پوچھا۔

"بلا کا اہم معاملہ ہے یہ" فیلاگورس بولا۔ "مقررین توجوق در جوق وہاں کبھی کے پہنچ بھی چکے۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ وہ مجرم ہے اور بعضے کہتے ہیں وہ بے گناہ ہے۔ چلو، ان کی باتیں سنیں۔"

"ایک منٹ رکو" یوپاتور نے کہا۔ "میں اتنے یہ ٹوکری پوری کر لوں۔ اور مجھے یہ تو بتاؤ کہ نیکوماخوس سے اصل میں جرم کیا سرزد ہوا ہے؟"

"یہ تو لوگوں کو ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں" اس کا پڑوسی بولا۔ "کوئی کچھ کہہ رہا ہے، کوئی کچھ۔ لیکن حکام نے ابھی کچھ نہیں کہا کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ اس بارے میں تحقیقات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ لیکن چوک میں خوب دھندمچی ہوئی تھی۔ کاش تم وہاں ہوتے۔ بعض لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے کہ نیکوماخوس بے گناہ ہے۔۔۔۔"

"ایک منٹ ٹھہرنا۔ اگر انہیں ٹھیک طرح یہی معلوم نہیں کہ اس نے کیا جرم کیا ہے تو وہ چیخ چیخ کر اس کی بے گناہی کا ڈھنڈورا کیسے پیٹ سکتے ہیں؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر شخص نے کچھ نہ کچھ سن رکھا ہے اور جو سنا ہے بس اسی کو دہرائے جا رہا ہے جو کچھ ہمارے سننے میں آئے اس پر بات کرنے کا حق تو ہم سب کو حاصل ہے، ہے کہ نہیں؟ میرے خیال میں نیکوماخوس یہ کوشش کر رہا تھا کہ دغا فریب سے کام لے کر ہمیں تھسالونیا والوں کے اڑنگے پر چڑھا دے۔ چوک میں یہ بات کسی نے کہی بھی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے کسی واقف کار نے ایک خط دیکھا ہے۔ لیکن ایک آدمی کا کہنا تھا کہ یہ نیکوماخوس کے خلاف سازش ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس بارے میں ایک دو باتیں اسے بھی پتہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ حکومت اس میں ملوث ہے۔ تم سن رہے ہو یوپاتور؟ اب سوال یہ ہے کہ۔۔۔۔"

"ایک منٹ ٹھہرنا" ٹوکری بننے والے نے کہا۔ "سوال اب یہ ہے کہ جو قانون ہم نے اپنے لئے بنائے ہیں وہ اچھے ہیں یا بُرے؟ کسی نے چوک میں اس بارے میں بھی کوئی بات کی؟"

"نہیں، لیکن اس پر کون بحث کر رہا ہے بھئی۔ زیرِ بحث تو نیکو ماخوس ہے۔"

"اور کیا کسی نے چوک میں یہ کہا کہ جو سرکاری افسر نیکو ماخوس سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں وہ بُرے اور نامنصف ہیں؟"

"نہیں، اس بارے میں تو بالکل کچھ نہیں کہا گیا۔"

"تو پھر کہا کیا گیا؟"

"ارے میں تمہیں بتا تو رہا ہوں۔ بحث یہ ہو رہی ہے کہ آیا نیکو ماخوس قصوروار ہے یا بے گناہ ہے۔"

"سنو، فیلاگورس، اگر تمہاری بیوی قصائی سے لڑ پڑے اور کہے کہ وہ آدھ سیر گوشت تولتے وقت ڈنڈی مار گیا ہے تو تم کیا کرو گے؟"

"بیوی کی حمایت کروں گا۔"

"نہیں جی۔ تم یہ دیکھو گے کہ قصائی کے پاس جو باٹ ہیں وہ ٹھیک ہیں۔"

"میاں، یہ مجھے پتہ ہے۔ تمہارے بتائے بغیر پتہ ہے۔"

"سمجھ گئے نا۔ اور پھر تم دیکھو گے کہ اس کی ترازو ٹھیک ہے یا نہیں۔"

"یوپاتور، یہ بات بھی کوئی کہنے کی ہے۔ مجھے پتہ ہے۔"

"شکر ہے۔ اور اگر باٹ اور ترازو درست پائے گئے تو تم گوشت تول کر دیکھ لوگے کہ آدھ سیر ہے یا نہیں اور تمہیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کون ہے، قصائی یا تمہاری بیوی۔ یہ عجیب معاملہ ہے، فیلاگورس، کہ لوگ جب اپنے لئے گوشت خریدنے جاتے ہیں تو زیادہ سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہیں مگر جب کوئی اہم امر درپیش ہوتا ہے تو عقل سے کام نہیں لیتے۔ نیکو ماخوس مجرم ہے یا بے گناہ ہے؟ ترازو درست ہو گی تو جھوٹ سچ کا آپ پتہ چل جائے گا۔ لیکن ترازو سے صحیح کام لینا مقصود ہے تو کسی طرف کے پلڑے کو پھونکیں مار مار کر ادھر ادھر نہ کیا جائے۔ کیوں جی، کیا تم یہ کہتے ہو کہ جو سرکاری افسر نیکو ماخوس پر مقدمہ چلا رہے ہیں ان کا چال چلن یا کچھ اور ٹھیک نہیں؟"

"یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا، یوپاتور۔"

"میں سمجھا تھا کہ تمہیں ان پر اعتبار نہیں۔ لیکن اگر تمہارے پاس ان پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تو پھر پلڑے کو پھونکیں کیوں مار رہے ہو؟ تم ایسا یا تو اس لئے کر رہے ہو کہ تمہیں سچائی کا پتہ چلانے سے متعلق کوئی دلچسپی نہیں یا صرف اس لئے کہ تم دو جماعتوں میں بٹ کر دنگا فساد کرنا چاہتے ہو۔ بھاڑ میں جاؤ تم لوگ! فیلاگورس مجھے نہیں معلوم کہ نیکو ماخوس مجرم ہے یا بے قصور ہے لیکن تم سب جس طرح انصاف کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کے جرم میں ملوث ہو اس کے لئے تم پر لاکھ لعنت۔ حیرت ہے کہ اس برس بید کتنا خراب آیا ہے۔ مڑنے کو تو تانت کی طرح مڑ جاتا ہے مگر ملائمت نام کو نہیں۔ ہمیں قدرے گرم موسم درکار ہے، فیلاگورس۔ مگر جو چیز دیوتاؤں کے بس میں ہو اس پر ہمارا کب زور چلتا ہے۔"

فہمیدہ ریاض

عورت اور چیتا

کوئی ایک پل، ایک گھڑی ایسی تھی جب عورت اکیلی ہو گئی۔ اپنی جان میں آپ اکیلی اور وہ لمحہ چیتے کے ہونے کے یقین کا اور چیتے کے ساتھ اپنی تنہائی کے سامنے کا کانپتا ہوا لمحہ تھا۔ تب اسے پتہ چلا تھا کہ وہ اپنی جان میں آپ اکیلی ہے یہ ایک سویرے کی بات ہے جب پچھلی رات اور پچھلے تمام دن گھل کر سیاہ سیال بن گئے تھے جب وہ اکیلی نہ تھی۔

اس دن بہت سویرے وہ پریشان ہو کر جاگی تھی جب ابھی کچا اجالا بھی نہ پھوٹا تھا اور وہ کلبلا کر اس طرح جاگی تھی کہ اپنی جاگ پر آپ حیران ہو کر دو پل سوچتی رہ گئی تھی۔ وہ جانے پہچانے کمرے میں جاگی تھی۔ جن کی دیواروں کو اس نے اپنا کر کے پہچانا تھا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ان کا گھر بنایا تھا اور رشتے ناطے جوڑ جوڑ کر ایک بچھونا سیا تھا۔ وہ رات بھر اس پر سوئی تھی اور سویرے جاگ کر اسی کو پہچانتی تھی۔ لیکن اس کی یہ جاگ اس طرح تھی جیسے اسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا ہو جیسے کسی دوسری جاگ نے اس کی نیند کا بُرا منایا ہو ــــ کوئی جھنجھلاتا ہوا اور بھڑک کر اسے اٹھا دے۔

کچی نیند میں اسے اپنا آپا یاد سا آیا۔ تب ہی پہلی بار عورت نے چیتے کی چمکتی انگارہ آنکھیں دیکھیں۔ وہ ٹھٹک کر پوری جاگ گئی۔ ایک جگ سے یہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ پرے پرے چھپتا چھپاتا۔ اس کے خون کی بو سونگھتا چلا آتا تھا۔ پر وہ یوں کبھی اس کے آمنے سامنے نہ بیٹھی تھی جیسی آج ــــ دھیرے دھیرے اندھیارے کی کالک اور ماند پیلے اجالے کی شطرنج سے اس کا ڈھیلا ڈھالا، سستاتا ہوا سا بھاری بھرکم جثہ ڈولتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے پالتو بلے کی طرح خُر خُراتا تھا جو بھرے پیٹ پر آرام سے ٹہل لگاتا ہو عورت سانس روکے سوکھے ہونٹ لئے ساکت بیٹھی تھی اور ہل بھی نہ سکتی تھی۔ چیتا اپنے بھاری انگ کو اس کے انگ سے مس کر کے خفیف سا دھکا دیتا ہوا گزرا اور جھومتا ہوا نکل سا گیا عورت کی آنکھیں پھیل گئیں۔

عورت نے گہرا سانس لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک کانپتا خوف اس کے اندر آزاد ہونے کو کلبلا رہا ہے جیسے اس نے سختی سے دبا رکھا تھا۔ کیا وہ ڈر رہی تھی ــــ؟ اس نے سوچا . . . . اور ہاں اور نہیں کے بیچ ڈولتی سہارے ڈھونڈنے لگی۔

وہ مشکل سے دیوار تھام کر اٹھی اور اپنے آپ کو تان کر سیدھا کھینچا ــــ سویرے کی ٹھنڈی

ہوا اس کے نتھنوں میں گھسی۔ اس نے لمبے سانس کھینچے ـــــ ارے! دنیا اتنے میں جاگ پڑی تھی اڑوس پڑوس کے گھروں سے اُبلتے دھوؤں اور توے پر پکتی روٹیوں کی سگندھ اٹھ رہی تھی سویرے کی بے وزن ہوا بھاری پڑنے لگی تھی۔

ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں جما جما کر دھرتی وہ آنگن میں نکل آئی۔ تب اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ وہیں کہیں اڑا کھڑا تھا۔ بیدرد ـــــ اسے دھکیلتا ہوا سا گزر گیا تھا ـــــ وہ ڈگمگا گئی تھی چیتے کی ہلکی سی دھینگل جھیلتی سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر وہ ایک ان سیکھی ہوشیاری سے پنجوں کے بل پھرتی سے چلتی آنگن کی دیوار تک آگئی۔ اس نے پڑوس کے گھر میں جھانکا جہاں اس کا میکہ تھا عورت نے اپنی ماں کو آواز دینی چاہی۔ لیکن پچھلی انگنائی میں ماں کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ شاید بوڑھی ماں ابھی تک سوتی تھی۔ آتے جاڑے کے دنوں میں اس کی ہڈیاں ابھی سے درد کرنے لگی تھیں۔ اب وہ سویرے کی ٹھنڈی ہوا سے بھی بچتی چادر لپیٹے اس وقت تک سوتی تھی۔ جب تک سورج کچھ گرما نہ جائے۔ اسے آنگن میں بھابی نظر آئی۔ شاید ابھی ابھی اٹھی تھی۔ ٹھنکتے لڑکے کو گود میں بھرے پیشاب کرانے لئے جا رہی تھی۔ اس کے اوندھے سیدھے قدموں میں ٹوٹتی نیند کا نشہ سا تھا۔

"بھابی ـــــ بھابی ـــــ!!"

عورت نے زور سے آواز دی۔ تب ہی اس کی ایڑیاں ٹھنڈے فرش پر آ ٹکیں اور آنکھیں بند سی ہو گئیں۔ اس نے چیتے کا پورا بوجھا اپنے ننھے تن پر محسوس کیا جو اس کو دیوار کے ساتھ اڑائے کھڑا تھا۔ وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ یکدم سے سارے سر میں پسینہ ہی پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ چیتے کا پورے کا پورا دیہہ جھیلے کھڑی تھی پر اس کے تیز نکیلے پنجوں کی پہلی خراش نے اسے گھرا دیا تھا سامنے چوکھٹ میں بھابی آن کر کھڑی تھی۔ شاید اس نے عورت کا آوازہ سن لیا تھا۔ پر اتنے پاس ہونے پر بھی بھابی کتنی دور تھی۔ وہ اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کو اپنے آپ میں تنہا کرنے والا چیتا چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ اور اس کے گھر کا آنگن اور آنگھن کی چوکھٹ میں کھڑی بھابی پرے پرے کھسکتے جا رہے تھے۔ اس نے کیوں نادانی میں چاہا تھا!!! بھابی آ جائے گی ـــــ شاید ماں بھی آ جائے تو . . . جیسے ایک موہوم آسرا سا تھا جو پورا آسرا ابھی نہ تھا۔

عورت کا خاوند کمرے سے آنگن کی طرف آ رہا تھا۔ چارخانے کی تہمند باندھے، بنیان پہنتا ہوا وہ پانی کے تیتڑے تک آیا اور نل کھول کر منہ پر چھپکے مارنے لگا۔ پل دو پل کو عورت کی آنکھوں میں ترمروں کی طرح اس کی پیٹھ کے ابھرتے بیٹھتے عضلے ناچے پھر اس کا آسرا ٹوٹنے لگا پر وہ آسرا توڑنا نہ چاہتی تھی۔ کیونکہ آسروں کے پرے ان دیکھا میدان تھا۔ ویرانہ تھا اور بھیانک گھبراہٹ تھی۔ ویرانے میں تنہائی تھی۔ اس میدان میں وہ اکیلی تھی اور اس کے خون اور گوشت سے کھیلنے والا چیتا تھا اور کوئی بھی نہ تھا۔ بس ایک سناٹا تھا اور چیتے کی خون جمانے والی گرم خرخراہٹ

تھی۔ وہ چیتے کے ساتھ اپنی تنہائی کی گھبراہٹ کو جھٹک دینا چاہتی تھی۔ اپنی جان میں آپ اکیلا رہ جانے کی فکر سے بدک رہی تھی۔ وہ سارے رشتے ناطوں کو دل ہی دل میں پکار رہی تھی من ہی من میں گڑگڑا سی رہی تھی۔ سارے والی وارثوں، مددگاروں کو بلا لینا چاہتی تھی۔ پر چیتا اس کے آس پاس گھومتا! اسے اکیلا کر رہا تھا۔

جب چیتے نے اسے چھوڑا تب ایک تیز طوفانی ہوا چیلوں کے غول کی طرح پھڑپھڑاتی گھر بھر میں گھومی اور تنکوں کی طرح سب کچھ اڑا لے گئی ـــــ گلیاں، چوبارے، مکان، حدِ نظر میں در آئے اور پھر وہ بھی کہاں تھے ـــــ؟ اچھا! تو اکیلا جیو ایسا ہوتا ہے؟ اس نے سوچا تھا ـــــ زمین اس کی کایا کو لئے چلی جاتی تھی ـــــ تارکول کی پکی سڑکوں سے گزرتی، دھول میں لوٹیں لگاتی۔ چٹانوں میں ابھرتی پھسلتی، سمندر کے نمکیلے پانیوں میں نہاتی ایک کیسے اندھیرے گھمس بھرے جنگل میں گھس پڑی تھی۔ اب یہاں آرام سے لیٹی اپنے ہزار انگ کھوے کالی کیچڑ کو سارے مساموں میں مزے مزے سے پڑی بھینچ رہی تھی۔ شاید ان گھڑیوں میں کروڑوں اکھوے اپنے ایچ پھاڑ کر پھوٹے ہوں گے۔ شاید اس گاڑھی کالی دلدل میں کروڑوں کلبلاتے جیو بے جان ہو کر دلدل میں پھر سے جان پڑنے کے لئے مٹی بنے ہوں گے چاروں اور ایک اٹوٹ چپ چھائی تھی۔ ایک گھڑی سے دوسری گھڑی تک گہرا سناٹا پھیلا تھا۔ جیون مرن کا سناٹا اور اس سناٹے کے اوپر چیتے کا بھاری خرخراہٹ بھرا سانس صاف سنائی دیتا تھا۔

گھنیرے پتوں سے پرے آسمان کب کا تپ کر گرم ہو چکا تھا۔ بیچ دوسری کی گرمی گھمس بن کر جنگل میں اتر آئی تھی۔ عورت کے پیروں تلے زمین گیلی چکنی مٹی بن گئی تھی پھر دلدل بن گئی تھی۔ جوہڑ کی کیچڑ جیسی نرم کنکنی گیلی مٹی۔ . . . . وہ پیر دھانستی! من من کے قدم اٹھاتی چل کھڑی ہوئی پر وہ بچ کر کہاں جا سکتی تھی۔ کالی پھسلواں دلدل پر احتیاط سے پاؤں جماتا، اس کے بدن سے اپنا بدن بھڑائے چیتا اس کے چاروں طرف گھومتا جا رہا تھا ـــــ وہ سمٹ رہی تھی ـــــ سکڑ رہی تھی اور رانوں تک کیچڑ میں دھنسی ٹانگیں اپنے تھکے گھرائے دھڑ سے کھینچتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔

اچانک چیتے نے اس کی کمر میں پنجے گاڑ دیئے۔ تیز خونی ناخن اس کے نرم کچے گوشت میں نیچے تک اتر گئے۔ عورت نے منہ اٹھا کر چیخ ماری اور چیخ کی بازگشت میں چیتے کے پنجوں میں اپنے چیتے ماس کو درد سے دھڑکتا محسوس کیا۔ پھر چیتے کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ دلدل میں دھنسی عورت ہانپ ہانپ کر ایک بار پھر بھاگنے کے لئے اپنا ایک ایک انگ گھسیٹنے لگی۔ دور ـــــ بہت دور کہیں چلے جانے کے لئے۔ ٹھنڈی کیچڑ سے دور ـــــ خشک زمین پر پھر سے پاؤں جمانے کیلئے اپنا سر بچانے کے لئے ـــــ وہ سانس روک کر کسمسا رہی تھی اور چیتے کی جھپٹ سے بچ رہی تھی۔ کالی کیچڑ کی بھاری گیلاہٹ اس کے ریشے ریشے میں جذب ہو کر ہڈیوں تک جا پہنچی تھی۔

اب سورج تپ کر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ایک بڑے نارنجی گولے کی طرح آسمان پر گھوم رہا تھا۔ پر جہاں تک آنکھ نہار سکتی تھی، وہی ویران اکیلی دلدل اب بھی پھیلی تھی۔ عورت نے پہر کاٹ لئے تھے اور پہر کاٹ رہی تھی۔ شاید دن ڈھل گیا تھا ــــ کوئی دیر جاتی ہے کہ رات کا بے ایمان، بے بھروسہ اندھیرا اسے آ لے گا۔ تب تک کیا ہوگا ــــ!!! اس کا دل خوف سے کانپا ــــ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھٹ پٹے میں دھندلاتی امن کی لکیر کو دیکھنے لگی۔ جیسے اسے آنکھوں سے تھام لینا چاہتی ہو۔ تب ہی اس کے منہ سے دوسری تیز چیخ نکلی اور اس کے زم دھڑکتے ماس میں گڑے چیتے کے دانتوں تک اتر گئی۔ وہ شدید درد سے دہری ہو گئی۔ کالی کیچڑ اس کے گرم گرم خون میں مل کر لال گاڑھا سیال بن گئی تھی۔ دو گھڑی تک عورت اپنے خون اور گوشت کے جوہڑ میں ڈوب کر ایسی گہری چپ کی پاتال میں رہی جہاں سانس کی بھی آواز نہ تھی۔

تب اس نے آنکھیں کھولیں اور چیتے کی چمکتی لال آنکھوں کو دیکھا اب وہاں اور کوئی نہ تھا اور رات کے جنگلوں میں تیز ہوائیں سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھیں ــــ "شاید یہ میری موت ہے" اس نے صاف صاف سوچا لیکن اب اور کوئی چارہ نہ تھا ــــ آسمان اور زمین کے بیچ میں وہ اکیلی تھی۔ اور اب کوئی چارہ نہ تھا۔ اپنی جان اور گوشت اور خون میں اکیلی اور ہونی نے اسے آ لیا تھا اور اب اس کا ایک ایک رونگٹا چوکنا ہو کر تنا ہوا تھا۔

وہ پہلی چھلانگ چیتے کی تھی یا عورت کی یا دونوں چھلانگیں گڈمڈ ہو کر ایک ہو گئیں تھیں۔ پر اس ایک پل میں عورت چیتے سے لپٹ پڑی تھی اندھیرا اگھل کر چھٹ گیا ایک تیز نارنجی روشنی بن کر خلاؤں میں گونجنے لگا۔ عورت دانت بھینچ کر اپنی پوری کایا کی اور اپنی کایا سے بھی پرے کسی شے کی ساری طاقت کے ساتھ چیتے سے گتھم گتھا ہوئی۔ وہ چیتے پر چڑھ بیٹھی تھی یا شاید چیتا اس کے پورے پنجر کو بھنبوڑتا ہوا اس کے اوپر چڑھا ہوا تھا وہ صرف یہ جانتی تھی کہ وہ اپنی پوری جان سے لڑ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ایک خونی چنگھاڑ پگھلے سیسے کی طرح بھر گئی اس نے اپنے زندہ گوشت کو پھٹتے ہوئے، چاک چاک ہوتے ہوئے محسوس کیا اور لال لال خون اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔ وہ جانور کی طرح منہ اٹھا کر چیخی اور پھر اپنی ساری جان لڑا کر تن میں آخری شکتی بھرنے والا اکھڑا سانس کھینچ کر ایک ایسی انوکھی طاقت سے جس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے ماس میں گڑے، اس کے چیتھڑے کرتے چیتے کے پنجوں اور دانتوں کو باہر دھکیل دیا ــــ

زوں ــــ زوں ــــ زوں ــــ نارنجی خلا گونج رہا تھا اور اندھا کر دینے والی تیز روشنی اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں میں بھری ہوئی تھی اب وہ پھٹ پڑی تھی مگر اس کی چیخ کی گھگی بندھ چکی تھی۔

تب اس گونجتے سناٹے میں جہاں عورت اپنی غیر انسانی مہیب آواز کے ساتھ

اکیلی تھی - ایک تیز باریک آواز اس کی نہ ختم ہونے والی چیخ کو کاٹتی ہوئی ابھری۔

غاؤں غاؤں ـــــ اُواں ـــــ اُواں ـــــ اُواں

عورت کی چیخ تھم گئی - اس نے عین اپنے سر پر جلتے بلب سے نظریں ہٹائیں اور گردن موڑ کر اپنے بچے کو دیکھا - لال لال گوشت کا لوتھڑا ایک دوسری عورت کے مشتاق، مہربان ہاتھوں میں کُل بلا کر رو رہا تھا۔

ان ہی لمحوں کے کسی ایک لمحے میں عورت کی آنکھیں مند گئیں تھیں ـــــ وہ ابھی سے سونے سی لگی تھی - اس نے نسوانی ہنسی سنی - باتوں کی آوازیں پاتال سے ابھرتی ہوئی زندہ ہونے لگیں - اس پر جھک کر ایک عورت نے کچھ کہا - کسی ہاتھ نے اس کے ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھ دیئے۔

وہ ایک گہری نیند میں جا رہی تھی - پر سو جانے سے پہلے اس نے ایک بار بچے کو اور دیکھا - جو اب بڑا مسکین بنا کونے میں بیٹھا دم ہلا ہلا کر پنجے چاٹ رہا تھا - بڑا سا جنگلی بلا جس کے پنجوں پر اس کا لال خون نہیں بلکہ سفید گاڑھا سیال تھا - جو نیند کی گہرائیوں میں میٹھا دودھ بن کر عورت کی چھاتیوں میں قطرہ قطرہ گرنے لگا ـــــ اور عورت پہر چڑھے تک گہری آرام دہ نیند سوتی رہی۔

مسعود اشعر

ایک بڑی کہانی کے لئے ورک نوٹس

۱۔ کمرہ پہلے ہی تنگ تھا اب ایڈگرایلین پو اُسے تخلیق کر رہا ہے۔ ونسنٹ پرائس اس میں بند ہے؟ میں شمال کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اپنے دونوں ہاتھ مشرق اور مغرب کی سمت پھیلا دیتا ہوں۔ میری انگلیاں دیواریں چھو رہی ہیں۔ بیچ کی انگلی، پھر شہادت کی انگلی، پھر چھنگلی اور پھر انگوٹھا۔ اب میں ہتھیلیوں سے دیواریں تھامے ہوئے ہوں ـــــ میں چھت کی طرف دیکھتا ہوں ـــــ میں لمبا ہوتا جا رہا ہوں یا چھت نیچی ہو رہی ہے! اوپر آسمان ہے۔ (اوپر آسمان ہے؟) پیروں کے نیچے سرسراہٹ سی ہے۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ دیواریں بھی کوئی کھرچ رہا ہے۔ ناخنوں سے پہلے کسکسی ہوتی ہے۔ دانتوں کے نیچے ریت آجاتی ہے پھر کسکسی بھی نہیں ہوتی۔

ایڈگرایلن پو۔ ونسنٹ پرائس یا پھر وہ چارلس لاٹن ہے؟

۲۔ راستے ہیں۔ بہت سے راستے ایک دوسرے کو کاٹتے۔ ایک دوسرے کے متوازی چلتے ـــــ سڑکیں ہیں کئی سڑکیں، سامنے سے آتی سڑک۔ پیچھے سے آگے جاتی سڑک، دائیں سے آتی سڑک۔ بائیں سے دائیں جانب جاتی سڑک۔ پھر ان کے درمیان، بیچوں بیچ سے نکلتی سڑک، بلکہ کئی سڑکیں، جو ہر دو سڑکوں کے درمیان سے نکلتی ہیں۔ سامنے سے آنے والی اور دائیں سے آنے والی کے درمیان بائیں والی اور سامنے والی کے بیچ۔ پھر پیچھے سے آنے والی اور دائیں والی کے اور بائیں والی اور پیچھے والی کے درمیان کتنی سڑکیں بن گئیں؟ شہر والوں کو ابھی یہ علم نہیں ہوا کہ سڑکیں اوپر نیچے بھی بنائی جاتی ہیں۔ جو کسی کو نہیں کاٹتیں اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

وہ سڑک سیدھی ہے۔ جس پر آدمی کھڑا ہے کہ وہ اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا ہے۔ ہر سڑک پر آدمی کھڑا ہے۔ ہر سڑک پر کھڑا آدمی ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہے۔

۳۔ ڈائریکٹ ٹرانسمیشن۔ میری ذات سے۔ تیری ذات سے، اس کی ذات سے۔ گرمیوں کا کھلا صاف آسمان اب میری ذات کو منہا کر دو۔

۴۔ بازار ہے۔ بھرا پڑا بازار۔ دوکانیں ہیں۔ چیزوں سے بھری ـــــ رنگ برنگی چیزوں سے۔ کھلونوں کی دوکان برتنوں کی دوکان۔ کپڑے کی دوکان۔ کھلونے چابی سے چلنے والے۔ بیٹری سے چلنے والے۔ بغیر چابی اور بغیر بیٹری کے چلنے والے۔ کپڑے۔ نئے پرانے۔ چھوٹے بڑے برتن۔ بے رنگ پانی ڈالو رنگین ہو جائے، رنگین پانی ڈالو۔ بے رنگ ۔ ۔ ۔ ۔ دواؤں کی دوکانیں ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ پوری قطار۔ آدمی کھڑا ہے۔

۵۔ آدمی دوڑ رہا ہے۔ پوری رفتار سے۔ اپنے حواس اور اعضا کی ساری قوت کے ساتھ۔ لوگ دوڑ رہے

ہیں۔ یہ دیکھنے کو کہ وہ کیوں دوڑ رہا ہے۔ اب آدمی دوڑ رہا ہے کہ لوگ دوڑ رہے ہیں۔

آدمی ٹھہر جاتا ہے۔ اچانک رک جاتا ہے۔ لوگ دوڑ رہے ہیں۔ اس سے آگے نکلے جا رہے ہیں۔ مگر وہ ٹھہر گیا ہے دوڑنے والے لوگوں کے دھکوں سے بچنے کے لئے وہ کھمبے کا سہارا لیتا ہے۔ وہ پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے پیچھے آنے والوں کے قد اس سے بھی زیادہ بلند ہو گئے ہیں۔ پیچھے صرف سر ہیں وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوتا ہے۔

مگر پنجوں کے بل کتنی دیر کھڑا ہوا جا سکتا ہے؟

بھاگتے ہوئے لوگ پلٹ پڑتے ہیں۔ کھمبے کی طرف۔

۶۔ "یہ پسند ہے آپ کو؟"

"اچھا تو یہ دیکھئے؟"

"یہ تو آپ پر بہت سج رہا ہے۔"

"ماشاءاللہ جیسے آپ کے لئے ہی بنایا گیا ہو۔"

"یہ بھی پسند نہیں؟"

"اچھا......!! مگر یہ تو وہی ہے جو آپ پہلے ہی پہنے ہوئے تھے؟"

۷۔ "ٹرانسپلانٹ ——!!

۸۔ جھٹ پٹے کا سماں ہے۔ سورج نکلتا ہے۔ مگر بہت اوپر۔ اس کی روشنی اوپر کی منزلوں میں کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں سے منعکس ہو کر نیچے آتی ہے۔ براہ راست دھوپ پڑنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سائے ہیں۔ چاروں طرف سائے۔ سہ پہر کے لمبے سائے۔ دھوکہ دیتے ہیں رات کا۔ اور لوگ سو جاتے ہیں۔

ٹمپریچر بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے اور اسی تیزی سے گھٹ جاتا ہے۔ ہوا تیز چلتی ہے۔ بہت تیز اور پھر مر جاتی ہے۔ ہوا بہت ہوتی ہے یا بالکل نہیں۔

سانس لینے کے لئے دوڑنا پڑتا ہے۔

۹۔ تاریخ کے یہ جوڑ ٹکڑے یہ منہدم عجائب۔ گھر کے ایک گوشے سے برآمد ہوئے۔

۱۰۔ کوئی باتیں کر رہا ہے۔ کان کے قریب منہ رکھ کر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ مگر وہ بول رہا ہے۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا ہے۔ میں کان کے پاس ہاتھ لے جا کر زور سے ہلاتا ہوں۔ مگر وہ چیں چیں جاری ہے۔ بات کرنے کے لئے کم سے کم آواز تو اچھی ہونا چاہیئے۔ وہ بول رہا ہے۔ بولے جا رہا ہے۔

اس آواز کی وجہ سے میں کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا۔ صرف آواز ہی سنائی دے رہی ہے۔ آواز ہی نظر آ رہی ہے۔

۱۱۔ کھلونوں کی دوکان خالی ہو گئی ہے۔ سارے کھلونے باہر آ گئے ہیں۔ سڑکوں پر، راستوں پر، سڑکوں کے درمیان درمیانی راستوں پر۔

۱۲۔ گدھے کو کشتی پر سوار کرانے کی ترکیب —— گدھے کو کھینچ کھانچ کر کشتی تک لے جانا چاہیئے۔ اس تختے کے اوپر جو کشتی میں سوار ہونے کے لئے راستے کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ گدھے کو کشتی کے قریب لے جا کر اس کا رخ

موڑ دینا چاہیئے۔ اس پر یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ اب کشتی سے باہر جا رہے ہیں۔ دوسری طرف گدھا پھر بھی الٹا ہی سمجھے گا۔ وہ مزاحمت کرے گا۔ پوری طاقت سے تختے پر پاؤں جمالے گا۔ وہ پچھلی ٹانگوں پر زور دے گا کہ اپنے آپ کو پیچھے کھینچے گا۔ آپ اپنی طرف زور لگائیں گے وہ اپنی طرف آپ اپنی طرف کھینچیں گے وہ اپنی طرف۔ جب آپ کو یقین ہو جائے کہ گدھا صرف پچھلی ٹانگوں کے سہارے ہی زور لگا رہا ہے تو یکدم رسّی چھوڑ دیجئے۔

گدھا کشتی کے اندر۔

یہ ہوئی گدھے کو کشتی میں سوار کرنے کی ترکیب۔

مگر گدھے کو کشتی سے اتارنے کی ترکیب؟

۱۳۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا ۔۔۔ تم سوال بہت کرتے ہو۔ ہمارا تمہارا ساتھ نہیں رہ سکتا۔

۱۴۔ رات ہے۔ تاریک، اندھیری، کالی رات، بارش ہے، بجلی ہے، طوفان ہے۔ ماں اور بچہ کمرے میں ہیں تنہا۔ کمرہ تاریک ہے۔ روشنی صرف اس بجلی کی ہے۔ جو باہر چمک رہی ہے اور پے در پے چمک رہی ہے۔ دروازے بج رہے ہیں۔ ہوا کے زور سے کھڑکی کے پٹ کھلے جا رہے ہیں۔ بچہ ماں کے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ماں نے دونوں بازوؤں میں اسے دبوچ رکھا ہے۔ بھینچ رکھا ہے۔ سینے کے ساتھ ماں خوف زدہ ہے۔ طوفان سے، تاریکی سے، تنہائی سے، دونوں بازو بچے پر ہیں، بچے کے سر پر ۔۔۔ اور آنکھیں کھڑکی کے شیشوں پر۔

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتا ہے۔ بجلی ہوا اور ٹوٹتے شیشے کی آواز کانوں کو پھاڑتی ہے۔ ماں کے منہ سے چیخ نہیں نکلتی اس کے بازو بچے کے سر اور چہرے پر اور بھی سخت ہو جاتے ہیں۔

شیشہ ٹوٹا۔ طوفان تھم گیا۔ بجلی کڑکنا بند ہو گئی۔ دروازے خاموش ہو گئے۔ اب صرف کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے آنے والی ہوا کی آواز ہے۔

ماں لمبا سانس لیتی ہے۔ جیسے وہ ایک زمانے سے سانس روکے بیٹھی تھی۔ بہت لمبا سانس۔

مگر ۔۔۔ بچے کی سانس رک چکی ہے۔

۱۵۔ لوگوں کو ایسی باتیں نہیں لکھنا چاہئیں۔

(ناول کا ایک باب)

مستنصر حسین تارڑ

درخت

کلہاڑے کا لشکتا پھل درخت کی چھال کو چیرتا ہوا سفید گودے میں کھب گیا یہ پہلی ضرب تھی۔
لکڑ ہارے نے ہتھیلیوں پر تھوکا اور دستے کو مضبوطی سے تھام کر اُسے درخت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا......... بازوؤں میں اتنی طاقت نہ تھی۔
اس نے آسمان کی جانب دیکھا جیسے غیبی مدد کا منتظر ہو اور پھر زور لگایا......... مگر ناکام رہا۔
تیسری مرتبہ اُس نے اپنی تمام ترکمینگیوں اور بداعمالیوں کو یاد کیا اور پھر دستے کو کھینچا لشکتا ہوا پھل باہر تو آ گیا مگر وہ کند ہو چکا تھا۔
لکڑ ہارے نے اس مرتبہ ہتھیلیوں پر تھوکنے کی بجائے نفرت سے دھرتی پر تھوکا اور دانت پیستے ہوئے کلہاڑا بلند کر دیا۔

ندی کے کنارے زمین کا ٹکڑا عرصہ سے بنجر پڑا تھا بے شمار قدیم درختوں سے گھرا ہوا مگر بنجر، وہ قدیم درخت ہمیشہ سے وہاں تھے، مگر حیرت کی بات تھی کہ ان کی جڑیں زمین کے اندر نہیں تھی۔ زمین کے اُوپر اُوپر پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ پرانے درخت اپنا محل وقوع بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ ہوا کے رخ کے ساتھ آہستہ آہستہ اُسی جانب کھسکتے رہتے ہیں جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوں تو کھسکنے میں کتنی آسانی رہتی ہے۔ جہاں بارش کا امکان ہوتا ان کی زبانوں کی لالچی شاخیں اُدھر کو پھیلنے لگتیں ان میں ایک دو درخت ایسے بھی تھے جو اپنے مقام پر جمے رہتے۔ ہوا کا ساتھ نہ دیتے مگر خوف کی بنا پر، پیرانہ سالی کی وجہ سے۔ سبھی درختوں کی ٹہنیاں عمر رسیدہ ہونے کے باعث ٹیڑھی ہو چکی تھیں پتوں میں بیماریوں نے سوراخ کر دیئے تھے اور ان سے کنارے مڑے مڑے سے تھے۔ ٹہنیوں پر حشرات الارض رینگتے رہتے۔ ان کے تنے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ چھاؤں بھی تھوڑی تھی۔ اگر کوئی مسافر ان کے سائے تلے بیٹھتا تو تھوڑی دیر بعد اپنے اُوپر گرنے والے کیڑے مکوڑوں اور بالوں پر پڑتے گھن کے برادے سے تنگ آ کر خود ہی چلا جاتا۔ مگر پھر بھی ان درختوں کو زعم تھا کہ وہی دراصل اسی خطے کو دھوپ اور بارشوں سے بچائے ہوئے ہیں۔ پھر اُن درختوں کے درمیان میں واقع اُس بنجر ٹکڑے میں سے ایک کونپل پھوٹی، دنوں میں ایک ننھے منے پودے میں بدل گئی۔ تب اس کی شناخت ہوئی۔ یہ پودا سفیدے کا تھا تمام لوگ جانتے تھے کہ یہ درخت تیزی سے بڑھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پودے جنگل پر حاوی ہو جاتا ہے اور اُس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی جاتی ہیں۔ اور اس کے تنے میں خوشبو ہوتی ہے اور وہ بے حد پُر وقار اور خوبصورت ہوتا ہے۔ بوڑھے درخت اس نووارد سے بے حد حسد کرتے تھے، اتنی تیزی سے نشو ونما پانا ان کے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا۔ اب لوگ جانتے ہیں کہ پودے کی چھاؤں اتنی

گھنی نہیں ہوتی مگر پھر بھی ندی کو پار کرنے والے مسافروں کی اکثریت اب اس کے سائے تلے آرام کرتی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کے جسم کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہتے اور دوسرے وہ اس کی خوشبو اور خوبصورتی کے جادو میں وہاں بیٹھے رہتے سفیدے کا درخت قدرے مغرور بھی تھا اور وہ اپنے حسن کے تکبر میں بعض اوقات مسافروں کی نفرت بھی مول لے لیتا مگر بعد میں وہ اسے معاف کر دیتے اب بوڑھے درخت دانت پیستے خاموش بیٹھے رہتے۔ کوئی بھی ان کے قریب نہ جاتا۔ پھر ندی میں سیلاب آیا اور درخت اپنی جگہ پر جما رہا مگر بیشتر پرانے درخت ٹوٹ پھوٹ گئے اب ان کے درمیان حسد کا رشتہ ٹوٹا اور نفرت اور ضد کا الاؤ بھڑکنے لگا۔

اسی دوران اُدھر سے اس کا گذر ہوا۔

اُس کے کاندھے پر ایک کلہاڑا تھا لٹکتے ہوئے پھل والا کلہاڑے کی دوسری ضرب سے درخت کے پتوں میں خفیف سی بے چین حرکت ہوئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے تنے پر وار ہوا ہے۔ جڑوں کو بھی خبر ہوئی کہ تا نہ ہو اسے رابطہ کٹ رہا ہے۔ اب سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔

"...... اس درخت کو مت کاٹو ......" لکڑ ہارے کے نوجوان معاون نے دستے پر ہاتھ جما کر درخواست کی "اس کی چھاؤں میں مسافر بیٹھتے ہیں۔"

"ہونہہ" لکڑ ہارے نے تکبر سے دھرتی پر تھوکا اور گردن اونچی کر کے سفیدے کی بلند ترین شاخوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کی نظر دُھندلا گئی اس کے پتے کھجور کی طرح زمین سے بہت دُور ہیں۔ ان کی چھاؤں چھدری اور ہلکی ہے۔ مسافر صرف اس کی خوبصورتی اور تنے سے نکلنے والی خوشبو سے مسحور ہو کر اُس کے نیچے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی شدت سے پہلے بھی سیاہ تھے اور اب بھی ہیں۔ اس درخت نے انہیں کیا دیا ہے ہاں دھوپ سے بچانے کا سراب دکھایا مگر بچایا نہیں۔ میں اسے کاٹ دوں گا۔

"بابا۔ کم از کم اس کی شاخوں میں سے کیڑے مکوڑے مسافروں پر تو نہیں گرتے۔ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ کم از کم یہ ان پر گر کر انہیں کچلے گا نہیں۔"

"میں اس کی جگہ نئے درخت لگاؤں گا۔"

مگر ہم لکڑ ہارے تو صرف درخت کاٹتے ہیں۔ لگاتے نہیں۔"

اس نے جواب دینے کی بجائے کلہاڑا بلند کیا اور "درخت" کے تنے میں اتار دیا ...... شام ہوگئی مگر درخت گرا نہیں۔

دوسری صبح ندی پار کرنے والے پہلے شخص نے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا تہمبند سر سے اتارا اور اُسے کمر کے گرد کس لیا بغل میں دبی جوتی نکال کر پہنی اور ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ "درخت" کے تنے میں ایک گہرا زخم تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی اس کے اندر رکھ دی۔ زخم گہرا تھا مگر وہاں خون نہ تھا صرف ٹھنڈک اور اطمینان تھا۔ اسے کون کاٹ رہا ہے؟ وہ منزل کی جانب روانہ ہونے کی بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ دوسرا شخص آیا تو پہلے شخص نے اُسے درخت کے گھاؤ کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی وہیں براجمان ہو گیا۔ جب لکڑ ہارا اپنے کلہاڑے کو ساری رات تیز کرنے کے بعد واپس آیا تو وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ شکستا پھل فضا میں اٹھا تو کسی ہاتھ نے دستے پر اپنا بوجھ ڈال دیا۔

"تم کون ہو ؟"

ہم مسافر ہیں۔ اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں........ اور تم ؟"

"میں لکڑہارا ہوں۔ اس درخت کو کاٹ کر اس جگہ نئے درخت لگانا چاہتا ہوں"۔

"مگر لکڑہارے صرف درخت کاٹتے ہیں لگاتے نہیں۔"

"تم دیکھ لوگے کہ یہ لکڑہارا درخت لگانا بھی ہے۔

"مگر اس عمل میں تو برسوں لگ جائیں گے ، تب تک ہم کہاں سستائیں گے ؟"

"گھنی چھاؤں کی امید میں چند برس انتظار بھی تو کیا جا سکتا ہے"۔

"ان چند برسوں میں ہم شاید نہ رہیں..... ہم تمہیں اسے کاٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

اس درخت اور میرے کلہاڑے کے درمیان جو شے حائل ہوتی ہے، کٹ جاتی ہے"۔ مسافروں کے ہاتھ خالی تھے، انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور لکڑہارا "درخت" پر وار کرنے لگا۔ بالآخر بلندی پر تالیاں بجاتے پتے اور زمین میں دُور تک اُتری ہوئی جڑوں کے درمیان صرف ایک رگ باقی رہ گئی۔

لکڑہارے نے دھرتی پر تھوکا اور اپنے کلہاڑے سے اُس رگ کو بھی کاٹ دیا۔

"درخت" ترچھا ہوا، دھرتی کا رُخ کیا اور گرنے لگا اور نیچا ہوا اور ہوا کے رخ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زمین کی جانب جھکتا چلا گیا....... اور پھر اُس کے گرنے کی آواز پورے جنگل میں چیختی ہوئی چھا گئی۔ مسافروں نے حیرت سے دیکھا (درخت دیکھنے میں اتنا بلند نہیں لگتا تھا مگر اب تو وہ جنگل کے اس سرے سے لے کر دوسرے سرے تک قدیم درختوں کو کچلتا ہوا اُن پر لیٹا تھا۔ مسافر اپنے مختلف ہاتھوں کے پیمانوں سے اس کی لمبائی ماپنے لگے (درخت کی بلندی صرف اس کے گرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے) اور پھر ماتم کرنے لگے، لکڑہارے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے آخری ضرب تو لگائی مگر اس کے بعد وہ کہاں گیا۔ کسی کو معلوم نہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اور ان میں لکڑہارے کا نوجوان معاون بھی شامل ہے کہ جب بلندی پر تالیاں بجاتے پتوں اور زمین میں دُور تک اُتری ہوئی جڑوں کے درمیان صرف ایک رگ باقی رہ گئی تو یکدم لکڑہارے کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ چلا گیا اور اب آہستہ آہستہ درخت کے گہرے زخم بھر رہے ہیں۔ کیونکہ جس وجود کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی ہوں زمین اُسے کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتی۔

اکرام اللہ

سیاہ آسمان

اندھیری سیڑھیاں پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کے چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا تو سانس بحال کرنے کے لیے دیوار کا سہارا لے کر رک گیا۔ اور میرا ہاتھ یونہی غیر ارادی طور پر سر کے ارد گرد کسے لوہے کے کڑے کو چھونے لگا۔ میں اسی بلڈنگ میں باقس کے فلیٹ پر پہلے ہزار مرتبہ آ چکا ہوں مگر پہلے نہ تو سیڑھیاں کبھی اتنی اندھیری پائیں اور نہ اس قدر لق و دق خالی۔ یوں ہوا کرتا تھا کہ یہی کوئی بیس پچیس سیڑھیاں چڑھے، ایک گیلری سی میں سے گزرے اور سامنے اس کے فلیٹ کا روشن دروازہ کھلا ہوتا تھا۔ آج اب تک اغلباً کوئی دو سو سیڑھیاں تو چڑھ چکا ہوں گا۔ مگر نہ وہ گیلری آئی نہ کہیں کوئی روشن دروازہ نظر پڑا۔ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے آباد فلیٹ ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آج نہ کوئی اوپر جا رہا ہے اور نہ نیچے آ رہا ہے۔ کیا یہ وہی بلڈنگ نہ ہے؟ بلڈنگ تو بہر حال وہی ہے۔ تو پھر اس کے باسی نقل مکانی کر کے کہیں چلے گئے ہوں گے۔ باقی باسی تو خیر فانی انسان ہیں کسی خطرے کی بو سونگھ کر بھاگ لیے ہوں گے۔ مگر باقس تو ایک دیوتک ہے، امر، ازلی، ابدی اُسے ان خطروں سے کیا خوف۔ وہ جب چاہے ایک لمحے میں سورگ نکل جائے اور جب چاہے اس لوک میں لوٹ آئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے فلیٹ تک جانے والی سیڑھیاں آج یک دم لمبی کھنچ گئی ہیں۔ جیسے ربڑ کا غبارہ پہلے تو محض ایک ذرا چھیچھڑا سا ہوتا ہے۔ جب کوئی بچہ اس میں ہوا بھرنا شروع کرتا ہے تو حیران کن حد تک لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان سیڑھیوں پہ ضرور کسی نے ایسا ہی کوئی عمل کیا ہے۔ اب وہ طفلِ نادان معمول کے مطابق دوہرا ہو ہو کر زور لگاتا ہوا اس میں اپنی گندی سانس ٹھونسا جائے گا۔ حتیٰ کہ غبارہ بھک سے اڑ جائے گا اور یہ سیڑھیاں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔ اس کے بعد انسان کبھی اوپر نہ جا سکیں گے۔ اور وہ طفلِ نادان اُداس چہرہ لیے گھر چل دے گا۔ میں اس اندھیرے اور تنہائی میں یوں کھڑا تھا۔۔۔ جیسے لحد میں پڑا مردہ بالکل تنہا اور حیرانی کی بات ہے کہ میں اسی کی طرح اپنی تنہائی سے بے خبر بھی تھا۔ وہ اپنے کفن میں مگن ہوتا ہے۔ میں اپنے اندھیرے میں مگن تھا۔ سانس قدرے درست ہوا تو پھر بازو پھیلا کر دونوں دیواروں کا سہارا لیتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کہاں گئی وہ منزل جہاں باقس رہتا تھا۔ روتی ہوتی وائلنوں اور آہیں بھرتی ہوئی گٹاروں کی آواز دور بہت دور اوپر کہیں سے آ رہی تھی۔ ان کی لے سے ہٹ کر ایک بہت بے ہنگم، بے تال دھم دھم کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ آوازیں سن کر مجھے ایک یقین تو ہو گیا کہ وہ کھلنڈرا ہمیں مدعو کر نا بسرا کر خود سورگ نہیں نکل گیا۔ اسے دعوت دینا یاد رہا ہے۔ اور وہ اسی بلڈنگ میں اپنے فلیٹ میں موجود ہمارا منتظر ہے۔ یہ اتنی بے ہنگم دھم دھم کی آواز کیا ہے؟ قدم ہو گا۔ نہیں اتنا بے تالا نہیں ہو سکتا۔ کیا باقس سرِ شام اتنا مدہوش ہو گیا کہ ناچنے بھی لگا؟ کیا اس نے مہمانوں کا انتظار

کیئے بغیر پینا شروع کر دیا ہوگا؟ خیر! پیتا تو وہ ہر وقت رہتا ہی ہے۔ لیکن کیا وہ باقس جس کے ناچ کے اثر سے بے سرے ساز خود بخود سر ہو جاتے ہیں۔ ناچ کے نام پر بے ہنگم طور پر کود رہا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ یہ کوئی اور ہی آواز ہے۔ جو یقیناً کسی اور جگہ سے آ رہی ہے۔ اس کا فلیٹ قطعاً ایسی غلیظ، ننگی اور فحش آواز کا منبع نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے۔ میرے سوا باقی سب جمع ہوں اور انہوں نے سوچا ہو کہ کیا پتہ وہ پہنچ بھی پاتا ہے یا نہیں اور زندگی نے اصرار کیا ہو کہ دیر مناسب نہیں رسومات شروع کر دو اور انہوں نے شروع کر دی ہوں۔ زندگی تو اپنی ہے وفائی میں ویسے بھی ضرب المثل ہے۔

دونوں طرف دیواریں میرے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور درمیان میں پڑی پیچ در پیچ سیڑھیاں اوپر ہی اوپر چلی جا رہی تھیں کہیں کسی رُخ ان سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تو چل ہی رہی تھی۔ مگر دفعتاً ایک تیز جھکڑ اندھیری سیڑھیوں میں شاں شاں کا شور کرتا یوں گزرنے لگا کہ میرے قدم اکھڑنے لگے اور بڑے کوٹ کے دونوں پٹ کسی اڑتے ہوتے بڑے پرندے کے پروں کی طرح ہوا میں تن گئے۔ ان سیڑھیوں میں کوئی اُڑ تھوڑا ہی سکتا ہے یہ جبلی طور پر تنتے ہیں اس لئے میں نے انہیں زور سے کھینچ کر اپنے کپکپاتے بدن کے اردگرد لپیٹتے ہوتے جلدی سے بٹن بند کر لئے۔ سردی جو پچھلے کئی مہینوں سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر اس جھکڑ نے چل کر تو گویا کرہ زمہریر میں پہنچا دیا۔ میں نے اپنے سر کے اردگرد کسے لوہے کے کڑے کو ہاتھ لگا کے دیکھا وہ اب بھی اتنا تنگ اور سرد تھا کہ میرے سر اور ماتھے کی کھال کے اندر گھسا جا رہا تھا۔ دھاتیں سردی سے سکڑ جاتی ہیں نا۔ اسی لئے شاید اور تنگ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں جب سے یہ ان دیکھی اور ان جانی سردی پڑنی شروع ہوئی تھی۔ ہر زن و مرد کے سر کے اردگرد خدا معلوم کیوں اور کیسے لوہے کے کڑے خود بخود کسے گئے جو روز بروز تنگ سے تنگ تر ہونے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کے سروں پر تو لوہے کے پورے پورے خود کس گئے ہیں اور نومولود تو خیر اب پیدا ہی خودوں سمیت ہوتے ہیں اگرچہ ابھی تک ان کڑوں کے سبب کوئی انسانی موت واقع نہیں ہوئی تاہم اطلاعات ملی ہیں کہ کئی لوگوں کے کڑے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ انہیں ہسپتالوں میں داخل کرانا پڑا ہے اور ان میں سے چند ایک کے کڑے تنگ ہوتے ہوتے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ اندیشہ ہے کہ کسی لمحے ان کی کھوپڑیاں تڑخ جائیں اور بھیجے باہر اُبل پڑیں۔ کوئی ڈاکٹر یا سائنس دان اس آفت کے اسباب و علاج ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر رہا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ کڑوں کے تنگ سے تنگ ہونے کی شکایت کرتے ہیں در اصل ان کی کھوپڑیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ ایک لاعلاج مرض ہے البتہ اس کے سدِباب کے طور پر فطرت نے خود راہ تلاش کر لی ہے اور بچوں کے سروں پر مکمل خود چڑھ گئے ہیں۔ آئندہ پندرہ بیس سال بعد انشاء اللہ کسی کو لوہے کے کڑوں کی تنگی کی شکایت نہ رہے گی۔ کیونکہ اس وقت تک ہر شکایت کرنے والے کا بھیجا تڑخی ہوئی کھوپڑی میں سے اُبل کر خارج ہو چکا ہوگا یہ تو حکماء کی رائے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مخلوقِ خدا اذیت میں مبتلا ہے۔

میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جب دوبارہ بے حال ہو گیا تو یہ جاننے کے لئے کہ میں ابھی فلیٹ سے کتنی دور ہوں، میں نے پوری توجہ سے کان لگا کر وائلنوں اور گٹاروں کی آواز سننے کی کوشش کی۔ آوازیں اتنی ہی مدہم تھیں جتنی پہلے، مگر اب خلافِ توقع نیچے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور وہ دھم دھم کی بے ہنگم

بے ہودہ آوازبھی ابھی تک آرہی تھی۔ اور وہ بھی نیچے سے ہی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ تو میں بہت اوپر نکل آیا۔ سیڑھیاں اترنے سے پہلے دم لینے کے لئے وہیں بیٹھ گیا۔ میں ان سیلی اندھی سیڑھیوں میں بہت دیر تک بیٹھا کپکپاتا سانس درست کرتا رہا۔ مجھے رنج آ رہا تھا کہ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے فلیٹ ہیں اور ان میں اتنی بڑی تعداد لوگوں کی رہتی ہے اگر یہ لوگ سیڑھیوں میں تھوڑی سی روشنی کا انتظام کریں تو کیا حرج کی بات ہے مگر وہاں تو کسی کھڑکی، روشن دان، دروازے کی دراڑ میں سے بھی روشنی نہیں آ رہی تھی۔

"تمہیں پتہ نہیں جب سے بڑے کیسے گئے ہیں۔ روشنیاں بند کر دی گئی ہیں۔ تم نے کسی سڑک، گلی کوچے میں روشنی دیکھی ہے؟ کسی مکان، دوکان میں روشنی دیکھی ہے؟"

غیر متوقع طور پر اپنے قریب یہ آواز سن کے میں گھبرا کے بولا "تم کون ہو!"

"نواب لوگوں میں آوازوں کی پہچان بھی جاتی رہی"

"جہاں اتنا کچھ گیا یہ بھی جاتی رہی ہوگی۔ مگر پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو!"

میرا نام مسعود تھا۔ اب میرا نام نامسعود ہے"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو!"

"جو تم کر رہے ہو"

"میں تو پچھلے کئی گھنٹوں سے باقس کے فلیٹ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ اس نے آج شام کے لئے مجھے بلایا تھا"

"میں بھی اسی کے فلیٹ کی تلاش میں ہوں، مجھے بھی اس نے بلایا تھا۔ شاید جسے ہم سیڑھیاں چڑھنا سمجھتے رہے ہیں وہ اصل میں سیڑھیاں اترنا تھا ہم نیچے کہیں تحت الثریٰ کے نزدیک ہیں۔ غور سے سنو! سازوں کی آہ و بکا کی آواز جو صرف باقس کے فلیٹ سے ہی آ سکتی ہے۔ کتنی بلندی سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ایک گندی دھمک کی آواز بھی چلی آرہی ہے۔"

میں نے کہا "نامسعود! تیرا خیال غلط ہے۔ یہ آوازیں بہت نیچے سے آ رہی ہیں"

ہم دونوں وہاں بیٹھے بہت دیر تک اسی بحث میں لگے رہے۔ بالآخر میں نے تھک کر کہا "یہاں اگر ایک ذرا روشنی کی ننھی سی کرن بھی ہوتی تو ہم اب تک وہاں ہوتے اور اس فضول بحث میں اُلجھنے کی نوبت ہی نہ آتی"

"روشنی" یہ کہتے ہوئے نامسعود ہنسا پھر کہا "ہم نے باہر سے بہت سا کالا پینٹ منگوایا ہے۔ اتنا بہت سا کہ اس کے اوپر پھیلے ہوئے پورے آسمان پر ہم اس کو تھوپ دیں گے پھر نہ دن کو سورج نکلا کرے گا۔ نہ راتوں میں چاند چمکے گا۔ نہ ستارے دمکیں گے۔ دن رات یہ شہر ان سیڑھیوں کی طرح اندھیرے میں ڈوبا رہے گا۔"

"نامسعود جو وقت ابھی نہیں آیا تو اس کے خیال سے مجھے کیوں ہراساں کرتا ہے"

" وقت ابھی نہیں آیا، کیا کہتا ہے۔ پیمنٹ پہنچ چکا ہے۔ ٹھیکہ دے دیا گیا ہے۔ کام شروع ہو...."

" اچھا یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر لمحے کی بھی تو کوئی قیمت ہوتی ہے۔ اس کو سمجھو۔ اب جب کہ وُہ آخری رہ گیا ہے تو اور بھی قیمتی ہو گیا ہے دل نہ مسوس، بس جلدی کر۔ باقس اگر ابھی زندہ ہے اور اس کا فلیٹ ڈھے نہیں گیا تو ہم آج اس کو تلاش کر کے رہیں گے "۔

اس کے بعد پتہ نہیں کتنی مرتبہ ہم دونوں ان سیڑھیوں کی لامتناہی لمبائیوں میں اُترتے چڑھتے رہے اس کا فلیٹ تو کیا ملنا تھا سیڑھیوں کا زمین پر پہنچنے والا سرا بھی غائب تھا، ہم نے پوری طاقت سے دیواروں کو دھکے دیئے اور وہ اتنی ہی طاقت سے ہمیں پیچھے اُچھال دیتیں۔ ہم نے لوہے کے کڑوں میں کسے ہوئے اپنے سروں کو ان سے پٹخا۔ نہ تو کوئی دیوار پھٹی اور نہ ہی سیڑھیوں نے ہمیں کوئی راہ دیا۔ ہمیں یقین سا ہو گیا کہ ہم دو چوہوں کی طرح دیواروں کے پنجرے میں دوڑتے دوڑتے تھک کر سیڑھیوں پر گر جائیں گے۔ اور مر جائیں گے۔ مگر بدستور بھاگم بھاگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے۔ اور ہمارے دم سینوں میں سما نہیں رہے تھے۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے نا مسعود کا بازو پکڑ لیا۔ ذرا رکو۔ آؤ ایک آخری کوشش کے طور پر دونوں مل کر پورے زور سے باقس کو پکارتے ہیں اگر اس نے ہماری آواز سن لی تو وہ آ کر راہ سجھاتے ہوئے ہمیں اپنے فلیٹ میں لے جائے گا۔"

[illegible] ہم دونوں نے اپنی پوری جانیں جمع کر کے آواز [illegible]

" باااقس س س "۔ تیز ہوا کی شاں شاں میں ہماری آواز عنتر بود ہو گئی۔ وقفے وقفے سے ہم نے دو تین بار اور پکارا، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہم پر مایوسی چھا گئی۔

اتنے میں چپ راست کی پُر ہیبت تحکمانہ آواز پر بہت بھاری بھر کم بوٹوں کی ایک تال میں رچی دھمک سے سیڑھیاں لرزنے لگیں۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، ہم خوف سے دبک کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے جب وہ مارچ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے ہمارے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے تو ہم دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے ایک جگہ جا کر "ہالٹ" کی آواز پر وہ سب رُک گئے۔ حکم دینے والے شخص نے آگے بڑھ کر دروازہ یوں پیٹا کہ ہم سمجھے کہ دروازہ تیلی تیلی ہو کر بکھر جائے گا۔ وُہ چنگھاڑا

"باقس دروازہ کھولو"

اندر سے باقس کی آواز آئی " تم کون ہو؟"

" ہم کوئی بھی ہوں۔ تم دروازہ کھولو۔ تم نے اندر روشنی کی ہوئی ہے "

" اندر کوئی روشنی نہیں۔ تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے "

" تم نے اندر زندگی چھپائی ہوئی ہے "

" یہاں کوئی زندگی نہیں "

" تمہارے کمرے سے سازوں کی سسکیاں سنی گئی ہیں "

" تمہیں بخوبی علم ہے کہ موسیقی کبھی کی مر چکی "

"تم دروازہ کھولو ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں میرے گھر کی تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں۔ یہ میری چار دیواری ہے اور اس میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کا اختیار نہیں۔"

"ہر خانہ خانۂ ماست کہ خانۂ خدائے ماست"۔ ہمیں تلاشی لینے کا پورا پورا حق اور اختیار ہے دروازہ کھول دو نہیں تو ہم اسے توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے۔"

"اگر تم دروازہ توڑو گے تو میں بندوق سے اس کی حفاظت کروں گا۔" پھر انہیں سناتے ہوئے بلند آواز سے اپنے ملازم کو آواز دی "مشرقی! اپنی بندوق لانا جو تو شرق میں چلایا کرتا تھا۔ اس لئے یہ باز نہیں آئیں گے۔"

مشرقی نے اسی طرح بلند آواز میں جواب دیا "یہ لیجئے بندوق۔"

اس پر میں نے اور نا مسعود نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ مشرقی اور باقس، دونوں کے پاس کوئی بندوق نہیں اگر انہوں نے دم نہ کھایا تو باقس مارا گیا۔

حکم دینے والے شخص نے کہا "باقس تو اچھا نہیں کر رہا۔ تجھے پچھتانا پڑے گا۔ کل ہم ڈائنا میٹ لے کر آئیں گے اور تیرے فلیٹ کو اڑا دیں گے پھر تجھے پتہ چلے گا۔"

"ٹھیک ہے لے آنا۔ تب بات کریں گے۔"

وہ شخص اپنے دستے کو اسی طرح پریڈ کرتا ہوا واپس لے گیا۔

میں نے پوچھا۔ "نا مسعود کیا اس پہ تیرا اکڑا ابھی کچھ ڈھیلا پڑا۔"

کہنے لگا۔ "ہاں کوئی ہوا بھر فراخی محسوس تو ہوئی ہے۔"

ہم نے جا کر آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باقس نے پردہ ہٹا کر ہمارے چہرے دیکھے اور دروازہ کھول دیا اندر واقعی روشنی تھی جو زندگی کی روتی ہوئی آنکھوں سے نکل نکل کر کمرے میں اُجالا کر رہی تھی اور کمرے کے وسط میں گھٹنوں تک کٹی ہوئی گلی ٹانگوں والی بھیتس نے ناچ کے نام پہ کود کود کر ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ اچھا تو وہ غلیظ اور مکروہ دھمک کی آواز اس کے ناچنے کی تھی۔ اس کی اگلی ٹانگیں کہاں گئیں؟ اوہ یاد آیا۔ نیچے جہاں سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں وہاں قصاب کی دوکان کی دیوار کی اوٹ میں ابلتے پانی کے ایک کنستر میں جو بھینس کی دو گھٹنوں تک کٹی ٹانگیں پڑی تھیں۔ وہ اس کی تھیں۔ اور انہیں وہاں اس لئے چھوڑ آئی تاکہ اس سردی میں ناچتے ناچتے کہیں شل نہ ہو جائیں۔ اب یہاں سے فارغ ہو کر جب جائے گی۔ تو نیچے پہنچ کر اپنی گرم گرم ٹانگیں اور پاؤں پہنے گی اور چل دے گی۔ مے سے بھرا خم کونے میں پڑا تھا۔ فقیرِ صحرا، صوفی سیاہ پوش، ستارۂ گل مستانہ زہرا اور حتیٰ کہ باقس بھی ہاتھوں میں خالی جام پکڑے دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے کٹی ٹانگوں والی بے تکی شاکودتی بھیتس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اسے روکنے سے قطعی قاصر تھے ہم بھی خالی جام ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں کی طرح دیوار کے ساتھ لگ کر اسے دیکھنے لگے۔ زندگی ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی اپنی آنسو بہاتی آنکھوں سے صرف چھت کو تکے جا رہی تھی۔ زندگی کو یوں زار و قطار روتے دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ باقس نے کہا "زندگی میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میرے بلانے پہ تو

آج شام یہاں آئی اور تیری تذلیل ہوئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح آنسو بہاتی رہی اور بھینس اسی طرح اودھم مچاتی رہی۔

نامسعود کہنے لگا "دوستو! اس بھینس کو تو کمرے سے نکالنے کی کوئی تدبیر کی ہوتی"

باقس نے جواب دیا، ہم سب تو اپنی سی کر چکے مگر یہ نہیں نکلتی۔ پہلے ڈنڈے مارے پھر آہیں بھرتی ہوئی موسیقی کو بند کیا۔ اس کے بعد دروازے میں کھڑے ہو کر چارہ دکھایا لیکن یہ کسی طور مانتی ہی نہیں۔ بس اسی طرح کودے جاتی ہے۔ اب تم آئے ہو کوئی چارہ کر کے دیکھو"

"باقس! تمہاری دیوتائی شکتی بھلا کس کام کی جو ایک اپاہج بھینس کو باہر نہیں نکال سکتی"

اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اقرار کیا "ہاں! میں تو صرف مے اور رقص کا دیوتا ہوں۔ بھینس میرے بس میں نہیں"

"مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے۔ اسے کتاب دکھا کر دیکھتے ہیں" یہ کہتے ہوئے نامسعود دوسرے کمرے میں دوڑتا ہوا گیا اور بہت سی کتابیں بازوؤں میں بھر کے لے آیا۔ اس نے کچھ ورق پھاڑ کر اس کے سامنے کئے تو وہ کودنا بھول کر نہایت رغبت سے انہیں کھانے لگی وہ اسی طرح ورق پھاڑ پھاڑ کر کھلاتا ہوا اسے کمرے سے باہر لے گیا پھر گھر کی ایک ایک کتاب لے جا کر ورق ورق کر کے سیڑھیوں میں نیچے تک پھیلا دی۔ وہ تیزی سے، اِدھر اُدھر منہ مارتی ورق ورق چرتی نیچے اتر گئی۔ "آں دفترِ را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد" حالانکہ اس قصے میں قصاب گاؤ سے پہلے نپٹ چکا تھا۔ ہم نامسعود کے بہت ممنون و مشکور تھے۔ اس پہ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے کہ آخر اس کی تدبیر کی بدولت سب کی اس بے ہودہ بھینس سے گلو خلاصی ہوئی

باقس نے خم کی طرف نظر بھر کے دیکھا اور آنِ واحد میں تمام خالی جام مے سے چھلک اٹھے۔ افسردہ اور مایوس چہروں پہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔ اس نے جام بلند کرتے ہوئے زندگی کی طرف دیکھ کر جوش سے کہا "بنام زندگی" وہ کونہ جہاں بھرپور جوان زندگی چھت کو تکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اب بھائیں بھائیں کرتا خالی پڑا تھا۔ ہم سب نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر زندگی کا کہیں کوئی سراغ نہ تھا۔ اگر نور جاموں سے منعکس نہ ہو رہا ہوتا تو پورا کمرہ تاریکی میں ڈوب چکا ہوتا۔ باقس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچا ہو گیا اور وہ اس شدید صدمے سے سنبھلنے کے لئے دیوار سے کمر لگا کر، خاموش گردن نیچی کئے کھڑا اپنے غم میں ڈوب گیا سب پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ "کچھ دیر کے بعد باقس سنبھلا اور کہا "جس کی خاطر یہ سب کیا دھرا تھا وہ تو چلی گئی۔ اب بولو دوستو"

فقیرِ صحرا نے کہا "باقس یوں لگتا ہے جیسے میری آتما کا انت مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پہ جا کر برف کا بن گیا ہو۔ وہاں سے نہ کبھی برف پگھل سکتی ہے اور نہ کبھی میری آتما کا انت واپس لوٹ سکتا ہے۔ تم جانتے ہو میں تو فانی ہوں۔ سورج کے سوا نیزے پہ آنے کا کہاں تک انتظار کر سکتا ہوں"

صوفی سیاہ پوش نے کہا "ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے جو اس کے اندر مرتے دم تک زندہ رہتا ہے اور یوں اس کے خمیر میں معصومیت اور حیرت کے عنصر کو قائم رکھتا ہے میرے اندر کا وہ

ننھا بچہ اب مرگیا ہے اور اس کا زہر اتنا پھیل چکا ہے کہ آہستہ آہستہ اپنی روح کے اندر سرایت کرتا محسوس ہو رہا ہے۔

مستانہ "زہرہ بولنے لگا تو اس کی آواز اس انداز میں نکل رہی تھی۔ جیسے کوئی عالم نزع میں بولنے کی کوشش کررہا ہو" میں تو سانس بھی کانوں کے راستے لیتا تھا۔ اب ان میں سیسہ بھر دیا گیا " ستارۂ گل نے کہا" سینکڑوں صدیوں کے حرف سے میں نے جو مسکرانے کا فن سیکھا تھا۔ وہ میرے ذہن سے اب قطعی ماؤف ہوگیا ہے۔ میں محض پتھر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہوں جو نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے۔ گلنار علم میرے ہاتھ سے گر کر کہیں صحراؤں کی ریت تلے دب گیا ہے اگر زندگی ہمیں سینکڑوں صدیاں پیچھے پھینک گئی ہے تو ہمیں واپس آنے میں چند صدیاں تو ضرور لگیں گی۔ اگر میں نہیں ہوں گا تو کیا ہوا۔ جب زندگی مہربان ہو گی تو کوئی اور آئے گا اور ریت میں سے میرا گلنار علم نکال کر پھر کندھے پہ رکھ کر آگے بڑھے گا "۔

باقس نے کہا" دوستو اپنے اپنے جام بنام زندگی خالی کرو اور پھر بھرو اور لنڈھاتے چلو۔ میں زندگی کو پہلے بھی کئی بار اپنے پرستاروں سے مایوس ہو کر روٹھ کر جاتے دیکھ چکا ہوں۔ ثابت قدم رہو۔ وہ واپس آئے گی اور ہم اس کی شان میں بہت بڑا جشن کریں گے۔ مجھے پتہ ہے۔ آسمان پہ تھوپے جانے والا سیاہ پینٹ آخر بکھر کر گر جائے گا۔ روشنی کے آگے بند باندھنے کی یہ اولین کوشش تو نہیں۔ پہلے بھی بہت لوگ کر چکے ہیں نور سے سیلاب کے آگے ہر رکاوٹ پر کاہ کی مثل بہہ جاتی ہے۔ تمہارے سروں کے گرد کسے ہوئے آہنی کڑے کوئی ہمیشہ قائم تو نہیں رکھ سکتا "۔

ہم سب یک زبان ہو کر پکارے " تب تک کیا کریں "

" بتایا جو ہے۔ جام روشن رکھو" اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

پتہ نہیں وہ باقس تھا کہ میوز تھی کہ دونوں تھے۔

محمد منشا یاد

رُکی ہوئی آوازیں

سب سے پہلے حمد اس رب کی جو معاف کر دینے والا اور بے حد مہربان ہے اور جو جانتا ہے سب کو
دلوں کے اندر اور باہر
اور جس سے چھپی ہوئی نہیں ہیں خباثتیں اور منافقتیں
فتنہ و فساد کرنے اور نفاق ڈالنے والوں کی
بے شک وہی بچانے والا ہے اپنے بندوں کو
بدی اور شر کے عفریتوں سے
اور دیوانے کتوں سے
اور آدمی آدمی جتنے بڑے بچھوؤں سے
جن کی سانسوں سے تعفن پھیلتا اور بادِ مشرق مسموم ہوتی ہے
اور وہی حکمرانی دیتا ہے زمین پر اور وارث بناتا ہے کمزوروں اور ناتوانوں کو جنہیں طبقات میں بانٹ کر
کمزور کر دیتے ہیں فرعون
بے شک وہی تعریف کے لائق ہے۔
اور وہی ناتواں کو توانائی بخشنے والا ہے
اس کے بعد سناتے ہیں تمہیں ایک قصہ
اس عجیب شخص کا
جو بیٹھا رہتا تھا دن رات
سامنے ایک بڑے مکان کے
اور دیکھتا رہتا تھا اس کو محبت کے ساتھ
اور سنتا تھا بہت اونچا
اور نہیں بول سکتا تھا ہرگز
کہ نہیں تھی اس میں بول سکنے کی قوت
اور کرتا تھا ساری بات اشاروں سے

پھر رو پڑتا تھا اپنی بے بسی پر۔ جب سمجھنے والا نہیں سمجھ سکتا تھا اس کی بات
یا نہیں سمجھنا چاہتا تھا جان بوجھ کر
عذاب ان کے لیئے ہے جو جانتے نہیں ہیں عذاب ان کے لئے ہے۔ جو جاننا چاہیں تو جان سکتے ہیں۔ مگر نہیں جاننا چاہتے اور نہیں جانتے اور عذاب ان کے لئے بھی ہے۔ جو جانتے ہیں۔ مگر نہیں مانتے اور وہ مصلحت کے کنوئیں سے باہر نکلنا چاہئیں تو نکل سکتے ہیں مگر وہ نہیں چاہتے اور نہیں نکلتے اور جب لٹکاتے ہیں مسافرانِ دستاریں ان کے لئے کہ وہ ان کو پکڑ کر باہر آجائیں تو وہ کھینچ لیتے ہیں۔ ہر دستار نیچے۔ پھر ٹھٹھا کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ عنقریب ان کے غلیظ بدنوں کی بدبو دور تک پھیل جائے گی۔ اور کوئی نہیں آئے گا ان کی مدد کو۔
سو وہ ٹھٹھا کرتے اس کی حرکتوں پر اور نہ ڈرتے اپنے رب سے اور کہتے کہ بنایا ہے انہیں رب نے بہتر اور مکمل اور دیا ہے حسن اور تندرستی اور مال کہ وہ اس کے حقدار تھے۔ مگر وہ جو نہیں جانتے تھے ایسا۔
ترس کھاتے تھے اس شخص پر
جو پڑا رہتا تھا ایک جھونپڑی میں دن رات
اور گھورتا رہتا تھا اس مکان کو
جس کو تعمیر کیا تھا اس کے بزرگوں نے
اور وہ تھے بڑے صبر والے اور محنت کرنے والے
سو وہ ڈھوتے رہتے اپنی پیٹھوں پر
اینٹیں اور روڑے اور گارا اور چونا
اور جو جو سامان تعمیر کا درکار ہوتا
اور نہ پرواہ کرتے وہ سورج کی تمازت کی جب ان کے سروں پر چمکتا
اور نہ ڈرتے وہ سن کر دینے والی ٹھنڈی ہواؤں سے
اور لگے رہتے کام میں روز و شب تاکہ بنائیں ایسا پختہ اور بڑا مکان
جس میں خوشی سے رہیں وہ
اور ان کے بچے
اور ان کے بچوں کے بچے
اور بچے رہیں موسم کی سختیوں اور تیز جھکڑوں سے
سو وہ بناتے رہے ایک عظیم مکان، پر شکوہ عمارت اور اٹھایا اسے پختہ اور گہری بنیادوں پر،
تاکہ قائم رہے صدیوں تک اور نہ ڈگمگائے اور گرے بارشوں اور طوفانوں میں
اور اس میں شگاف نہ پڑیں ژالہ باری سے
اور انہوں نے بنیادوں کو محکم کیا خون اور پسینے سے
تاکہ ٹیڑھی نہ ہو جائیں محرابیں، فصیلیں اور منڈیریں

جب زلزلے آئیں
اور گڑگڑاہٹ سنائی دے۔
سو وہ بناتے رہے ساری عمارت مطابق اس نقشے کے
جو ملا تھا انہیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں
اور نہ سنی انہوں نے حاسدوں کی بات جو کہتے تھے کہ عمارت نہیں ہے رہنے کے لائق،
اور عذاب ان کے لئے بھی ہے جو ہمہ وقت ٹوہ میں رہتے ہیں دوسروں کی کمزوریوں کی اور عیب جوئی کرتے ہیں
دن رات مگر نہیں دیکھتے اپنی طرف۔ اور کہتے ہیں۔ تندرستوں سے کہ وہ ہیں بیمار اور معذور اور ایسے لوگوں کیلئے
اللہ نے آگ بھڑکا رکھی ہے۔
اور عذاب ان کے لئے بھی ہے جو دیتے ہیں کورے کاغذوں کے تعویذ اور نہیں کرتے علاج — مگر دیتے
ہیں جھوٹی تسلیاں بیماری اور رنج سے نجات حاصل کرنے کی۔
مگر وہ رنجیدہ نہ ہوئے حاسدوں کی بات سے اور طعنوں سے
اور بنایا خوبصورت عالیشان مکان
سامنے اس بچے کی آنکھوں کے
جو بڑا ہو کر سسکیاں بھرتا تھا
اور مکان کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا
مگر وہ تھا بے بس اور ناتواں
اور وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے
پاس اپنے رب کے جو سب کا پالنے والا اور مارنے والا ہے۔
اور جسے چاہتا ہے اپنے پاس بلا لیتا ہے
سو اس نے بلا لیا اس کے باپ دادا کو باری باری
اور چھوڑ دیا بے آسرا اس کو — جس کی آنکھوں کے سامنے تعمیر کیا گیا تھا مکان
بے شک اللہ نہایت حکمتوں والا اور رازوں کا جاننے والا ہے۔
بس جب وہ رہ گیا اکیلا۔
تو اُسے لے لیا اپنی سپردگی میں
ان لوگوں نے
جو دعویٰ رکھتے تھے دوستی کا اور بھائی چارے کا۔
اس سے اور اس کے باپ دادا سے
اور وہ کہتے تھے کہ وہ پرورش کریں گے اس کی۔
اور نگہداشت رکھیں گے مکان کی۔
اور نہ لیں گے کوئی چیز عوض اس کے بدلے میں کے

اور دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دستبردار ہو جائیں گے ۔
اور چھوڑ دیں گے مکان
بعد بچے کی بلوغت کے
مگر وہ پھر گئے اپنے وعدوں سے
اور وہ تھے خود غرض

انہوں نے کھانے کو دیا بہت تھوڑا اور نہ بولنے دیا کسی بات پر اور منحرف ہو گئے ۔ ان وعدوں سے جو انہوں نے کئے تھے ان سے جواب قبروں میں لیٹے تھے گہری نیند ۔

اور عذاب ان کے لئے بھی ہے ۔ جو نہیں پہچانتے زندوں کو مگر پھول چڑھاتے ہیں ۔ قبروں پر اور یاد کر کے روتے ہیں ان کو جو اپنے وقت میں نہ پہچانے جانے کے صدمے سے مر گئے تھے ۔

سو انہوں نے روگردانی کی ان لفظوں سے جو انہوں نے ادا کئے تھے اپنی زبانوں سے ۔
اور کھاتے تھے یتیم کا مال
مگر نہیں بولنے دیتے تھے اسے ہرگز

اور سخت عذاب ہے ان کے لئے جو بے حرمتی کرتے ہیں ۔ معصوم لفظوں اور لذت کی سینوں میں پڑ دکھے ہو لفظوں کو بھونتے ہیں ۔ ہوس کے انگاروں پر اور بیچ دیتے ہیں ۔ خوشبو کو عوض پتھروں اور مردہ گوشت کے اور زیاں کرتے ہیں کاغذ کا اور سیاہی کا اور اپنی تحریر کی ہوئی سطروں کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں ۔ اور اللہ پسند نہیں کرتا سیاہی اور کاغذ کے زیاں کو کہ جس سے فروغ دیا جا سکتا تھا آسمانی کتابوں اور زمینی محبتوں کے قصوں کو

سو انہوں نے انحراف کیا ـــــ اور پھر گئے اپنے وعدوں اور لفظوں سے
اور دی اسے ایک روٹی
جسے لگی تھی سخت بھوک تین روٹیوں کی
اور وہ دبلا ہوتا چلا گیا
اور کہاں سے آتی اس میں قوت اور سکت
احتجاج کرنے کی
اور اپنا حق مانگنے کی
اور وہ شخص بھول گیا بولنا
اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کس طرح کرتے ہیں کلام
مگر اللہ جانتا ہے دلوں کے بھید
آخر چلے گئے وہ لوگ ۔
بعد کئی برسوں کے چھوڑ کر مکان
مگر وصول کر لی انہوں نے پگڑی
اور ظاہر کرتے تھے خود کو اصل وارث

حالانکہ نہیں تھے وہ اصل وارث
اور وہ بھول نہیں سکتا تھا کہ اسے نہیں سکھایا گیا تھا بولنا
نہ اجازت دی گئی تھی اس کی
اور وہ رہ گیا نئے مالکوں کے درمیان
اور وہ اسے ڈال دیتے تھوڑا سا کھانا علیحدہ برتن میں
اس کی بھوک کا ایک چوتھائی
اور وہ کھا لیتا اکثر چرا کر
راتب نجس چوپائے کا
اور چن لیتا مرغیوں کے آگے سے دانہ دنکا
اور پی لیتا بہت سا ٹھنڈا یا گرم پانی
اور کمی پوری کر لیتا خوراک کی۔تا کہ زندہ رہے اور دیکھتا رہے اس عمارت کو جو اس کے باپ دادا نے بنائی تھی۔
اور سناتے ہیں تمہیں قصہ اس عمارت کا
جو بنائی گئی تھی بڑی عالیشان
دو منزلہ
اور جس کا اصل وارث اُسے حسرت سے تکتا رہتا تھا
پھر چلے گئے وہ لوگ بھی
اور لے گئے ساتھ اکھاڑ کر
مکان کی اوپر والی منزل
اور نیلام کیا بہت سا ملبہ
مگر وہ بول نہیں سکتا تھا اور نہ کر سکتا تھا کلام
اور نہ ہی اس میں جھگڑا کرنے کی سکت تھی
سو وہ دیکھتا رہا پاس کھڑا
اور روتا رہا اندر ہی اندر
اور خرید لیا باقی کا حصہ دوسرے لوگوں نے جو کم ظالم تھے اگلوں سے
سو انہوں نے نکال باہر کیا اسے
مگر دے دیتے تھے وہ بھی ایک روٹی
بجائے تین کے
پیاز کی گٹھلی کے ساتھ
مگر نہیں کرتا وہ شکوہ کسی سے
اور بے شک وہ کر نہیں سکتا تھا اگر چاہتا بھی

مگر وہ رو سکتا تھا
اور روتا تھا۔ دیکھ دیکھ کر اکھڑی ہوئی اینٹوں کو
اور ٹوٹی ہوئی منڈیروں کو
اور وہ دیکھ بھال اور مرمت نہیں کرتے تھے مکان کی
اور نہ تھی انہیں کچھ محبت اس سے
پھر چھوڑ دیا اس نے کھانا اور پینا
اور پھینک دیتا باسی روٹی کوڑے پر
اور پیاز کی گٹھی کو ٹھوکر مارتا پاؤں سے کہ دور جا پڑے اس سے
اور بھر لیتا پیٹ اُڑنے والے پرندوں کے شکار سے
اور اللہ نے وافر کیا اس کے لئے شکار درختوں پر اور جھاڑیوں میں
اور مل جاتے نہایت لذیذ پھل۔ اور وہ نکال لیتا اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ جب اسے بھوک لگتی۔
اور دردناک عذاب ہے ان کے لئے۔ جو بیٹھ جاتے ہیں۔ راستوں میں گھنی چھاؤں دیکھ کر اور راستہ نہیں دیتے چلنے والوں کو۔
پھر جب وہ نکال لیتے ہیں نیا راستہ تو حسد کرتے اور بُرا بھلا کہتے ہیں۔ چلنے والوں کو —— اور نہیں جانتے کہ عنقریب ان کے غلیظ بدنوں کی بدبو دور تک پھیل جائے گی۔
سو وہ نکال لیتا کوئی راستہ —— پیٹ بھرنے کا
اور بحال ہونے لگیں اس کی تمام قوتیں
اور وہ سننے لگا
آہٹیں اور آوازیں
اور پرندوں کا شور
اور بادل کے گرجنے کی آواز
اور جمع ہونے لگیں اس کے اندر آوازیں
اور برسوں کی رکی ہوئی باتیں
اور مچلنے لگے غصے اور جوش کے جذبات
اور پھٹنے لگا اس کا سینہ
رکی ہوئی باتوں آوازوں کے شور سے
اور سنا دیا ہم نے تمہیں ایک دلچسپ قصہ۔ اس شخص کا
جو ایک روز بادل کی طرح گرجے گا۔ اور لرز جائیں گے
وہ سب، اس کی آواز سن کر
جس میں برسوں کی رکی ہوئی چنگھاڑ ہو گی

منظر الاسلام

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

ایک شخص کی کہانی جس کی آواز چوری ہو گئی تھی، ہو سکتا ہے یہ ہر شخص کی کہانی ہو، ذرا بول کر تو دیکھئے۔ کیا آپ کو اپنی آواز سُنائی دیتی ہے۔

اس وقت چڑیا اناج گھر کے روشن دان میں بیٹھی ہے۔ بادشاہ سو رہا ہے۔ بڑھیا اونگھتی ہے۔ میری زبان غصے کے عالم میں بار بار ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر بڑے بڑے لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔ میری بیوی کی آنکھوں میں اب آنسو تیرنے لگے ہیں۔ اور وہ بار بار پوچھتی ہے۔ "تمہاری آواز کہاں ہے۔؟ جاؤ خدا کے لیے اپنی آواز ڈھونڈ کر لاؤ"۔ پھر کہتی ہے۔ "کہیں تم اپنی آواز دفتر تو نہیں بھول آئے؟" لیکن مَیں تو کبھی اپنی خالی ماچس بھی کہیں بھول کر نہیں آیا۔ تو بھلا آواز کیسے بھول کر آ سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے بھول ہو ہی گئی ہو۔ سوچ کی زبان تلے شک آ جاتا ہے تو مَیں بے چینی اور گھبراہٹ کے عالم میں دفتر کی طرف چل پڑتا ہوں۔

شام گندے نالے پر بیٹھی پاگل عورت کی مینڈھیاں کر رہی ہے۔ اداسی بچوں کے ساتھ "پٹھو گرم" کھیلتی ہے۔ میری گردن کولہو کے بیل کی طرح چپ کے پٹے کے اندر گھوم رہی ہے۔ اور زبان پاؤں بندھی مرغی کی طرح تڑپ تڑپ کر اب پہلو کے بل پڑی ہے۔ آواز خوش رنگ ربن باندھے ننھی بچیوں کے ساتھ مل کر میری آنکھوں کی پتلیوں پر ناچ رہی، کھیلتی ہے۔ "چڑیا اناج گھر میں اتری۔ دانہ اٹھایا" چپ نے۔ بڑھیا پھر اونگھنے لگی ہے۔

چوکیدار چابیوں کا گچھا درمیانی انگلی میں پھنسائے گیٹ کے قریب کھڑے کتورے کو پچ پچ کر رہا ہے اور کتورا پچ پچ کے ردھم پر ہلتی دم سے سنگت کر رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی آدھی پچ چوکیدار کے منہ میں رہ جاتی ہے وہ تھوک نگل کر پوچھتا ہے۔

"اس وقت؟"

مَیں ہاں میں سر ہلاتا ہوں۔ وہ میرے کمرے کا دروازہ کھولتا ہے۔ مَیں لپک کر اپنی آواز تلاش کرنے لگا ہوں۔ میز کا جائزہ لینے کے بعد مَیں نے تینوں دراز دیکھے۔ ایش ٹرے کی تلاشی لی۔ سیاہی کی دوات میں جھانکا۔ اور ٹرے میں پڑے کاغذ ایک ایک کر دیئے۔ میری آواز وہاں کہیں نہیں تھی۔ پھر مَیں نے ساری فائلیں الماری سے نکالیں اور انہیں میز پر پھیلا کر چیک کرنے لگا۔ میری آواز ان میں بھی نہیں تھی۔ البتہ کچھ فائلوں کے اندر بعض کاغذوں پر میری آواز کی سسکیاں چپکی ہوئی تھیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر بڑے بڑے لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔

قریب ہی چوکیدار میری خاموشی کے کنڈے پر لٹک رہا ہے۔ بچ اس کے تالو سے چپکی ہوئی ہے۔ اور مَیں ڈکشنری کے لفظوں میں منہ ڈال کر اپنی آواز ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے کہ صبح بڑے صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ ہو سکتا ہے مَیں اپنی آواز ان کے کمرے میں بھول آیا ہوں۔ لیکن اس وقت صاحب کا کمرہ کھولنے کی اجازت کسے ہے؟ آواز ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہیں نوکری بھی نہ جاتی رہے۔

بادشاہ نے کروٹ بدلی ہے۔ بڑھیا نے نیند سے بوجھل سر اٹھایا ہے۔ اور کہتی ہے۔" چڑیا نے گندم کا دانہ اٹھایا اور روشندان کے راستے، اڑ کر باہر چلی گئی"۔ چپ ــــ بادشاہ کے خراٹے کی آواز نے بڑھیا کی آواز کو یوں دبوچ لیا ہے جیسے بگلا پانی میں مچھلی دبوچ لیتا ہے۔ بڑھیا پھر اونگھنے لگی ہے۔ اور مَیں بس سٹاپ پر پہنچ کر آتی جاتی بسوں میں اپنی آواز تلاش کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی جس بس نے بس سٹاپ چھوڑا ہے۔ اس کا ہارن سن کر مَیں بس کی طرف دوڑا تھا۔ کرشاید میری آواز ہارن کی مٹھی میں ہو لیکن ہارن کی مٹھیاں خالی تھیں۔ اور انگلیاں موبل آئل کی لکیروں سے بندھی ہوئی تھیں۔ مَیں نے بے شمار بسیں دیکھیں۔ پٹرول کی ٹینکیوں اور ٹول بکسوں میں جھانکا۔ لیکن میری آواز کا پتہ نہیں چل سکا۔

اب مَیں اخبار کے دفتر میں اشتہار دیتے پہنچا ہوں۔ ایڈیٹر نے اشتہار پڑھ کر مجھے واپس کر دیا ہے۔ اور کہتا ہے۔ ہمارے پاس بہت سے سرکاری اشتہارات ہیں۔ اس اشتہار کے لیے جگہ نہیں۔ ویسے بھی ہم نے ایسے اشتہار چھاپنے بند کر دیے ہیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔

مَیں سیدھا فریم کرنے والے کی دکان پر پہنچتا ہوں۔ اور اشتہار والی تحریر فریم کروا کے گلے میں لٹکا دیتا ہوں۔

"میری آواز چوری ہو گئی ہے۔ اگر آپ کے پاس ہو یا آپ نے کسی کے پاس دیکھی ہو تو میری مدد کریں۔ مَیں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اور حسبِ توفیق خدمت بھی کروں گا"۔

کچھ لوگ میری گردن میں لٹکی ہوئی اس تحریر کو پڑھ کر ہنستے ہیں اور کچھ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگتے ہیں جیسے انہیں کوئی بھولی ہوئی چیز یا بات یاد آ گئی ہو۔ اب مَیں ایک جیب کترے کے گھر بیٹھا التجا کر درخواست کر رہا ہوں۔ اگر اس نے میری آواز کاٹ لی ہے۔ یا اسے کسی کی کاٹی ہوئی جیب سے میری آواز ملی تو واپس کر دے۔ لیکن وہ کہتا ہے۔" مَیں جیب کاٹتا ہوں آواز نہیں"۔ پھر وہ چپ ہو جاتا ہے اور لمحے بھر کی خاموشی کے بعد کہتا ہے۔" مَیں اتنا ظالم نہیں"۔

بادشاہ نے آنکھیں کھولی ہیں۔ بڑھیا ٹوٹی ہوئی کہانی جوڑتی ہے۔" چڑیا آئی۔ روشندان پر بیٹھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ دو تین بار پھدکی اور اناج گھر کے اندر اتر گئی۔ اب چڑیا اناج گھر میں ہے۔ اور مَیں کھلے بازار کے تنگ موڑ پر بیٹھا

سکول سے آنے والے بچوں کے بستے کھول کھول کر اپنی آواز ڈھونڈ رہا ہوں۔ بچوں کے قاعدوں میں بڑھیا کی آواز ہے۔ "چڑیا نے دانہ اٹھایا۔ اڑی — روشندان پر بیٹھی —" بچہ پوچھتا ہے۔ "یہ کس کی آواز ہے۔" مجھے تو پتہ بھی نہیں۔ شاید میری امی نے کسی مائی کی آواز میرے قاعدے میں رکھ دی ہے۔" میں بچے کو بتاتا ہوں کہ یہ آواز تمہاری دادی کی پردادی اور پردادی کی لکڑدادی کی ہے۔ جو اسی پرانی کہانی میں پروئی ہوئی ہے جس کی فرمائش بادشاہ کے بادشاہ کے بادشاہ نے کی تھی۔ جب چڑیا کی یہ کہانی شروع ہوئی تو اس سے پہلے بادشاہ نے بہت سے لوگوں کو مروا دیا تھا۔ کہ ان کی کہانیاں پہر۔ دوپہر۔ آٹھ پہر سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ لیکن یہ بڑھیا لمبی کہانی کی شرط پوری کر رہی ہے۔ اسی لیے اس کی جان بچی ہوئی ہے۔ بادشاہ نے بڑھیا کی آواز اپنے تکیے کے نیچے چھپا رکھی ہے۔ جونہی وہ کروٹ بدلتا ہے۔ بڑھیا آواز نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر آدھی آواز نکلتی ہے کہ بادشاہ پھر سر تکیے پہ جما لیتا ہے۔

اب بادشاہ سو رہا ہے۔ بڑھیا اونگھتی ہے۔ چڑیا اناج گھر کے روشندان پر بیٹھی ہے۔ مجھے اپنی آواز کے رونے کی آواز آتی ہے۔ وہ ماں باپ سے بچھڑے ہوتے بچے کی طرح رو رہی ہے۔ اس کی سسکیاں بچوں کے بستوں میں قلموں اور پنسلوں کی طرح دبکی ہوئی ہیں۔ میں اسے کب سے بچوں کی کتابوں میں تلاش کر رہا ہوں ان کی کتابوں کے نقطے جھڑ رہے ہیں۔ کچھ بچوں کی آوازوں پر مکھیاں بھنبھنانے لگی ہیں۔ ریڑھی والے کی آواز چوہوں نے کتر لی ہے۔ موچی کی آواز جوتے کی سلائی میں آگئی ہے۔ ڈاکیے کی آواز نامکمل پتے والے خط کے ساتھ تقسیم ہو گئی ہے۔ نالی کے کنارے کسی نامعلوم آواز کو چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ جیسے روٹی کے ٹکڑے سے چمٹتی ہیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔

میں بھینسوں، گھوڑوں اور گدھوں کے چارے میں ہاتھ مار مار کر اپنی آواز ڈھونڈ رہا ہوں کہ ... گدھوں کے کھر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ جن کے نیچے میری آواز کی سسکیاں چپکی ہوئی ہیں۔ چھابڑی ... ے کی آواز ابھرتی ہے۔ مگر آدھے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ "پھلیاں۔ چھوہے۔ گرگرگر۔" زمین پر گری ہو ... می آواز پہ سے تیز رفتار گاڑی گزر گئی ہے

بادشاہ نے کروٹ بدلی ہے۔ بڑھیا نے جلدی سے تکیے ... ے کے نیچے سے اپنی آواز سرکانے کی کوشش کی ہے "چڑیا اناج گھر میں اتری۔ گندم کا دانہ اٹھایا —" ... بادشاہ نے پھر تکیے پر اپنا سر جما لیا ہے۔ بڑھیا کی ساری آواز تکیے کے نیچے آگئی ہے۔ میں اونگھنے لگا ہوں۔ خوا ... بی خواہش نے مٹھی کھول کر نیند کی تتلی کو اڑا دیا ہے۔ میں عین چوک پر بیٹھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ایک آ ... ار لومڑی پر سوار ہو کر مجھ سے میری آواز کے گم ہو جانے کا افسوس کرنے آئی ہے۔ وہ ابھی یہیں ہے ... ہ ایک اور آواز افسوس کی غرض سے آ جاتی ہے۔ وہ دونوں مل کر میری آواز کی باتیں کرتی ہیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر نقنے ہنہناتے ہیں مگر آواز نہیں آتی۔

خواب ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ اور میں اپنی آواز تلاش کرتے کرتے مسجد میں آگیا ہوں۔ کوزوں میں جھانکنے کے بعد اب میں مصلّوں کے نیچے دیکھ رہا ہوں۔ امام مسجد میرے گلے میں لٹکی ہوئی تحریر پڑھ کر کہتا ہے۔ نماز پڑھو۔ اس

کے لیے آواز کی ضرورت نہیں۔ اس کے جڑے سے میری آواز کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی کو میری آواز کہیں سے ملی ہو اور اس نے مسجد کے امام کے پاس جمع کرا دی۔ مگر امام مسجد نے میرے خیال پر لاحول ولا قوۃ کی مہر لگا دی۔ میں مسجد سے باہر آ گیا ہوں۔ اب بادشاہ نے آنکھ کھولی ہے تھوڑا سا سر اٹھا کر پھر تکیے پر رکھ دیا ہے۔ بڑھیا کہتی ہے "چڑیا نے گندم کا دانہ اٹھایا اور پھر سے اڑ گئی"۔ بادشاہ کی آنکھ بوجھل ہونے لگی ہے۔ بڑھیا کی آنکھ دریا کے پل کے نیچے گرداب میں پھنس گئی ہے۔ بڑھیا نے دریا کا سارا پانی اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر دانہ چگتی چڑیا آدمی پانی میں ڈوب گئی ہے۔ میری پیاسی زبان پانی کے گلاس میں لٹکی ہوئی ہے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی لمبی چپ کی کھائی میں کود پڑتی ہے۔ لفظ آوازیں مانگتے ہیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔

میرے کان گلے کے اندر آ گئے ہیں اور لفظوں کو پھانسی لگنے کا منظر دیکھتے ہیں۔ لفظوں نے احتجاج کے لیے میرے جسم پر جلوس نکالا ہے، اور اب چھوٹے بڑے لفظ قطار اندر قطار، ترتیب بے ترتیب میرے جسم کی سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ اور میری آواز کی بازیابی کے لیے مجھ پر پتھراؤ کرتے ہیں اب میری آنکھیں، ناک، کان، سر اور ہاتھ پیر بھی لفظوں کے ساتھ جا ملے ہیں اور احتجاجی نعرے لگا لگا کر میری آواز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میرا جسم نعروں اور پتھروں سے اٹ گیا ہے۔ اور جگہ جگہ سے خون بھی رسنے لگا ہے۔ لفظوں کے بپھرے ہوئے ہجوم نے میرے جسم کا چکا کاٹ لیا ہے اور اب میری گردن کے گرد بڑے بڑے لفظ جمع ہو کر میرا پتلا جلا رہے ہیں۔ میں بھاگ رہا ہوں اور لگ رہا ہے جیسے کسی نے مجھے جلا وطن کر دیا ہے۔ مجھے اپنی آواز کے رونے کی آواز سارے شہر میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتی ہے۔

اس وقت میں کوڑے کے بڑے ڈھیر پر کھڑا اپنی آواز ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہاں چاروں طرف پھٹے پرانے، ردی کاغذ، گتے، پچکے ہوئے ڈبے، ٹوٹی ہوئی بوتلیں، داغ دار گلے سڑے امرود، باسی روٹی کے ٹکڑے، سگریٹ کے خالی پیکٹ، الجھے ہوئے دھاگے، مری ہوئی مرغی گندے کپڑے، بکری کے کھر، گدھے کی لید، ہڈیاں، مرا ہوا چوہا، پھٹے اور گھسے ہوئے جوتے، مسے ہوئے لفظ، ٹوٹے ہوئے کھلونے، ٹوٹے ہوئے شیشے، بکرے کے کان اور عورتوں کے بالوں کے گچھے اوپر تلے دائیں بائیں بکھرے ہوئے ہیں۔ مرے ہوئے چوہے کے قریب ایک پوپلی آواز بھی گند میں لتھڑی پڑی ہے۔

میں لپک کر آواز پر جھک جاتا ہوں وہ میری نہیں کسی اور کی ہے۔ میں آواز کو اپنے کان پر تولتا ہوں۔ وہ واقعی کوڑے پر پھینکنے والی ہے۔ میری ناک جوتے تلے دب جاتی ہے۔ میں پیر سے کوڑے کو نیچے سے اوپر اچھالتا ہوں اور ایک اور آواز ننھی بچی کی گڑیا کی مٹھی میں دبکی ہوتی ہے۔ گڑیا کے گال پر طمانچے کا نشان اور مٹھی میں وہی آواز ہے جسے بچانے کے لیے وہ گھر سے بھاگ کر کوڑے میں آ چھپی ہے۔ اور اب میرے بوٹ کے ایک ہی غوطے نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ گڑیا بڑے غور سے میرے گلے میں لٹکی تحریر پڑھ رہی ہے اور اس کی مٹھی آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی ہے۔ جوں جوں مٹھی کھلتی ہے۔ آواز ابھرتی جاتی ہے۔ مگر یہ بھی میری آواز نہیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔

میں غصے کے عالم میں ایک بار پھر بوٹ کو ڑے کے اندر گھسیٹ کر پوری قوت سے نیچے کا کوڑا اوپر اچھالتا ہوں۔ ایک اور آواز زخم سے اتری ہوئی پٹی میں لپٹی ہے اور اس کے منہ میں روئی ہے۔ قریب ہی ایک اور آواز بُرمُر کاغذ میں پھنسی ہے جیسے کیڑا لگا ہوا ہے۔ یہ وہی آواز ہے۔ جسے سب لوگ پہچانتے ہیں۔ بادشاہ نے کروٹ بدلی ہے۔ اونگھتی بڑھیا نے چونک کر سر اٹھایا ہے۔ چڑیا آئی۔ روشن دان پر بیٹھی ادھر اُدھر دیکھا اور اُڑ کر اناج گھر میں اُتر گئی۔ چپ ـــــ بڑھیا کی پلکیں جھک گئی ہیں۔ اور اب میں تھانے میں اپنے گلے میں لٹکی ہوئی تحریر تھانیدار کو پڑھوا رہا ہوں۔

> "میری آواز چوری ہو گئی ہے۔ اگر آپ کے پاس ہو یا آپ نے کسی کے پاس دیکھی ہو تو میری مدد کریں۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا اور حسب توفیق خدمت بھی کروں گا۔"

تھانیدار تحریر پڑھ کر اپنے بید کے سرے پر دن بھر کی بچی ہوئی موٹی سی گالی میرے سینے پر چبھوتا ہے اور سپاہی سے کہتا ہے۔ اسے حوالات میں بند کر دو۔ صبح تک پاگل پن کا دورہ ختم ہو جائے تو چھوڑ دینا۔ سپاہی مجھے میری جیب سے پکڑ کر گھسیٹتا ہے اور حوالات میں بند کر دیتا ہے۔ پولیس والے ساری رات حوالات کے سامنے والے کمرے میں آوازوں کی تاش کھیلتے ہیں۔ میرے ساتھی حوالاتی ساری رات اپنی آوازوں کو گلے میں بند کر کے ہونٹوں پر حوالات کی سلاخیں گاڑ دیتے ہیں۔

میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر اتھرے ہو کر لفظ ہنہناتے ہیں مگر آواز نہیں ہوتی۔

میں تھکا ہارا ہوں۔ اب تو دوسروں کی آوازیں بھی مجھے گونگی اور تھکی ہوئی لگتی ہیں۔ وقت لمبا اور ڈھیلا ہو گیا ہے۔ جیسے بچے کے جسم پر باپ کا کوٹ کھلا۔ لمبا۔ ڈھیلا۔ ابھی ابھی تو صبح سویرے آدھ پاؤ دہی مانگنے والے بچے کی آواز دکاندار تک شام کو پہنچی ہے۔ کل شام بوڑھی فقیرنی نے بھیک کے لیے جو صدا لگائی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک فٹ کا فاصلہ طے کر کے قریب کھڑے شخص کے کان پر ابھی ابھی بیٹھی ہے۔ اور اب ہانپ رہی ہے۔ کچھ آوازیں اور بھی ہیں۔ جن میں کاغذ پھاڑنے کی آواز، ہاتھ ہلانے کی آواز، لکھنے کی آواز، چائے پینے کی آواز اور دل کی آواز BIONIC WOMAN کی طرح میرے کانوں پر بھاگ رہی ہے۔ میرے کان میرے خلاف احتجاجی نعرے لگا رہے ہیں۔ اور ان آوازوں کو کندھوں پر اٹھا کر میری آواز مانگتے ہیں۔

بادشاہ نے آنکھ کھولی ہے۔ بڑھیا نے اپنی آواز تکیے کے نیچے سے سرکانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آدھی آواز پھر تکیے کے نیچے ہی رہ گئی ہے۔ بڑھیا کہہ رہی ہے۔ چڑیا آئی روشندان پر بیٹھی۔ ایک دو بار دائیں بائیں پھدکی اور اُڑ کر اناج گھر میں اُتر گئی۔ چپ ـــــ چپ ـــــ بادشاہ کی انگلیاں آنکھوں میں نیند ملنے لگی ہیں۔ بڑھیا کی صدا آواز تکیے کے نیچے آ گئی ہے اور بس عدالت کے سامنے کھڑا وکیل کو اپنی گردن میں لٹکی عبارت پڑھوا رہا ہوں۔

پھر میں ایک چٹ پر لکھ کر کہتا ہوں۔
"میں عدالت سے رجوع کرنا چاہتا ہوں"۔
وکیل اپنے کالے کوٹ کی جیبوں میں جھانک کر مجھے مشورہ دیتا ہے کہ قانونِ ضرورت کے آگے تمام انسانی ضرورتیں ہیچ ہیں اور اس کیس میں کوئی جان نہیں۔
میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔
ریلوے اسٹیشن اداس ہے۔ کتنی دیر سے کوئی گاڑی آئی نہ گئی۔ میں ٹی سٹال پر کھڑے شخص کو اپنی گردن میں لٹکی تحریر پڑھوا رہا ہوں۔ وہ سرد آہ بھرتا ہے اور نفی میں سر ہلاتا ہے۔ ایک مال گاڑی آ کر رکی ہے۔ میں جلدی سے ڈبوں کے اندر جھانکتا ہوں۔ ایک ڈبے میں سیمنٹ دوسرے میں سکوٹر۔ تیسرے میں اسلحہ، چوتھے میں گیس کے سلنڈر پانچویں میں گندم۔ چھٹے میں۔ گاڑی چل پڑی ہے۔
بادشاہ نے کروٹ بدلی۔ بڑھیا چونک کر کہتی ہے" چڑیا آئی روشندان پر بیٹھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور اُڑ کر اناج گھر کے اندر اُتر گئی۔ چپ —— چپ —— بڑھیا پھر اونگھنے لگی ہے۔ اور میں شہر کے حاکم کے سامنے کھڑا اپنی گردن میں لٹکی تحریر اُسے پڑھوا رہا ہوں۔ حاکم تحریر پڑھ کر مسکراتا ہے۔ خوبصورت ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھتا ہے۔ ایک نظر اپنے رفقاء پر ڈالتا ہے اور مجھے کہتا ہے۔" تمہاری آواز نہ تو گم ہوئی ہے۔ نہ ہی اسے کسی نے چوری کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمہاری آواز مر گئی ہے"۔
میں چٹ لکھ کر حاکم کے سامنے رکھتا ہوں۔ حضور میری آواز مری نہیں۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے میری طرح بے چین ہے۔ مجھے اس کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ وہ گھر کے خالی برتنوں میں کھنکتی ہے۔ درختوں میں چھپ کر بین کرتی ہے۔ لفظوں کے اندر روتی ہے۔ بند کمروں میں چیختی ہے۔ گدھوں کے کھُروں تلے چلاتی ہے۔ سلاخوں سے لپٹ کر آہیں بھرتی ہے۔ میں نے اسے ایک ننھے بچے کے کندھے پر دھوبن چڑیا بن کر بیٹھے بھی دیکھا ہے۔
حاکم ایک بار پھر اپنے رفقاء کی طرف دیکھتا ہے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے۔ سچے مسلمان بنو۔ اللہ پر یقین رکھو۔ اور جان لو کہ تمہاری آواز مر چکی ہے۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔
میں ایک اور چٹ لکھ کر حاکم کے سامنے رکھتا ہوں۔ حضور اگر ہزار ہا سال کے بعد بھی بادشاہ کے تکیے کے نیچے دبی ہوئی بڑھیا کی آواز آج تک نہیں مری۔ تو پھر میری آواز کیسے مر سکتی ہے۔ سنیئے۔ اس بڑھیا کی آواز سنیئے۔
میں چٹ اُٹھا لیتا ہوں۔ بڑھیا کہتی ہے۔ چڑیا آئی —— روشندان پر بیٹھی —— اِدھر اُدھر دیکھا اور اُڑ کر اناج گھر میں اُتر گئی —— گندم کا دانہ اٹھایا —— اڑی —— روشن دان پر بیٹھی اور پھر سے اُڑ گئی"۔
"میری زبان ہونٹوں کی لگام کھینچتی ہے۔ ہونٹ اتھرے گھوڑوں کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر لفظ ہنہناتے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔

تخلیق و ترجمہ :۔ امر جلیل

تاریخ کا کفن

نمازیوں کی آخری صف سے ایک شخص اچانک اٹھ کھڑا ہوا وہ سیاہ فام تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے، آنکھیں روشن لیکن اندر دھنسی ہوئی اور چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ایک دراز قامت نوجوان تھا۔ اس کے لباس پر جابجا پیوند لگے ہوئے تھے، زندگی کا بوجھ اٹھاتے اور سہتے اس کی ریڑھ کی ہڈی کمان کی طرح خم دار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طائرانہ نظر عیدگاہ پر ڈالی۔

تمام عیدگاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ نمازِ عید شروع ہونے میں صرف چند گھڑیاں باقی تھیں، نئے اُجلے اور بھڑکیلے لباس میں ملبوس لوگ احترام سے مولوی صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ اور اُونگھ رہے تھے۔ مولوی صاحب بہت جوش میں تھے۔ وہ کبھی بانہیں پھیلا کر اور کبھی گرا کر اور کبھی دھیمی آواز میں تقریر کر رہے تھے۔ وہ لوگوں میں سوئے ہوئے ایمان کے جذبے کو جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگ غور سے ان کی تقریر سمجھنے کی کوشش میں تھے۔ ان کی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے جوتوں پر مرکوز تھیں۔ جوتوں، سلیپروں اور چپلوں کے تلے ملے ہوئے تھے۔ اور مصلّوں کے سامنے سجدے کی جگہ سے ایک انچ آگے رکھے ہوئے تھے، کچھ نمازی دُلدل کی طرح سجائے ہوئے بچے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی ایک آنکھ بچوں پر تھی۔ مولوی صاحب کی صحت قابلِ رشک تھی۔ مائیکروفون اگر نہ بھی ہوتا تو تب بھی ان کی پاٹ دار آواز آخری صف میں کھڑے ہوئے سیاہ فام شخص تک ضرور پہنچ جاتی۔

"بیٹھ جا اے حبشی ——" ایک دُبلے پتلے شخص نے سیاہ فام شخص کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "اب کیا بندریا تلاش کر رہا ہے۔"

سیاہ فام شخص نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

وہ پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف میں کھڑا ہو گیا۔

"دور ہٹ یار ——" بٹیر جتنے ایک شخص نے اس کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ "آدمی ہے یا تارکول کا ڈرم۔"

سیاہ فام شخص خاموش رہا۔ وہ اس صف سے نکل کر اگلی صف میں جا کھڑا ہو گیا۔

"او ہو! بڑے کوئی احمق ہوا ماں حبشی ——" ایک عمر رسیدہ شخص نے بہت غصّے سے کہا۔ "شرم نہیں آتی تمہیں۔ اپنا غلیظ پاؤں تم نے میرے اُجلے پائجامے پر رکھ دیا ہے۔"

سیاہ فام شخص نے عمر رسیدہ بزرگ کے غصّے کو نظر انداز کر دیا۔ وہ اس صف سے نکل کر اگلی صف میں پہنچ گیا

انہوں نے اُچک کر اپنے اپنے جوتے اٹھائے۔

"ابے بدبخت بندگی میں روڑے اٹکاتا ہے۔"

چند ایک نوجوان بے حد بہادر دلیر اور جانباز تھے۔ وہ عید کی نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ وہ جوش میں آ کر سیاہ فام شخص کی طرف لپکے۔ انہوں نے سیاہ فام شخص کو قابو کر لیا۔ مولوی صاحب تقریر کو ادھورا چھوڑ کر منبر کی آخری سیڑھی پر جا کھڑے ہو گئے اور تماشا دیکھنے لگے۔ تب عیدگاہ میں موجود تمام لوگوں کی توجہ سیاہ فام شخص کی طرف مبذول ہو گئی تمام لوگ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اور اس کو کوسنے لگے۔

مختلف اقسام کے لوگ۔ مختلف اقسام کے لہجے۔ مختلف اقسام کی زبانیں۔ لیکن مفہوم ایک!

ہیرو کی بجائے ہیروئن نظر آ رہا تھا' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے حال ہی میں افریقہ سے ہجرت کر کے آیا ہے۔"

قریب بیٹھے ہوئے ایک بزرگ اونگھ رہے تھے ہنسی کی آواز پر انہوں نے چونک کر اداکار نما نوجوان کی طرف سے دیکھا۔ اور پھر شفقت سے کہا۔ "مولوی صاحب کی باتیں غور سے سنو۔"

ایک نوجوان نے کہا۔ "بہت دیر سے جاگے ہیں آپ۔"

اور پھر وہ دونوں نوجوان بزرگ کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

دریں اثنا، سیاہ فام شخص اس صف سے نکل کر اگلی صف میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ابے منہ اٹھائے اونٹ کی طرح کہاں چلا آ رہا ہے۔"

دو چار لوگوں نے اس کے پھٹے پرانے اور پیوند لگے لباس اور سیاہ جلد کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا "یہاں کیا مٹھائی بانٹی جا رہی ہے کہ بندروں کی طرح اچھلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔"

اور پھر آوازوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"ابے دور ہٹ۔"

"واپس جا۔"

"آگے مت آ۔"

"پاگل ہے۔"

"باؤلا ہے۔"

"شکل سے گوریلا لگتا ہے۔"

"شکل سے بن مانس لگتا ہے۔"

"بن مانس اور گوریلا ایک ہی بات ہے۔"

سیاہ فام شخص نے جست لگائی اور پھر وہ اچھلتا کودتا اور چھلانگیں لگاتا کئی صفیں پھلانگ گیا۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی جو لوگ اونگھ رہے تھے وہ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے جو لوگ مولوی صاحب کی تقریر سن رہے تھے اور نگاہیں اپنے جوتوں کی طرف مرکوز کئے ہوئے تھے وہ تشویش سے سیاہ فام شخص کی طرف دیکھنے لگے اور جب کشیدگی بڑھنے لگی تب

"خبردار—" ایک شخص جو فرشتوں کے ہم شبیہ تھا۔ اس نے سیاہ فام شخص کی ٹانگ پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا "لاحول ولا! یثرب کا مصلّا خراب کر دیا تم نے۔ آدمی ہو یا ابنِ ابلیس ہو!"

سیاہ فام شخص نے چٹکی کا اثر نہ لیا۔ وہ آگے دیکھ رہا تھا۔ بہت آگے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کا تعاقب کر رہا ہو۔ کسی کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ اس صف سے نکل کر اگلی صف میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ابے او بن مانس—" ایک نوجوان نے بڑی محنت اور تردّد سے ماتھے پہ بال سجائے تھے۔ وہ فلم اسٹار وحید مراد نظر آنے کی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا۔ اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "ابے کیا کسی چڑیا گھر کے پنجرے سے آ رہا ہے۔"

فلم اسٹار نما نوجوان کے ساتھ ایک اور نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ جس نے خاصا میک اپ کر رکھا تھا۔ اور

"چور ہے سالا۔ بغل میں جوتی دبا کر بھاگا جا رہا ہے۔"

"چور نہیں ہے جیب کترا ہے۔"

"جانے نہ پائے۔"

"پکڑ لو حرامزادے کو۔"

"سوئر کا بچہ۔"

"خدا کے گھر سے چوری کرتا ہے۔"

"بدبخت شکل ہی سے چور لگتا ہے۔"

"سالے کو مضبوطی سے تھام کے رکھیو۔"

"سیاہ فام شخص کا لباس خستہ حال تھا۔ لوگوں نے اس کا لباس تار تار کر دیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ وہ ہجوم کے درمیان تھا، لیکن ہجوم سے بے خبر تھا اس کی نگاہیں دور کسی محور پہ مرکوز تھیں، ایک ٹھنگنے شخص نے اس کے گھنگھریالے بالوں میں ہاتھ ڈال کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔"

"ابے اب مار یو مت سالے کو۔" ایک طرح دار شخص نے کہا نماز کے بعد مرمت کیجیو سالے کی۔ پستہ قد شخص نے اپنی انگلیاں اس کے گھنیرے بالوں سے چھڑا لیں اور ایک چپت اس کے سر پہ رسید کیا۔

ایک شخص ہجوم کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ وہ سیاہ فام تو نہ تھا۔ لیکن سیاہ فام شخص کی طرح خستہ حال تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا "میں اس شخص کو جانتا ہوں۔"

"تو اس شخص کو جانتا ہے۔" لوگوں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں میں اس شخص کو جانتا ہوں۔" نو وارد نے کہا۔

"یہ کالا آدمی چور نہیں ہے۔ یہ جیب کترا بھی نہیں ہے۔"

"لگتا ہے تو اس کا ساتھی ہے۔" کسی نے کہا۔ "پکڑ لو اس بدمعاش کو۔"

"ٹھہرو—" نو وارد نے کہا۔ "میں اس کا ساتھی نہیں ہوں۔"

کسی نے پوچھا۔ "پھر تم کون ہو۔ اور کس کالے حبشی کو کس طرح جانتے ہو۔"

"میں کیماڑی پہ بستر چائے بیچتا ہوں۔" نو وارد نے کہا۔ "یہ کالا آدمی وہاں پر جہازوں سے گندم کی بوریاں

اُتار کر ریلوے ویگنوں میں لادتا ہے۔"
"تو جا کر کیماڑی پہ سبز بلکہ سرخ چائے بیچ۔"
لوگوں نے اس سے کہا۔ "ہم خود ہی اس کو ٹھیک کر لیں گے۔"
نووارد نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن لوگوں نے چلّا کر کہا۔ "ابے جاتا ہے یا اس کے ساتھ تیری بھی خبر لیں۔"
نووارد گردن کھجاتا ہوا ہجوم سے نکل گیا۔
ایک بار پھر جلوس کا جوالا مکھی ابل پڑا۔ "مارو سالے کو۔"
"سنگسار کر دو تر کے نیچے کو۔"
"ابھی نہیں نماز کے بعد۔"
"نماز کے دوران گڑبڑ نہ ہونے پائے۔"
"نماز کے بعد مردود کا منہ کالا کر کے گدھے پہ بٹھا کر جلوس نکالا جائے گا۔"
"یہ تو خود ہی کالا ہے۔ اس کا منہ کس چیز سے کالا کرو گے۔"
"تم نے بہت بڑا مسئلہ اٹھایا ہے، کالے آدمی کا منہ کس چیز سے کالا کیا جائے گا۔"
"ہم نئی روایت کو جنم دیں گے۔ ہم اس کالے آدمی کا منہ چونے سے سفید کر دیں گے۔"
"چور کا منہ صرف کالا کیا جاتا ہے۔ سفید نہیں۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔"
"پھر کیوں نہ ہم لوگوں سے اس مسئلے پر ووٹ لیں۔"
"پہلے اس شخص کا احتساب ہو گا۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔"
"اور احتساب کا عمل مکمل ہونے سے پہلے آپ ووٹ کی بات نہیں کر سکتے۔"
"پھر اس شخص کا کیا کیا جائے؟"

سیاہ فام شخص کا کیا کیا جائے! اس بات پر لوگوں میں بحث و تکرار ہونے لگی شور و غل بڑھ گیا۔ ہلڑ بازی میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی تب اچانک سیاہ فام شخص ایک جست میں ہجوم کے درمیان سے نکل گیا۔ اور نہایت تیزی اور پھرتی سے صفیں پھلانگتا آگے کی طرف بڑھتا گیا۔ لوگوں کو تشویش ہونے لگی۔ جو اسے چور اور جیب کترا سمجھ رہے تھے۔ وہ اسے قاتل سمجھنے لگے۔"

پہلی صف میں شہر کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر کے کارخانہ دار، سرمایہ دار، سیٹھ ساہوکار، مولا والے۔ چاندی والے سونے والے اور نامی گرامی سیاستدان سب پہلی ہی صف میں موجود تھے سب سے بڑھ کر جس بات نے لوگوں کو پریشان کیا وہ تھی پہلی صف میں عزتِ مآب جناب محمود کی موجودگی۔ جناب محمود بنفسِ نفیس پہلی صف میں عین امام کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اور اخباروں اور دیگر ابلاغ عامہ کے فوٹوگرافروں سے تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ اس تمام صورتِ حال سے وہ خاصے مضطرب نظر آ رہے تھے۔

سیاہ فام شخص جب پہلی صف کے قریب پہنچا تو پولیس کی بھاری جمعیت نے اُسے دبوچ لیا۔ اور پھر اس کو گھونسوں ٹھوکروں، لاتوں اور لاٹھیوں سے پیٹتے ہوئے عیدگاہ سے باہر لے آئے۔

لاؤڈ سپیکر سے مولوی صاحب کی آواز گونجنے لگی وہ لوگوں کو نمازِ عید کی ترکیب سمجھا رہے تھے۔ "امام صاحب چوتھی مرتبہ اللہ اکبر کہے تو ہاتھ کانوں تک لے جائیں اور پھر چھوڑ دیں۔"

"ابے اگلی صف کی طرف کہاں بھاگا جا رہا تھا حرامی۔" سیاہ فام شخص سے عیدگاہ کے باہر استفسار کیا جا رہا تھا۔ جس میں ملک کے مشہور سراغرساں اور پولیس افسر حصّہ لے رہے تھے۔

سیاہ فام شخص کے پیٹ میں گھونسہ مارتے ہوئے پوچھا گیا۔

"ابے بتا پہلی صف میں کس نیت سے بڑھ رہا تھا۔"

سیاہ فام شخص کی ناک اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے گردن گھما کر اپنے اطراف ملک کے مشہور سراغرساں اور پولیس افسروں کی طرف دیکھا۔

"ابے جواب دے۔ خاموش کیوں ہے۔" ایک گھونسہ پیٹ میں اور ایک ناک پر پڑا۔ ٹخنے پر ٹھوکر لگی۔ اور اس سے پوچھا گیا بتا کس کے اشارے پر اور کس نیت اور کس ارادے سے اگلی صف کی طرف جا رہا تھا۔"

خون کی قے کرتے ہوئے سیاہ فام شخص نے کہا۔ "میں پہلی صف میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"تو پہلی صف میں نماز پڑھنی چاہتا ہے۔" سراغرسانوں پولیس کے اعلیٰ افسروں اور سپاہیوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا حلیہ اور پہلی صف میں موجود لوگوں کی شخصیت اور اہمیت کا تصور کرتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"ابے آئینے میں کبھی شکل دیکھی ہے تو نے اپنی!"

اس کی کنپٹی پر تھپڑ پڑا اور کہا گیا۔ "لنگور کا بچہ ہے۔"

اس نے قمیص کی تار تار آستین سے ناک سے بہتا ہوا خون صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلی صف میں نماز پڑھوں گا۔"

"تو پہلی صف میں نماز پڑھے گا۔ دو چار لاتیں پڑیں اور کہا گیا۔ "جانتا ہے پہلی صف میں شہر کے معززین موجود ہیں۔ اور تو لنگور ان کے ساتھ نماز پڑھنی چاہتا ہے!"

درد کی ٹیس اٹھی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے اکھڑی اکھڑی آواز میں کہا۔ "پہلی صف میں نماز پڑھوں گا۔"

"سالے کا دماغ چل گیا ہے۔" بالوں میں ہاتھ ڈال کر اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا گیا۔ اس کا خون آلود چہرہ آفتاب کی طرف کرتے ہوئے کہا گیا۔ "ابے اُلو کے پٹھے۔ جانتا ہے پہلی صف میں جناب محمود بیٹھے ہوئے ہیں۔"

اس کے بالوں سے ہاتھ نکالا گیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، اس نے آہستہ آہستہ گردن اٹھا کر اپنے اطراف اہم لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں اگلی صف میں جنابِ محمود کے ساتھ شانہ بشانہ نماز پڑھوں گا۔"

سپاہی ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگے۔ ایک سپاہی نے کہا۔

"سالا پاگل ہو گیا ہے، محمود صاحب کے ساتھ نماز پڑھے گا!"
سیاہ فام شخص نے کہا "میں محمود صاحب کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔"
ایک سراغرساں نے اس کی گردن پکڑتے ہوئے اور پھر غور سے اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"تو کون ہے۔ تیرا نام کیا ہے؟"
"میں ایاز ہوں۔" سیاہ فام شخص نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ایاز ہوں۔ میں ایاز ہوں۔ میں محمود کے ساتھ ایک ہی صف میں نماز پڑھنی چاہتا ہوں۔"
اور پھر وہ بجھتا گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ تارکول کی سیاہ سڑک پر گر پڑا۔

احمد داؤد

عجائب گھر ۳

"رات کے اس پہر جب چوکیداروں کی آنکھ نیند سے بوجھل ہوگئی تو مَیں شہر کے چار چفیرے جنگی سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر کو چنگاری دکھاؤں گا اور تم ——" اس نے شہادت کی انگلی پہ مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم اس جلتے شہر کے آخری گواہ ہوگے"

اس نے ہاتھ نیچے کیا انگلی جھکائی تو مَیں اپنی جگہ پر آگیا اور اس کی آنکھوں میں بنے شہر کے نقشے کو آگ لگتے دیکھنے لگا۔ عمارتوں کے پتھر پگھل رہے تھے اور بندے شعلوں کی رتھ تلے کچلے جا رہے تھے۔ مَیں نے سہم کر شعلوں کی لہر سے بچنے کے لیے ایک طرف چھلانگ لگانی چاہی تو اس نے مجھے شانے سے دبوچ لیا۔ اب میرا رخ ساحل کی طرف تھا۔ جہاں تفریح منانے والوں کا انبوہ اپنی صداؤں کے مستول اٹھاتے دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بنے شاپنگ سینٹرز ہوٹلز، مسجد اور میدان میں انسان میلی جھاگ کی طرح پھیلے ہوئے تھے انسانوں کی اس جھاگ میں کہیں کہیں اسکا بچہ آنکھوں پہ دوربین چڑھاتے، ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ چند گھڑی سامنے شہر کی فصیل کو گھورتا رہا اور پھر پلٹ کر بولا۔

"ہم یہاں لہروں سے کھیلنے آتے ہیں۔ کنارے کی ریت پہ تو بچے کھیلتے ہیں۔ وہ دیکھو ——" اس نے بازو کھول کر فاصلوں کو سمیٹا۔

"مَیں اَب کبھی تمہارے ساتھ ساحل پہ نہیں آؤں گا۔

مَیں نے باہوں کے بل پر چلتے ہوئے کہا۔

"کیوں ——"

"اس سمندر میں —— اس سازشی جھیل کے اندر تمہاری بیوی اور تمہاری ماں ڈوب گئی تھی اور اَب —— " میرا گلہ رندھ گیا مَیں نے گہری سانس لے کر اپنی بات پوری کی۔

"اور اَب تمہارا بچہ کنارے پہ تمہارا منتظر ہے —— بھلا اتنی دور آنے میں کیا تک ہے ——؟"

وہ مسکرایا اور کہنے لگا —— "مَیں ان کی تلاش میں ہی تو ہر دفعہ لہروں کو اپنے وجود کی خیرات دینے آتا ہوں۔ مگر اتنی بے نیازی ——" اس نے حقارت سے سمندر کو گھورا اور میرے شانے پہ

ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔" آؤ۔ واپس چلتے ہیں۔ میرا بیٹا انتظار کر رہا ہے ــــ وہ دیکھو غباروں کے جھرمٹ کے پاس شاید اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے ــ"

ہم سمندر کی گونج اپنی پشت پہ لیے ساحل کی طرف بڑھے بھیگے کپڑوں سے گرتی پانی کی بوندیں اور نمکین ہوا ہمارے جسم کو گدگدا رہی تھی۔ ساحل پہ لیٹی عورتیں پہیوں والی کرسیوں پہ بیٹھے بوڑھے اور اونٹوں پہ سوار جوان دھوپ کے بے انت بادبان تلے پھڑ پھڑاتے سمندر کا لطف لے رہے تھے۔ ہمارے قریب سے اونٹوں کی ایک جوڑی گزری ان کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی سریلی آواز اور جوڑے پاؤں کے نقش ریتلی زمین پہ ابھرنے لگے۔ ایک زور کی لہر آئی اور سارے نقش مٹا کر پلٹ گئی۔ ساحل کے ساتھ پھیلی دکانوں میں قسم قسم کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کاغذ کی کشتیاں، گتے کے جہاز، ہینگروں میں لٹکے آدمی، بھنی سبزیاں اور پرندے مگرمچھ کی کھال کے کوٹ نئے فیشن کے لباس ٹافیاں، کھلونے، آدھے جسم والی عورتوں کی چھاتیوں پہ چڑھے بریزئیرز لوبان اور کافور کی شیشیاں تابوت اور بوتلوں میں بند لاوارث بچے ــــ من چلے گاہک شیشوں میں جھانکتے ہینگروں میں لٹکے مرد انہیں عاجزی سے اپنی طرف بلاتے، آدھے دھڑ والی عورتیں آنکھ مار کر سینے کا سائز بتاتی، لاوارث بچے گاہکوں میں اپنے لہو کی خوشبو پاکر بوتلوں میں کلبلاتے اور گاہک اپنی پسند کی کریم، یا گتے کا جہاز لے کر شور مچاتا واپس ہوتا اور پکنک پہ آئے لوگوں میں گم ہو جاتا۔ ہم گمشدہ لوگوں میں راستہ بناتے ساحل کی طرف آرہے تھے کہ اس کے بیٹے نے ہمیں دیکھ کر زور سے پکارا اور پھر ہماری طرف دوڑنے لگا۔ دوڑتے ہوئے لڑکے کی پشت پہ شاپنگ سینٹرز، ریسٹوران اور مسجد کا مینار ہچکولے کھا رہا تھا مینار کی چوٹی پہ بیٹھی چیل نے اپنے پنجوں میں پکڑی ہتھیلی سے ایک لکیر نوچی اور نیچے سڑک کی جانب اچھال دی۔ سڑک کے پاس ہم تینوں اکٹھے ہو گئے ہماری پشت پھیلا جلالی سمندر کبھی اتنی تیزی سے کروٹ بدلتا کہ لہریں سڑک پہ آجاتیں۔ اور جب ہم تینوں اوپن ایئر کی طرف جا رہے تھے تو ایک ایسی ہی لہر نے ہمارے قدموں کو چوما تھا۔ ہجوم نے پاگلوں کی طرف نعرہ لگا کر سمندر کی وحشت کا منہ چڑایا تھا۔

"ابو ــــ ابو ــــ" اچانک اس کا بیٹا پلٹا اور اپنے لفظوں پہ زور دیتے ہوئے بولا۔

"ابو میں نے آپ کو اس کشتی میں دیکھا تھا۔"

"کیسے؟" ہم دونوں نے واپس مڑ کر دور نیلی خلاء میں گھورا ــــ

"میں نے دیکھا کہ آپ مجھے پکار رہے ہیں۔ میں نے دوربین میں آپ کو دیکھا تھا اور آپ کی آواز بھی سنی تھی۔" بچے نے گلے میں لٹکی دوربین سے کھیلتے ہوئے بولا۔

ہوا کی خنکی میں ہمارے بدن خوف سے کانپے۔

میں نے لڑکے سے دوربین لے کر آنکھوں سے لگائی دور جہاں پانی اپنے وقار اور طمانیت کے ساتھ سمندر کی ڈھلوانوں کو سہارا دیتے ہوئے تھا۔ ایک کشتی تیرتی چلی آرہی تھی۔ جس کے مسافروں نے اپنی

بانہوں کے کشکول پناہ کی تلاش میں زمین کی جانب پھیلاتے ہوئے تھے۔

"آؤ کچھ کھا پی لیا جائے"۔ اس نے میری محویت کا رُخ موڑا۔

وہ بچے کو کندھے پہ بٹھائے اوپن ایئر کی طرف بڑھا۔ مَیں اس کے قدموں کی نشانوں پہ پاؤں رکھتا اپنے عقب میں کشتی کے مسافروں کے واویلے سنتا ان کے ساتھ چلتا رہا۔ ہوٹل میں بکھری میزوں کے چہروں پہ آدمیوں کی رونق پھوٹ پڑی تھی۔ گاہک ایک نظر مینو پہ ڈالتے گلے میں لٹکی دوربینوں سے منظر کی دید کرتے۔ کچھ سوچتے اور پھر آرڈر دیتے اور بے معنی باتوں کے جنگل میں گم ہو جاتے۔

بیرہ ہماری میز پہ برتن لگانے لگا ــــ مَیں نے مسجد کی مینار پر بیٹھی چیل پہ نظر ڈالی پچھلے کئی زمانوں سے شہری انتظامیہ اسے یہاں سے اڑانے کے لیے ہر جتن کر چکی تھی۔ مگر اب تو یوں لگتا تھا جیسے یہ انہوں نے ہی یہاں پتھر کی سل تراش کر اس میں جان ڈال کر بٹھا دی ہو۔ میں اس کی طویل عمری پہ غور کرتا ہوا سمندر کو دیکھنے لگا جہاں شہر شہر مایوسی کے لنگر ڈالنے کے بعد مسافروں کی کشتی اب ہمارے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ابو ــــ ہم بھی اس کشتی کی سیر کریں گے" ــــ بچّے نے کراکری کی ترتیب توڑ کر اونچی آواز میں کہا گاہکوں نے ناپسندیدگی سے اسے گھورا۔

"بہت جلد ہم اس کے مسافر ہوں گے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا اور پھر منہ پر ہاتھ دھر لیا گویا لفظ واپس انڈیل رہا ہو ــــ مَیں نے دوربین اپنی گود میں رکھی اور اس پہ اپنے ہاتھ مضبوطی سے جماتے ہوئے کہا۔

"ہمارا مستقبل بچے پہ بے نقاب ہو رہا ہے"۔

"کیا کروں ــــ بے بس ہوں ــــ" وہ سامنے بیٹھے بوڑھے کو دیکھ کر بولا۔ "جو بات بچّوں سے چھپاتے ہیں۔ وہ اس کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں"۔

ہم نے دکھ سے سر ہلایا اور کھانے کی خوشبو میں ڈوب گئے۔

سامنے بیٹھے بوڑھے نے اپنی ہتھیلی میز پہ دھری اور اس کی ریکھاؤں میں اتر گیا اس کے قریب کی میز پہ بیٹھا جوڑا آلکسی سے دیواروں کو گھور رہا تھا عورت اپنی گود میں بیٹھی بلی کی پشت سہلا رہی تھی اور مرد کا ہاتھ پتلون کی جیب میں اترا کسی شے کو ٹٹول رہا تھا۔ بوڑھے نے پلکیں جھپکا کر ریکھائیں گنیں اور خوفزدہ ہو کر چیخنے لگا...... مینار پہ بیٹھی چیل نے اپنے پنجوں میں پکڑی ہتھیلی سے عمر کی ریکھا نوچی اور نیچے پھینک دی۔ بوڑھے کے لبوں سے کراہ نکلی اس کا سر چھاتی پہ ڈھلک گیا ہوٹل کے ملازم نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ چیل کے پنجوں میں ایک نئی ہتھیلی جھول رہی تھی۔ اوپن ایئر ہوٹل کے سامنے، سڑک پر اور دکانوں کی قطاروں کے سامنے رش ہو رہا تھا۔ لوگ غروب کا منظر دیکھنے آ رہے تھے۔ ہمارے سروں پہ پھیلے دھوپ کے بادباں سورج کے سفر کے ساتھ ساتھ لمبے ہو رہے تھے۔ لوگ کاروں، بگھیوں، مشکی گھوڑیوں پہ سوار سائیکلوں کی تنگ گدیوں پہ سجے۔ لوگ، لوگوں کے کندھوں پہ بیٹھے ہوئے ساحل کی

طرف آرہے تھے۔ کبھی کوئی گاڑی زور سے ہارن بجا کر گزرتی تو اوپن ایئر کے گاہک منہ بنا کر اسے گھورتے اور پھر کسی بگھی میں بیٹھی عورت کو دیکھ کر بگھی کی قدامت کے ساتھ عورت کی عمر کی نسبت پہ بحث کرنے لگ پڑتے۔ بھکاروں کی ٹولیاں امیر سیاحوں کو دیکھ کر بھیڑیوں کی طرح بھنبھناتی ان کا تعاقب کرتیں اپنے جنوں سے قصیدوں کے ٹیپ نکال کر بجاتیں اور سکے کی کھنک میں لمبی عمر کی دُعا دے کر نئے گاہک کا رُخ کرتیں۔ کبھی کوئی مضبوط بانہوں ـــ سیاہ بالوں میں لپٹی چوڑی چھاتی والا کوچوان بگھی کے گھوڑوں کو چابک سے چھیڑتا ہمارے سامنے سے گزرتا تو ہوٹل کے ملازم بگھی میں بیٹھی عورت کو تعظیم سے جھک کر بلاتے، کوچوان حقارت سے انہیں دیکھتا اور بگھی لہروں کے پاس جا کر روک دیتا عورت پائیدان پہ رکھے ریشمی قالین کے ٹکڑے پہ پاؤں ٹکاتی اور کسی اونٹ کی پشت پہ سوار ہو کر اپنا فاصلہ آسمان کے قریب کر لیتی۔

"میں اس منظر کا گواہ ہوں اور جب شہر جل جائے گا تو مجھے شہادت دینی ہوگی"۔

"بالکل ـــ یقیناً ـــ اس نے میرے خیالوں کا ورق پڑھتے ہوئے تائید میں سر ہلایا اور بیرے کو آئس کریم لانے کو کہا۔

لڑکے نے میز تلے سے ہاتھ بڑھا کر میری گود میں رکھی دوربین چپکے سے اٹھائی اور آنکھوں سے لگا کر پرجوش مسکراہٹ سے بولا۔

"ابو ـــ بڑی بڑی مچھلیاں ـــ اور وہی کشتی اس میں آپ بھی بیٹھے ہوتے ہیں"۔ اس نے جلدی سے دوربین چھین لی اور پیار سے بولا۔

"اس کے شیشے خراب ہیں۔ تم آئس کریم کھاؤ ـــ اور ـــ اور ـــ وہ بات بنانے کی کوشش میں سٹپٹا گیا۔

سامنے بیٹھے جوڑے نے پلٹ کر ہمیں دیکھا اور پھر شوکیسوں میں لٹکے ہینگروں، بوتلوں میں بند لاوارث بچوں کافور کی مہک اور تابوتوں کی چمک میں کھو گئے۔ عورت نے اپنی گود میں بلی کو سینے سے لگا لیا۔ گریبان کے بٹن کھولے اور اپنی چھاتی بلی کے منہ میں دے دی۔ مرد نے کاہلی سے پہلو بدلا اور جیب سے ہاتھ نکال کر انگوٹھا چوسنے لگا۔

سڑک کے کسی موڑ سے بینڈ کی آواز آرہی تھی۔ کلارنٹ شہنائی اور ڈرم۔ تینوں ساز اپنی سروں کا سفر تیزی سے طے کرتے ہماری طرف آرہے تھے۔ بچے نے بینڈ کی آواز سن کر متجسس آنکھ سے چاروں طرف دیکھا اور بے چینی سے انگلیاں مروڑنے لگا۔ ہم دونوں نے آنکھیں چار کیں اور سڑک پہ دیکھنے لگے۔ جہاں ہجوم برساتی بادل کی طرح بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بینڈ بجانے والوں کی ٹولی کے درمیان چار آدمی ایک جنازہ اٹھائے ہجوم کی قیادت کرتے ساحل کی طرف آرہے تھے۔ جنازے کے پلنگ کے چاروں طرف مرنے والے کی تصویریں لٹک رہی تھیں اونچی دھنوں کے ساتھ ہجوم قہقہے لگاتا ایک دوسرے کو گدگداتا آگے بڑھ رہا تھا۔

"ابو ـــ ابو ـــ یہ تو ـــ لڑکے نے میت کے چاروں طرف لٹکی تصویروں میں ایک دیکھی اور حیرت سے چلایا۔ ـــ "یہ تو ہمارے چیف سکاؤٹ ہیں ـــ کیا ہوا انہیں؟

"مر گئے ـــ خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے"۔

بچے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور کہا:

"انہوں نے مجھے میڈل دیا تھا جب میں سکول میں تھا مجھے یاد ہے"۔

"نہیں کوئی اور ہوگا ــــ" وہ بولا۔

"اچھا ــــ بچے نے لمحہ بھر کو کچھ سوچتے ہوئے کہا" وہ بھی اسی طرح کا تھا"۔

اوپن ایئر کے گاہکوں میں کسی نے سالن کی پلیٹ جنازے کی طرف اچھالی۔ ہجوم نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ بینڈ کی دھنوں میں بھرتی آگئی۔ مینار پہ بیٹھی چیل نے اپنے پر پھیلائے اور دھوپ کا راستہ کاٹا۔ کسی نے جوتا فضا میں اچھالا جو مردے کے بستر پر جا گرا کہیں سے انڈوں کی بوچھاڑ آئی اور جنازے کی سفید چادر زرد ہوگئی جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے ہجوم نے ہاتھ ہلائے تو پکنک منا تا گروہ ان کے گرد اکٹھا ہونے لگا۔ ایک عورت نے اپنی بریزیئر اتار کر گیند بنائی اور پتھر جنازے کی طرف پھینکے۔ ایک پتھر بینڈ کے ڈرم سے ٹکرایا۔ عجیب آواز نکلی۔

"عجیب لوگ ہیں ابو ــــ" بچے نے پریشان سا ہو کر کہا۔

"بادشاہ مرجائے تو لوگ خوشی کا اظہار اسی طرح کے عجیب طریقے سے کرتے ہیں ــ"

"اب ہمیں میڈل کون دے گا؟ بچے نے پوچھا ــــ اور وہ چیف سکاؤٹ۔

وہ ہلکے سے مسکرایا اور بچے کے شانے تھپتھپا کر بولا۔

"ایک ہی رات کی بات ہے۔ صبح جو آدمی سب سے پہلے شہر میں داخل ہوگا۔ لوگ اسے بادشاہ بنا لیں گے"

"اچھا ابو" ــــ بچے نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں ــ "سبھی سارے ایک جیسے ہوتے ہیں!

"ہاں ــــ لیکن اس دفعہ شاید ایسا نہ ہو ــ" اس نے بچے کو نظرانداز کر کے میری طرف رُخ کیا اور سرگوشیوں میں بولا ــ "میں صبح ہونے سے پہلے کسی نیک لمحے میں شہر کو آگ لگاؤں گا اور تم اس کے گواہ رہنا"۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ کہیں سے ایک آنسو میری پلکوں میں طلوع ہُوا۔

جنازہ پانی کے اندر چلا گیا تھا۔ مچھلیوں نے لہروں کی شکنیں چیر کر سر باہر نکالے اور اپنی ننھی آنکھوں سے آنے والے مہمان کو سلامی دی۔ مینار پہ بیٹھی چیل نے، ہتھیلی سے کئی لکیریں نوچ کر نیچے پھینکیں۔ سامنے سمندر کے متحرک ماتھے پر تیرتی مہاجروں کی کشتی ساحل کے پاس آگئی تھی۔ مسافر ہاتھ ہلا ہلا کر جنازے کے ساتھ آئے، ہجوم کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ وہ اپنی پسلیوں پر تنے چمڑے کو ڈھول کی طرح پیٹتے، بچوں کے کملائے چہروں کو سورج کے جھلسے تھال میں رکھ کر لوگوں کی طرف بڑھاتے۔ لوگ حقارت سے انہیں دیکھتے

بینڈ بجانے والی ٹولی نے اس دخل اندازی کے خلاف ماتمی دھنیں بجائیں اور اپنے ساز غصے میں کشتی کے مسافروں کی طرف دے مارے۔ من چلے جوانوں نے ریت کے گولے اور تھوک ان پہ پھینکی ایک عورت نے دودھ کی بوتل خالی کی اور پھر اس میں نمکین پانی بھر کر کشتی میں بیٹھے بچوں کی طرف اچھالا۔ قہقہے بلبلوں کی طرح اٹھے اور مسافروں کی فریاد پہ جھاگ بناتے چاروں اور پھیل گئے، ایک زور کی لہر آئی اور توازن بگڑ گیا مسافروں نے ڈوبتے سورج کی کرنوں سے چمٹ کر ایک مرتبہ پھر پکار کی۔

بچے نے چپکے سے دوربین آنکھوں سے لگالی۔

غروب کا منظر شروع ہو چکا تھا۔ ساحل پہ آئے لوگوں نے اشتیاق اور مسرت کے انتہائی جذبوں کے ساتھ سمندر میں گم ہوتے آفتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ رات سرمئی لہروں کے ساتھ نازل ہو رہی تھی۔ قہقہے، سیٹیاں، تالیاں اور چیل پنجوں میں دبوچی ہتھیلی سے ریکھائیں چن چن کر پھینک رہی تھی۔

"ابو ـــ ابو ـ کشتی ڈوب رہی ہے ـ اس میں آپ بھی"

میں نے لپک کر بچے سے دوربین چھینی اور اس کی طرف مڑا۔ وہ اور وہ تیزی سے سمندر کی طرف بھاگا۔

"سنو ـــ میری بات سنو ـــ" میں نے پکارا۔

لہروں نے میری صدا کو پلٹ کر مجھ پہ دے مارا۔

"سنو ـــ خدا کے لئے سنو ـــ میری بات سنو"۔

میں اس کے تعاقب میں لپکا۔ مگر تک آتی پانی کی لہر نے مجھے جھٹکا دیا۔ سامنے کشتی کے مسافروں کے اوپر نیچے ہوتے سر، ہلتے ہاتھ سورج کے ساتھ ساتھ سمندر میں سیڑھی سیڑھی اتر رہے تھے۔

غروب آفتاب کا منظر لوگوں کو پاگل بنا رہا تھا۔

قہقہے۔ تالیاں۔ شور۔ سیٹیاں۔ کاغذی کشتیاں۔ گتے کے جہاز۔ ہینگروں میں لٹکے لوگ بوتلوں میں بند بچے۔ کافور کی شیشیاں۔ تابوت کھلونے۔ ٹافیاں پتہ نہیں کیا کیا سمندر نے اچانک اپنے حلق سے ساحل کی طرف پھینکا۔

"سنو میری بات سنو"۔ میں نے فریاد کی۔

اس نے جواب دیئے بغیر بانہیں پھیلائیں۔ سمندر کی غلاظت کو شہر کے دامن میں گرنے سے روکنا چاہا مگر لہروں کے طشت پہ ناچتی رات نے اسے کشتی کا مسافر بنا دیا۔



تجزیہ

سیاسی تجزیہ

عبداللہ ملک

ادبی تجزیہ

ڈاکٹر سلیم اختر

۴ر اپریل ۱۹۷۹ء

یہ تجزیہ فروری کے آخری ایام میں رقم کیا گیا تھا اور آج پوری رسالے کی کتابت شدہ کاپیوں کو پریس بھجوانا تھا کہ علی الصبح ہی کوئی چھ بجے ہی میرے دوست اے ٹی چوہدری جو ایک زمانے میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اور آج کل اسلام آباد سے شائع ہونے والے متوقع انگریزی روزنامے "مسلم" کے نامزد مدیر ہیں نے ٹیلیفون کیا اور یہ وحشت ناک خبر سنائی کہ رات تین بجے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور نعش لاڑکانہ روانہ کر دی گئی ہے۔

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

یا پھر داغؔ کا شعر بھی حسب حال ہی ہے

وہ جاتے ہیں آتی ہے قیامت کی سحر آج
روتا ہے دعاؤں سے گلے مل کے اثر آج

یہ درست ہے کہ بھٹو سے متعلق یہ تجزیہ اس وقت رقم کیا گیا تھا۔ جب وہ زندہ تھا لیکن اس وقت بھی موت کا سایہ اس پر پڑ رہا تھا، لیکن آج جب وہ ہم میں نہیں ہے تو اس وقت بھی یہ تجزیہ بہت حد تک درست ہے، اس میں اس کو جوں کا توں دے رہا ہوں" فقط اتنی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پاکستان جس بحران سے دوچار ہے۔ بھٹو کی موت سے اس بحران کو اور گہرا کر دیا ہے اور اب یہ بحران ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے، وہ دور جو پہلے سے زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہو سکتا ہے اور جو لوگ اور قائدین یہ سمجھتے ہیں کہ "بھٹو کی پھانسی کے بعد غیر یقینی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور ساری قوم راہِ راست پر آجائے گی" (میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی، نوائے وقت ۴ر اپریل ۷۹ء) غلطی پر ہیں' اور کون جانے کہ "شہید بھٹو، زندہ بھٹو سے کہیں زیادہ "خطرناک" ثابت نہیں ہو گا، بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس پر ابھی بہت دنوں تک تجزیہ نگار دفتر کے دفتر رقم کریں گے، کیونکہ پچھلے دو سال قبل جس میں بیٹھ کر بھٹو نے جس عمل کو صرف جاری و ساری ہی نہیں رکھا۔ بلکہ تیز کیا ہے اس کی شہادت اس عمل کو تیز تر کر دی گی، کیونکہ

ابتدا میں جنہیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسن بیاں تک پہنچے

عبداللہ ملک

عبداللہ ملک

اے محتسبو دادِ وفا کیوں نہیں دیتے!

۱۹۷۸ء کا سال ایک طرح سے پاکستان میں بھٹو کا سال رہا ہے اور بھٹو کے دوست و دشمن، حامی و مخالف دونوں کے لبوں پر ایک ہی موضوع تھا اور وہ بھٹو، غریب سے لیکر امیر تک سبھی ایک نہ ایک انداز سے بھٹو کا نام لیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے اور لطف یہ ہے کہ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور بھٹو جو آج پابند سلاسل ہے، جو پھانسی کوٹھری میں بند ہے، جو موت کی گھڑیاں گن رہا ہے وہ آج بھی پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں خبر کا اہم موضوع ہے، وہ پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے شاید اتنی بڑی خبر اور شہ سرخی کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا جتنا وہ آج سمجھا جا رہا ہے۔ شاذ ہی کوئی شخص اس ملک میں محبتوں اور نفرتوں کا اتنا جاندار مظہر بنا ہو۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم (شاد عظیم آبادی)

آخر اس پورے عمل کی کوئی وجہ تو ہوگی کہ وہ بھلایا ہی نہیں جاتا۔ ایک طرف اس کے مظالم کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، قرطاس ابیض شائع ہوتے ہیں، اخبارات، ریڈیو، ٹیلیویژن اس کی کردار کشی پر دن اور رات ایک کیے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھٹو ہے کہ "مرنے" کا نام ہی نہیں لیتا، وہ پھر بھی زندہ ہے، وہ پھر بھی لاکھوں کروڑوں کا محبوب ٹھہرتا ہے۔

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ آج اس پوری صورت حال جسے ان وجوہات اور سماجی عمل کو جنم دیا تھا کو لوگوں کی یادوں سے مٹانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے لیکن یہ صورت حال اور یہ وجوہات ہیں کہ مٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں، جتنا ان کو مٹایا جاتا ہے اتنے ہی ان کے نقوش اور ابھر آتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ سماجی تبدیلیوں کے عمل کا جادو ہی ایسا ہوتا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جس بھٹو نے ان سماجی تبدیلیوں کے عمل کو تیز کیا تھا روٹی، کپڑے اور مکان کا نعرہ لگا کر پاکستان کے بسنے والے کروڑوں مزدوروں، کسانوں، غریبوں، مظلوموں اور مجبوروں کے سینے میں امید کی جوت جگائی تھی اور ان امیدوں اور خوابوں کی تعبیر کا وہ خود مظہر بنا تھا۔ اسی بھٹو نے خود بھی ان کو فراموش کرنے کی ہزار کوشش کی، اس نے لاکھ جتن کیے کہ سماجی تبدیلیوں کے اس جادو سے اس کا دامن چھوٹ جائے لیکن یہ جادو اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ اس نے سماجی تبدیلی کے عمل کی اس زنجیر کو جھٹکنا چاہا

تو وہ جھٹکی تو نہ جا سکی البتہ اسے خود کو پابجولاں کر دیا، اور کوٹ لکھپت جیل اور پنڈی جیل کی پھانسی کوٹھری اُس کا مقدر بنی ۔

تمہیں آہیں سننے کا شوق تھا مگر اب بتاؤ کرد گے کیے
جو کراہتا تھا تمام شب وہ مریض جوش تو مر گیا

یہ سب کیوں ہوا؟ یہ بہت ہی طویل داستان ہے اور اس مضمون میں میرا مقصد اس طویل داستان کو بیان کرنا ہے اور نہ ہی اس داستان کے نتائج و عواقب کا تجزیہ ہی مقصود ہے کیونکہ یہ داستان ایسی ہے جس میں بعض بہت ہی سخت مقام آتے ہیں اور اس کے بیان سے زبان جلتی ہے۔ اور ان کے رقم کرنے سے ہاتھ کانپتے ہیں اور مجھ حقیر فقیر میں یہ یارا کہاں ۔

کوئی ان کو سمجھ بھی لے تو پھر سمجھا نہیں سکتا
جو اس حد پر پہنچ جاتا ہے وہ خاموش رہتا ہے

لیکن اس کے باوجود داستان دل چسپ ضرور ہے اور ۵ جولائی ۷۷ء کے بعد ہی تو اس داستان کے کئی ایک پہلو نمایاں ہوئے ہیں لیکن یہ داستان سے زیادہ شطرنج کا کھیل ہے اور مجھے بساطِ سیاست پر کھیلی جانے والی شطرنج سے ہمیشہ ہی بے پناہ دلچسپی اور لگاؤ رہا ہے اور آج جب دو شاطر آمنے سامنے بساط بچھائے بیٹھے ہیں تو میں ان کے کھیل ان کی چالوں اور ان چالوں کے دوررس نتائج کا اندازہ لگا کر داد دے رہا ہوں اور اسی داد میں پڑھنے والوں کو شریک کر رہا ہوں، ۔۔

شطرنج کا یہ کھیل اس لئے بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اب تک سیاست کی شطرنج کی بساط پر ذوالفقار علی بھٹو کا طوطی بولتا تھا، اس کی مہارت کے چرچے ہوتے تھے اور چار دانگ عالم اس کے کھیل کی تعریف ہوتی تھی بلکہ وہ خود بھی یہ کہتا سنائی دیتا تھا کہ وہ پیادہ سے شہ مات دینے والا شاطر ہے۔ لیکن اس کے مخالفین کا کہنا تھا کہ یہ بھی کوئی مہارت ہے یہ بھی کوئی کھلاڑی ہے کہ اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھ کر نہتے مخالفوں کو مات پہ مات دے رہا ہے، فیڈرل سیکورٹی پولیس اور اس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کی مدد سے پیادہ بڑھانا اور اس سے پورے کھیل کو درہم برہم کر دینا بھی کوئی بہادری ہے، کوئی مہارت ہے، کوئی کھیل ہے اور یہ مخالفین بڑی طمطراق سے کہتے تھے کہ "صرف آپ کا کام پولنگ بوتھ پر جانا ہے۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دیجئے" ۔

روبرو غیروں کے شکوہ آپ کا ہم کیا کریں
ہو رہیں گی پھر کبھی باتیں ہماری آپ کی

چنانچہ آج پھر اس وقت یہ بساط بچھی ہوئی ہے، اس وقت یہ شطرنج کے مہرے ترتیب پاتے ہیں، آج اُس وقت کھیل کھیلا جا رہا ہے جب ذوالفقار علی بھٹو اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان نہیں ہے، نہ ہی فیڈرل سیکورٹی پولیس اس کی پشت پر کھڑی ہے اور نہ ہی مسعود محمود کی خدمات اس کو حاصل ہیں۔ بلکہ یہ شطرنج کا کھیل تو اب ذوالفقار علی بھٹو اس وقت کھیل رہا ہے جب وہ پابجولاں ہے۔ جب وہ جیل کی کال کوٹھڑی میں بند ہے، جب موت کا سایہ اس پر پڑ رہا ہے تو وہ کھیل کھیل رہا ہے، اور سچ یہ ہے کہ جس انداز سے دونوں طرف سے کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور پُرلطف بھی، یہ درست ہے کہ آج اس کھیل میں مسعود محمود کی خدمات، اقتدار کا پورا چھتر ذوالفقار علی

بھٹو کے مخالف کھلاڑی جنرل ضیاء الحق کو حاصل ہے لیکن جنرل ضیاء الحق نے کبھی مہارت کا دعوے نہیں کیا تھا اس لئے جب یہ فوجی وردی میں ملبوس سیاست کی شطرنج کے کھیل سے بالکل ناواقف اچھی چال چلتا ہے اور زیرک شاطر کی چال کو روک لیتا ہے تو اس کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کی پشت پر بے پناہ شمشیر اقتدار اور اسلام کا نعرہ سبھی کچھ ہے لیکن اس کے باوجود کھیل کھیل ہوتا ہے جب بھی کوئی ماہرانہ چال چلے تو اس کو داد نہ دینا بخیلی ہے ؎

اپنی ہشیاریوں پر ناز کیا — غیر کی سادگی پسند آئی

بہرحال یہ شطرنج، یہ سیاست، یہ پورا کھیل بڑے انہماک سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس میں ہر تقریر، جنرل اور اس کے وزیروں امیروں کا ہر بیان، ہر پکڑ دھکڑ ادھر اُدھر بھٹو کی طرف سے ہائیکورٹ، سپریم کورٹ کے سامنے ہر درخواست، عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنے کا ہر طریقہ اس کھیل کے مہرے ہیں اور آج ایک عالم اس کھیل کا تماشہ کر رہا ہے۔ اس میں کوئی جیتے کوئی ہارے بہرحال ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بات ثابت کر دی ہے کہ وہ اقتدار کے بغیر بھی "فوجداری مقدمہ اور وہ بھی" "مقدمہ قتل" میں ملوث ہو کر بھی کھیل کھیل سکتا ہے اور وہ دو سال سے بیاڑے سے فرعنی کو روکے ہوئے ہے —

اے محتسبو! داد دغا کیوں نہیں دیتے۔

پانسہ پلٹتا ہے

یہ ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب تھی۔ بظاہر یہ شب معمول کی شب تھی۔ وہی شب جس میں ہجر کی گھاتیں بھی ہوتی ہیں اور وصل کی باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ شب معمول کی شب نہ تھی۔ اس شب کو نہ تو ہجر یار میں کروٹیں لینے والے کسی عاشق کی آہیں سنائی دے رہی تھیں اور نہ ہی کسی کے شانوں پر یار کی زلفوں کے بکھرنے کا پتہ چل رہا تھا۔ یہ شب ان سب دھندوں سے بے نیاز دکھائی دیتی تھی۔ اس شب صرف جنگلی درندوں کے غرانے کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ یہ شب خون کے لئے وقف تھی اور جب نصف شب کو اس خاموش اور منصوبے کے تحت ترتیب دیئے گئے شب خون نے ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کو چاروں شانے چت کر دیا تو صبحدم ایک ہو کا عالم تھا۔ لوگ سکتے میں آ گئے گو بعض حلقوں میں اس شب خون کے چرچے بہت پہلے سے شروع ہو چکے ہو گئے تھے اور دراصل سیاست کی شطرنج میں فوج اسی دن شہ کو مات دینے والا پیادہ بن گئی تھی جس دن ذوالفقار علی بھٹو نے تین شہر ان کے حوالے کئے تھے اور پھر فوج کے تین سربراہوں سے حکومت کے حق اور تائید میں ایک طویل بیان دلوایا تھا۔ اس لئے جب پرائم منسٹر ہاؤس میں مذاکرات کی آنکھ مچولی کھیل جا رہی تھی اور تصفیہ قریب ہوتے ہوتے بھی دور ہو رہا تھا تو فوج کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا اور اس ملک کا ہر ذی ہوش دم سادھے شب خون کے ڈر سے سہما پڑا تھا۔ آخر یہ المیہ اس شب رونما ہو ہی گیا۔ بظاہر یہ شب خون نہایت کامیاب رہا، اس موقعہ پر نہ کوئی مزاحمت ہوئی، نہ کوئی خون بہا، نہ کوئی گولی چلی نہ کوئی گھاگل ہوا۔ لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے ہیں، جیسے پوری قوم دشمن کی گولہ باری سے جھلس گئی ہے، جیسے سب کچھ تہس نہس ہو گیا ہے اور چاروں طرف واویلا مچنے والا ہے، دو بہت بیچ باقاعدہ منظم طریقے سے جشن منانے، حلوے تقسیم کرنے اور "مبارک سلامت" کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بہرحال

اس بساط کا یہی حال تھا۔

وہی سپاہِ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیب شہر بھی ہے

اس طرح سے ایک دور ختم ہوا، اس دور کے خاتمے کی وجوہات پر دفتر کے دفتر لکھے جائیں گے، آج جو بھی کچھ لکھا جا رہا ہے، جو بھی وجوہات بیان ہو رہی ہیں وہ صرف تصویر کا ایک رُخ بھی نہیں ہیں، وہ وجوہات کا ایک ادنیٰ سا حصہ بھی نہیں ہیں اور ان میں سچ کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں ہے یہ سب فوری طور پر بازی جیتنے کے لئے کیا جا رہا ہے، جس وقت سیاست کی شطرنج کی یہ بازی ختم ہو گی اور اس میں کوئی بھی جیتے کوئی بھی ہارے ایک بات طے ہے کہ جب گرد بیٹھ جائے گی، جب محاذ آرائی کی فضا ذرا ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گی تو پھر یہ شمار کیا جا سکے گا کہ کیا کھویا کیا پایا اور اس تجزیہ نگاری میں دفتر کے دفتر سیاہ ہوں گے۔

مختصر یہ کہ دل گیا اپنا
ورنہ یہ داستاں ہے طولانی

ہنگاموں میں، محاذ آرائی کی فضا میں، جب جذبات مرتعش ہوں، جب اخبارات عوامی دباؤ میں ہوں، جب حاکموں کی وزارتوں کے تقاضے سچ کو دبانے میں مصروف ہوں تو اس سمے نہ تو صحیح تجزیہ ہو سکتا ہے، نہ ہی واقعات کی صحیح چھان پھٹک ہو سکتی ہے کیا ۱۹۶۵ء ستمبر میں جب بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جب اس سے پہلے ہم کشمیر کے مسئلے کو "زندہ" کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہے تھے تو کسی نے سچ بولا تھا؟ اور سب سے زیادہ اس سچ کو دبانے اور جھوٹ کو سچ کے طور پر پیش کرنے میں اس وقت کے حکومت پاکستان کے سیکرٹری محکمہ اطلاعات جناب الطاف گوہر پیش پیش تھے لیکن آج تیرہ برس بعد وہ خود اپنے قلم سے لکھتے ہیں۔

"۱۹۶۵ء کی جنگ دراصل بھٹو کی جنگ تھی وہ اگرچہ جنگ سے قبل تمام اقدامات کی منصوبہ بندی نہیں کر سکے لیکن انہیں یقیناً واقعات اور صورت حال پر فیصلہ کن کنٹرول حاصل تھا، انہوں نے ہی ایوب خاں کو فوجی کارروائی کی ترغیب دی جسے فوجی کوڈ میں کشمیر میں فوجی کارروائی کو آپریشن جبرالٹر کا نام دیا گیا اور نقطہ پیش رفت میں تباہی مضمر تھی اور صرف ایک چھوٹی سی کارروائی کی خواہش نے مکمل جنگ کا روپ دھار لیا اور اس بزعم خود ذہین وزیر خارجہ نے ملک کو ایک ناقابل واپسی صورت حال سے دوچار کر دیا۔ بھارت نے منہ توڑ جواب دیا اور پاکستان کا حملہ ناکام بنا دیا گیا۔ اس وقت بھٹو چند منٹ تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے، ان کے آنسو بہہ نکلے اور پھر انہوں نے باآواز بلند کہا "میرا سیاسی مستقبل تباہ ہو گیا ہے ___"

لیکن اس کے باوجود جنگ کس نے ہاری؟ بھٹو نے نہیں کیونکہ اس کے فوراً بعد وہ سلامتی کونسل میں بیٹھے بھارت کو ہدف بنائے ہوئے تھے۔ فوجی جرنیلوں پر بھی جنگ میں شکست کا الزام نہیں آیا کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے سیکٹروں میں شاندار کامیابیوں کے تصوراتی افسانے سنا رہا تھا اور ان لوگوں کے بقول پاکستانی فوج کی ہر کمپنی نے بھارت کی پوری پوری بریگیڈ کا صفایا کر دیا تھا۔"

اس لیے آج کی فضا میں بھی جب جذبات مرتعش ہیں جب محاذ آرائی کے سائے چاروں طرف پڑ رہے ہیں جب مختلف طبقات متصادم ہو رہے ہیں، جب درِ زنداں وا ہے تو پھر کھل کر نہ تو تجزیہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی صورتِ حال پر کھل کر لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ کوشش کر رہا ہوں کیونکہ متصادم سیاسی فضا میں سچائی کسی ایک طرف نہیں ہوتی، بلکہ یہ جذبات کا ارتعاش، یہ محاذ آرائی کی فضا کسی ایک وجہ کا نتیجہ نہیں ہوتے ہیں، اور نہ "نوائے وقت" سچ کا مظہر ہوتا ہے نہ "مساوات"، دونوں اپنے اپنے مقصد کی خبروں کو شہ سرخیاں بناتے ہیں اور دونوں ہی مخالف خبروں کو کونے کھدروں میں ڈال دیتے ہیں اور کون جانے کہ جب گرد بیٹھ جائے گی تو پھر ان کو گرد جھاڑنے اور "سچ" کو اجاگر کرنا پڑے گا۔ آج جب الطاف گوہر جو کل اس "سچ" کو دبا رہے تھے آج اس کو جب "بے نقاب" کر رہے ہیں تو وہ بھی کسی ضرورت کے تقاضوں کو پورا تو نہیں کر رہے اور یہ تقاضے وہی ہیں کہ عالمی رائے عامہ کو بھٹو کے مخالف کیا جائے اور جو چاروانگ رحم کی اپیلیں کی جا رہی ہیں اس کے دباؤ کی مزاحمت کی جا سکے، آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ مارشل لا حکومت کے وزیر قانون مسٹر اے کے بروہی اس مقدمہ کے بارے میں اپنی قانونی توجیہات کا اظہار اسلام آباد لاہور یا کراچی میں کسی پریس کانفرنس میں نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے بھی وہ لندن کو ہی منتخب کرتے ہیں، مقصد وہی عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ آخر یہ بھی تو قابلِ غور ہے کہ ایک طرف بھٹو کے صاحبزادے ایران کے نئے رہنما آیت اللہ خمینی کے پاس جاتے ہیں اور دوسری طرف حکومت پاکستان اخباری نمائندوں کے وفد کو ایران کا دورہ کرنے کے لئے بھیجتے ہیں اور اس طرح سے بساطِ سیاست پر ہم سب شعوری اور غیر شعوری مہروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن ہر مہرہ اپنے اپنے انداز میں پاکستان اور ایک لحاظ سے پوری دنیا میں رونما ہونے والے سماجی عمل میں اپنے اپنے طبقے کے حق میں کردار ادا کر رہا ہے اور میری یہ سطور بھی اسی سماجی عمل کا ایک حصہ ہیں۔ ہاں تو اس پس منظر میں اس کھیل کو دیکھنا چاہیے"۔

مارشل لاء

اب تک سیاست کی شطرنج میں فوج ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ کی چھڑی تھی، اس کی پشت پناہ تھی، بہر حال ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت مسلسل اس امر کا زبانی اور تحریری، ذرائع ابلاغ اور کانا پھوسی کے ذریعے ہر طرف سے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ فوج ان کی آئینی حکومت کی وفادار ہے، لیکن دوسری طرف PNA بھی مسلسل اس کے خلاف پراپیگنڈہ کر رہی تھی اور اُٹھتے بیٹھتے اس طرف اشارہ کر رہے تھے کہ بالآخر عوامی دباؤ فوج کو دوسری طرف دیکھنے پر مجبور کر دے گا۔ اور لوگوں کو اس فضا میں اصغر خاں کا یہ دعوے کہ "آپ کا کام پولنگ بوتھ پر جانا ہے باقی سب مجھ پر چھوڑ دیجیے"۔ بہت ذو معنی ہو جاتا تھا، چنانچہ انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف مہم اور عوامی ردِ عمل کو جس انداز سے منظم کیا گیا، جس انداز سے اس کا اظہار ہوا اور جس انداز سے عوام کے جذبات بجا طور پر برانگیختہ ہوئے اور اس زبردست مہم اور ایجی ٹیشن میں لوگوں نے گولیاں کھائیں، جام شہادت پیا وہ اپنے طور پر ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور یہ الگ سے ایک داستان کا عنوان ہے لیکن اس سب عوامی دباؤ کا مقصد کیا تھا کہ اب تک ذوالفقار علی بھٹو جو اس ملک میں STREET FORCE عوامی دباؤ کا بادشاہ متصور ہوتا تھا اور اس عوامی دباؤ سے اس نے اپنے تمام حریفوں کو چاروں شانے چت کر دیا تھا حتیٰ کہ اسی عوامی دباؤ اور اپنی مقبولیت کے کرشمے سے اگر اس نے ۱۹۷۰ء میں انتخابات جیتے تھے تو دوسری طرف اس نے اپنی اپنی مقبولیت اور عوامی دباؤ سے فوج کو بھی مرعوب کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کے

انتخابات کے بعد "دھاندلیوں" کے خلاف مہم کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایک عالم کو یہ باور کرا دیا جائے کہ
اولاً پیپلز پارٹی اپنی مقبولیت کھو بیٹھی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ STREET FORCE اس کے ساتھ نہیں ہے بلکہ PNA کے ساتھ ہے۔

دوم اس لئے انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے کہ بھٹو اپنی مقبولیت کھو بیٹھا ہے اور اب وہ سٹریٹ فورس کو میدانِ کارزار میں اتارنے کے قابل نہیں ہے۔

سوم یہی عوامی دباؤ، یہ ایجی ٹیشن، یہ سینوں پر گولیاں کھانی، یہ عورتوں کی طرف سے مزاحمت سب اسی لئے تھیں کہ ان مظاہروں، ان جلوسوں، ان جلسوں، اس ۱۴۴ شکنی سے جو گرد "اٹھے" اس میں فوج کو اپنی وفاداریاں بدلنے کا جواز مہیا ہو۔ اور ساتھ ہی دنیا کو دکھایا جا سکے کہ آج سٹریٹ فورس بھٹو مخالف صفوں میں کھڑی ہے۔

چہارم :- مذاکرات میں بھی جو طوالت ہوئی اس کے متعلق مذاکرات میں شرکا کے علاوہ پشت پر چالیں بتانے والوں کا یہی منصوبہ تھا کہ یہ طوالت بالآخر رنگ لائے گی۔

بی بی سی کا رول ،

پنجم :- بی بی سی جس انداز میں یہ مہم چلا رہا تھا اور جس طرح سے وہ پی این اے کا دسواں ستارہ کہلا رہا تھا اس سے بہت سے لوگوں کا ماتھا ٹھنکتا تھا، یہاں میں عربوں کی ایک سیاسی کہاوت بیان کر دوں تو پوری بات سمجھ میں آ جائے گی، دوسری جنگ عظیم کے بعد جب پاکستان قائم ہو گیا تھا اور مشرق وسطیٰ میں ابھی برطانوی سامراج کا طوطی بولتا تھا تو عراق کے وزیر اعظم نوری سعید پاشا جو بڑے زیرک سیاست دان تھے لیکن برطانوی سامراج کے زبردست حامی اور مددگار اور ان کی سیاست کے اہم مہرہ ثابت ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے متعلق یہ کہا جاتا تھا "برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو جاننا ہو تو نوری سعید پاشا کی حرکات پر نگاہ رکھو۔" سو اس لئے جب بھی کسی خطے میں سامراج کی حرکات کو جاننا ہو تو بی بی سی پر نگاہ رکھی جانی چاہیئے آخر کوئی تو وجہ ہو گی کہ پی این اے کے زعما کل اس وقت تک کوئی پریس کانفرنس نہ شروع کرتے تھے جب بی بی سی کا نمائندہ نہ پہنچ جائے اور مارک ٹیلی تو پی این اے سے بھی زیادہ محبوب لیڈر تھا۔
لیکن آج یہی بی بی سی پھر گردن زدنی ٹھہر رہا ہے کیونکہ وہ کسی حد تک بھٹو کے حق میں مہم چلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ پنجابی ججوں نے بھٹو کو پھانسی کے حق میں اور غیر پنجابی ججوں نے پھانسی کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بی بی سی کی طرف سے اتنی دل چسپی صرف حقائق کو بیان کرنا نہیں ہے اور نہ ہی یہ آزادی اظہار ہے۔ کل جب بی بی سی بھٹو کے خلاف مہم چلا رہا تھا اور آج جب اس کے حق میں مہم چلا رہا ہے تو نہ وہ کل پی این اے کا دوست تھا اور نہ ہی بھٹو کا دشمن اور نہ آج وہ جنرل ضیاء کا دشمن ہے اور بھٹو کا دوست ہے بلکہ مقصد صرف ایک ہے کہ اس خطے میں عدم استحکام کی فضا پیدا ہو، سامراج کو آج بالخصوص ایران کے بعد اس خطے میں عدم استحکام کی اشد ضرورت ہے یہ الگ بات ہے کہ عدم استحکام کی یہ فضا سامراج کا کھیل ہی بگاڑ دے لیکن سامراج بنیادی طور پر اندھا ہوتا ہے وہ "یک رخا" ہوتا ہے، اس کی پالیسی اس کے اپنے طبقاتی مفاد کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ مخالف قوتوں کی صلاحیتوں اور مزاحمتوں کا اندازہ ہی نہیں کر پاتا۔

ابن الوقت قیادت کا المیہ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قیادت کا المیہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مقبولیت کے لئے "روٹی کپڑے مکان" کا نعرہ ضرور لگاتی ہے لیکن روٹی کپڑے مکان کے لئے سب طبقات کی جنگ تیز ہونے لگتی ہے تو یہی قیادت پسپا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور فیصلہ کن موڑ پر وہ آگے بڑھنے کی بجائے آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی ہے لیکن وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور تاریخ کا یہ موڑ ہوتا ہے جب تمام ذہانت، تمام فطانت اور خطابت کی تمام صلاحیتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے "روٹی کپڑا مکان" کے نعرے سے غریبوں کو، بے لبسوں کو اور مظلوم ترین طبقوں کو شعور بخشا اور اسی شعور کے سہارے اس نے بے مثال سٹریٹ فورس کو جنم دیا اور اسی سٹریٹ فورس کے سہارے وہ اقتدار کی مسند پر پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اقتدار کے ان تمام سالوں میں اس نے بنک ضرور سرکاری قبضے میں لیئے، کلیدی صنعتوں کو بھی اپنی سرکار کے حوالے کیا۔ زرعی اصلاحات بھی کیں، مزدوروں کے حق میں قوانین بھی بنائے، ان اقدامات نے اسے مزدوروں، کسانوں اور غریبوں میں محبوب بھی بنایا لیکن گھپلا کہاں ہوا اور ایک گھپلا ہو تو اس کا ذکر بھی کیا جائے۔

مثال کے طور پر جب آپ بنک نجی ملکیت سے لے کر سرکاری ملکیت میں لے لیتے ہیں یا کلیدی صنعتوں پر نجی ملکیت ختم کر دیتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے کہ آپ نے سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ کو للکارا ہے، اس سے کھلی جنگ کا اعلان کیا ہے۔ اب زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ وہ طبقہ ہے جو اب تک براہ راست حکومت کرتا رہا ہے، جس کے پنجے مملکت کے پورے ڈھانچے میں گہرے گڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تمام افسر فوجی یا سول ان کا تعلق انہی اوپری طبقوں سے ہوتا ہے اب اسی فوج اور اسی افسر شاہی کے بل پر آپ کیسے ان کے مربیٔ، ان کے رشتے دار، ان کے اعزہ و اقارب طبقوں کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں، آپ ان اوپری طبقوں کو لاکھ ان کی املاک سے محروم کر دیں۔ وہ پھر بھی بااثر رہتے ہیں چنانچہ اس صورت حال کے متعلق سوویت روس کے ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد لینن نے لکھا تھا۔

"ہر انقلاب کا بنیادی سوال اقتدار کا مسئلہ ہے لیکن کیا اس سے یہ مراد لی جائے کہ اقتدار پر قبضہ کر لینا ہی کافی ہے؟ یعنی اقتدار کا چھین لینا محض ابتدا ہے، وہ سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ جسے کسی ملک میں اقتدار سے بے دخل کیا جاتا ہے کئی وجوہ سے دیر تک اقتدار سے بے دخل کرنے والے محنت کش طبقہ کے مقابلے میں طاقتور رہتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ محنت کشوں کے انقلاب کو نہ صرف برقرار رکھا جائے بلکہ اس انقلاب کو مستحکم اور ناقابل شکست بنایا جائے لیکن یہ مقاصد کیسے اور کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔

- زمیندار اور سرمایہ دار طبقوں جن سے انقلاب کے ذریعے اقتدار چھینا گیا ہے، اتنا بے بس کر دیا جائے اور کچل دیا جائے کہ وہ پھر سے سرمایہ داری اور زمینداری نظام کو بحال کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں۔
- تعمیر و ترقی کے منصوبوں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ عوام طبقات کو ختم کرنے کے لئے محنت کشوں اور مزدور طبقہ کے دوش بدوش صف آرا ہو جائیں۔
- سامراج اور دیگر بیرونی دشمنوں کے خلاف انقلابی جدوجہد کو زیادہ سے زیادہ منظم کیا جائے اور اس

کے لیے ایک صحیح معنوں میں انقلابی فوج کو تربیت دی جائے اور اس کو جدید اسلحہ سے لیس کیا جائے۔

یہ سطور جب لکھی جا رہی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے عوام، مزدور، کسان، ریڑھی والے، چھابڑی فروش رکشا والے، یہ سب وہ لوگ ہیں جن کو اپنے تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کس طرح سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ان کے گماشتوں پر بروقت قابو نہ پایا جائے اور ان کی مزاحمت ختم نہ کی جائے تو وہ کس طرح انتقام لیتے ہیں اور یہ سب کچھ کیا دھرا ہوتا ہے۔ ایک ایسی قیادت کا جو زبان سے سوشلزم کا نعرہ لگاتی ہے لیکن عملاً وہ اوپری طبقے کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دوغلاپن، یہ نیم دلانہ اصلاحات، یہ فریب دینے والے سوشلزم کے نعرے خود اس قیادت کے اپنے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں اگر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سماجی تبدیلیوں میں دیانتدار ہوتے تو وہ اپنی جماعت کو ان تبدیلیوں کے لیے منظم کرتے۔ نوکر شاہی پر تکیہ کرنے کی بجائے کلیدی آسامیوں پر اپنی ذات کے وفادار نہیں بلکہ محنت کشوں کے اقتدار کے وفادار لوگوں کو فائز کرتے، فوج جو بذاتِ خود ایک مفاداتی گروہ بن گیا ہوا ہے اس میں تبدیلیاں لاتے لیکن مسٹر بھٹو نے ان میں سے کوئی اقدام نہیں کیا اور ساتھ ہی سطحی قسم کی سماجی تبدیلیاں لائی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دار طبقہ اپنی شکست کے بعد دس گنی قوت کے ساتھ حملہ آور ہوا اور اس کے جلو میں مولوی سے لے کر وکیل، جج، ڈاکٹر سبھی سڑکوں پر نکل آئے اور مسٹر بھٹو اپنی تمام ذہانت کے باوجود دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور کل کا پرائم منسٹر ہاؤس کا باسی پابجولاں کوٹ لکھپت جیل میں پہنچا دیا گیا، ۱۹۱۷ء میں یہ سبق شاید اتنا واضح نہ ہو لیکن آج دیس دیس میں جو سماجی تبدیلیوں کے لیے جدوجہد ہو رہی ہے اس میں تو یہ سبق بہت ہی نمایاں ہوتا چلا جا رہا ہے چنانچہ آج عالم یہ ہے کہ مسٹر بھٹو کی بری بھلی اصلاحات بھی سرمایہ دار طبقہ کو منظور نہیں، دیکھتے ہی دیکھتے جو کارخانے قومی ملکیت میں لیے گئے تھے ان کو واپس کیا جا رہا ہے اور نجی مالک پھر سے مزدوروں کو چھانٹی کر رہے ہیں، دھاندلی شروع ہو گئی ہے، آٹے میں ملاوٹ پھر سے ہونے لگی ہے، کپاس کو مقررہ قیمت پر خریدنے سے گریز کیا جا رہا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوا کہ سرمایہ دار طبقہ جب نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگاتا تھا تو اس کا مقصد نجی ملکیت کا احیا ہوتا تھا، اس کا مطلب اپنی آٹے کی مل واپس لینا تھا، اس کا مقصد مزدور کو بے روزگار کرنے کے حق کا حصول تھا۔ کل ذوالفقار علی بھٹو نے کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے کر ان کے راشی بددیانت افسروں کے حوالے کر کے قومی ملکیت اور سوشلزم کے خلاف فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور آج یہ سرمایہ دار اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کارخانوں کو واپس لے کر اپنے منافعوں، اپنی لوٹ کھسوٹ کو برقرار رکھنے کے جتن کر رہے ہیں اور موجودہ مارشل لاء کے یہ اقدام ہی بھٹو کی مقبولیت اور اس مقبولیت کی احیاء کی اصل اساس ہیں

نظام مصطفیٰ کا طبقاتی کردار

آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ جنرل ضیاء ۱۲ ربیع الاوّل کو اپنے معرکۃ الآرا اعلان میں جہاں نظام مصطفیٰ کے سلسلے میں مختلف اقدامات کا اعلان کرتے ہیں۔ وہیں یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ سے کوئی مل، کوئی کارخانہ قومی ملکیت میں نہیں لیا جائے گا اور اس سلسلے میں باقاعدہ آئین میں ضمانت دی جائے گی۔ گویا کہ نجی ملکیت کو بھی نظام مصطفیٰ کی مقدس لبادہ اڑھا دیا گیا، آخر کیوں؟ صرف یہی نہیں ہم اٹھتے بیٹھتے سعودی عرب کا حوالہ دینے لگے ہیں، لیبیا، عراق، شام اور الجزائر کے اسلام کا ہم حوالہ کیوں نہیں دیتے؟ جنوبی یمن سے ہم کیوں بدکتے ہیں، ایران کا اسلامی انقلاب تیل کی تقسیم کا پورا

کام جو شہنشاہ نے مغربی تیل کمپنیوں کے سپرد کیا ہوا تھا ان سے واپس لینے کا اعلان کر رہا ہے اور اب قومی کمپنی یہ کام کیا کرے گی لیکن ہم ہیں کہ تیل کی کھدائی کے پورے ٹھیکے انہی مغربی تیل کمپنیوں کے سپرد کر رہے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ اقدام مسٹر بھٹو کے زمانے سے ہی شروع ہو گئے تھے تو پھر مسٹر بھٹو اور جنرل ضیا کی اسلامی حکومت میں مغرب سے دوستی، مغربی تیل کمپنیوں کی اجارہ داری کو تسلیم کرنا یہ قدرے مشترک ٹھہری، لیکن ہم یہ کیوں فراموش کر دیتے کہ مسٹر بھٹو کی ان کوتاہیوں کو تاریخ نے نہیں بخشا تو کل کو تاریخ مہربان کیوں ہو گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے طبقاتی کشمکش تیز سے تیز ہو رہی ہے ویسے ہی خود وہ طاقتیں بھی جو کل تک بھٹو کے مخالف صفوں میں کھڑی تھیں ان کو بھی آج اس کے روٹی کپڑے مکان کے نعرے کی اہمیت کا احساس ہونے لگا ہے اور وہ بھی آج اسلام کے نعرے کو غریب کے اسلام اور امیر کے اسلام میں تقسیم کر رہے ہیں۔ آج ائیر مارشل اصغر خاں ہوں یا خود ولی خاں اور ان کی بیگم ہوں وہ اب بھٹو کی مقبولیت کے سامنے سپر ڈالتے نظر آتے ہیں اور اب بھٹو کو گالی دینے کی بجائے غریبوں اور ان کی زبوں حالی کا رونا رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ خالی نظام مصطفیٰ کے نعرے کام نہیں آسکتے جب تک کہ عوام کے مسائل حل نہ کئے جائیں۔ لیکن کل مسٹر بھٹو بھی اس طبقاتی کشمکش کے عمل کی شدت کو محسوس نہیں کر سکے تھے وہ بھی سمجھتے تھے کہ انہوں نے اس جن کو بوتل میں بند کر لیا ہے لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ چنانچہ مسٹر بھٹو کی ان تمام کوتاہیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۹۷۷ء میں رن پڑا جب اپریل، مئی اور جون ۷۷ء میں بھٹو اور ان کی حکومت کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے تو مسٹر بھٹو اپنی تمام مقبولیتوں کے باوجود اپنے حامیوں اور اس "خاموش اکثریت" کو جس نے ان کو ووٹ دیئے تھے ان کو کیوں متحرک نہیں کر سکے؟ وہ کیوں نہ ایک جلوس نکال سکے؟ وہ کیوں ایک مظاہرہ ترتیب نہ دے سکے؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسٹر بھٹو شروع دن سے صرف غیر منظم عوامی مقبولیت پر اعتقاد رکھتے تھے، وہ سٹریٹ فورس کے قائل تھے وہ جماعت کو منظم نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کو ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ جیسے ہی یہ جماعت منظم ہو گی، جب اس میں جمہوریت ہو گی اور جب وہ جدوجہد کی کٹھالی سے کندن بن کر نکلے گی تو پھر وہ جماعت ان کی اور ان کی حکومت کی پالیسیوں پر محاسبہ بھی کرے گی اور اس طرح سے وہ ان پر آمرانہ انداز حکومت روا نہ رکھ سکیں گے اور ایک منظم طبقاتی جدوجہد ظہور میں آئے گی اور اسی سے بھٹو لرزاں و ترساں تھے۔

یہاں پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری پوری سیاست میں کبھی بھی منظم سیاسی جماعت وجود میں نہیں آئی۔ یہ ایک حقیقت ہے، گو بہت تلخ ہے لیکن ہے حقیقت اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ایک منظم جماعت کی ضرورت پڑی تو وہ غائب تھی صرف یہی نہیں بلکہ پی این اے کی تحریک کا مقابلہ کے لیے بھٹو اپنی غیر منظم سٹریٹ فورس کو بھی میدان میں اتارنے سے کتراتا رہا اور یہی گریز اس کی آخری شکست کا باعث ہوا۔ یہ گریز کلیتہً اس کی طبقاتی سوچ کا نتیجہ تھا، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ اگر مزدوروں، کسانوں، غریبوں، چھابڑی والوں، تانگہ ڈرائیوروں، کچی آبادی والوں کو وہ ایک بار میدان میں لے آیا تو پھر یہ سٹریٹ فورس اس کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ بلکہ وہ خود اپنا راستہ متعین کرے گی اور یہ مجبور و مقہور عوام پھر خود اپنے قائد چن لیں گے اور خود اپنے داؤ پیچ ترتیب دینے میں مصروف ہو جائیں گے اور اس طرح سے یہ ایک طبقاتی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی اور اس "طبقاتی جنگ" سے وہ لرزاں و ترساں ہو رہا تھا چنانچہ اس نے بجائے اس،

سکے کہ وہ اعلان کرتا کہ زمین اس کی ہے جو اس پہ ہل چلاتا ہے، کارخانے کی انتظامیہ میں مزدوروں کا حصہ ہے، کرائے داروں کو سہولتیں دیتا۔ سینٹو کو خیرباد کہتا اور عالمی سطح پہ وہ دوستوں کو پہچانتا لیکن اس کی بجائے کیا اعلان کرتا ہے۔

پی این اے کی تحریک کا تجزیہ

۱۔ جمعہ کی چھٹی ہو گی۔

۲۔ شراب نوشی پہ پابندی۔

۳۔ گھوڑ دوڑ پر پابندی، جوئے پر پابندی، تبلینہ کلبوں پر پابندی۔

اس کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ ان اقدام سے "مولوی" کی مہم کے پاؤں تلے سے زمین کھسک جائے گی لیکن نہ ذوالفقار علی بھٹو کا یہ خیال درست ثابت ہوا اور نہ شہنشاہ ایران کی ہی یہ چال کامیاب ہوئی، بھٹو جو ذہین بھی تھا اور نسلین جس کو تاریخ پر عبور بھی تھا وہ کس طرح اپنے طبقے کے مفاد کی حفاظت کی خواہش میں اندھا ہو گیا اور پوری تاریخ بھول گیا۔ اس کو اتنی بات جانتے ہوئے بھی سمجھ نہ آسکی کہ یہ تحریک جو اس کے خلاف چلائی جا رہی ہے وہ "نظام مصطفےٰ" یا "اسلامی نظام" کے لئے نہیں بلکہ وہ توان طبقات کے مفادات کی حفاظت کے لئے تھی۔ جن کی اڑھت کو جننگ فیکٹریوں، چاول چھڑنے کی ملوں کو سرکاری تحویل میں لے کر کاروبار اور اس کے منافعوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس تحریک میں درمیانہ طبقہ بھی کھل کر بھٹو کے خلاف شامل ہو گیا تھا، اس میں ڈاکٹر بھی تھے اور وکیل بھی، پروفیسر بھی تھے اور اساتذہ بھی، اور یہ کہنا کہ یہ تحریک ایک دن میں وجود میں آگئی بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اس کے لئے لاوا بہت دنوں سے پک رہا تھا۔ کیونکہ بھٹو جس انداز سے حکومت کر رہا تھا اس کے لئے یا تو وہ عملی طور پر پاکستان کے محروم طبقوں کے لئے ٹھوس اقدام کرتا اور ان اقدام کی تائید و حمایت کے لئے ان طبقوں کو منظم کر کے اپنے پیچھے کھڑا کرتا۔ لیکن اس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے انداز حکمرانی سے ہمارا درمیانہ طبقہ پریشان ہونے لگا۔ کیونکہ ہمارے اس طبقے کی پوری تربیت برطانوی پارلیمانی نظام حکومت کی فضا میں ہوئی ہے اور قانون کی حکمرانی کے نام پر اوپر کی طبقوں کی بالادستی کو دیانت داری سے صحیح نظام حکومت سمجھتے رہے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ بھٹو نے جب آئین بنایا اور اس نے مختلف طریقوں سے صدارتی نظام کے لئے FEELERS پھینک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ صدارتی نظام کے خلاف کس قدر مزاحمت ہو گی تو اسے محسوس ہوا کہ اسمبلی میں بھاری اکثریت کے باوجود وہ صدارتی نظام کو لاگو نہیں کر سکتا چنانچہ اس کو پارلیمانی نظام حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لیکن وہ اپنی افتاد طبع کے ہاتھوں مجبور تھا کہ اس نے پارلیمانی نظام کے تمام لوازمات کو بالائے طاق رکھ کر صدارتی نظام کی حدود سے بھی نکل کر بالکل آمرانہ انداز اختیار کیا لیکن یہ آمرانہ نظام ہمارے درمیانہ طبقہ کو قبول نہیں تھا، وہ اسی صورت میں اسے قبول کر سکتے تھے۔ اگر عوامی دباؤ اور منظم طبقے اس کی حمایت میں کھڑے ہوتے لیکن بھٹو نے اپنے دور حکومت میں ان اقدام کے حق میں نہ کوئی مہم چلائی اور نہ ہی اپنی محبوب سٹریٹ فورس ہی کو استعمال کیا نتیجہ کیا ہوا کہ یہ درمیانہ طبقہ روز بروز بھٹو کے خلاف ہوتا گیا اور جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد معرکہ شروع ہوا تو یہ تمام کا تمام درمیانہ طبقہ اس کے خلاف میدان کارزار میں اتر پڑا۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہمارے جیسے ملکوں میں

حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے اس درمیانہ طبقہ کو زبردست اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ فوج اور افسر شاہی اسی طبقے کا حصہ ہوتی ہے۔

آئمہ مساجد اور موجودہ تحریک

اس کے علاوہ ایک اور طبقہ اس پوری تحریک میں بہت نمایاں رہا ہے اور وہ ہے ہمارے آئمہ مساجد، درویش، دینی مدارس کے طالب علم ان کی فوج ظفر موج اس معرکہ "حق و باطل" میں کود پڑی۔ یہ آئمہ مساجد یہ درویش یہ دینی مدارس کے طلبہ کے بارے میں ہمارے ہاں کے تجزیہ نگاروں نے کبھی اعداد و شمار اکٹھے کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم یہ تو کہتے رہے ہیں اور مسلسل کہتے ہیں کہ پڑھے لکھوں میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور یہ بیکار میٹرک یا گریجوایٹ، یا ایم اے حکومت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کو کھپانے کے لیے ہم NDVP تک کی سکیمیں شروع کرتے ہیں لیکن ان دینی مدارس کے طلبہ ان چھوٹی چھوٹی مساجد کے آئمہ، درویشوں کی فوج ظفر موج کے متعلق ہم نے نہ کبھی سوچا نہ کبھی تجزیہ کیا۔ اب تک دین سے متعلق یہ تمام گروہ غریب جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں آج تک کسی حکومت، کسی ادارے اور سوشیولوجی کے کسی تجزیہ نگار نے تحقیق نہیں کی، ورنہ حقیقت ہے کہ مولویوں، درویشوں، آئمہ مساجد اور دینی مساجد کے طلبہ کا قیام پاکستان سے پہلے بھی ہماری سیاسی اور سامراج دشمن تحریکوں میں اہم رول رہا ہے۔ مجلس احرار کی اکثر و بیشتر تحریکوں میں یہ طبقہ بہت ہی نمایاں رہا ہے۔ پھر قادیانیوں کے خلاف تحریکوں میں بھی اس گروہ کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے اور اب ۷۷ ۱۹ء میں بھٹو کے مخالف تحریک میں بھی ان آئمہ مساجد اور دینی مدارس کے طلبہ کا بہت ہی نمایاں رول رہا ہے۔

اب ان آئمہ، ان درویشوں اور دینی مدارس کے طلبہ کا معاشرتی پس منظر سامنے رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلی حقیقت جو سامنے آتی ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر و بیشتر مولوی، آئمہ مساجد، دینی مدارس کے طلبہ دور دراز کے پسماندہ اضلاع اور خطوں سے ہمیشہ متعلق رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر پنجاب کے شہروں کی مساجد کے مولویوں اور درویشوں کے بارے میں تحقیق کی جائے تو ان میں سے پچاس فیصدی سے زیادہ پسماندہ اضلاع ہزارہ وغیرہ سے آپ کو ملیں گے، اس پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا کہ یہ وہ اضلاع ہوتے ہیں جہاں روٹی کمانے اور روزگار حاصل کرنے کے ذرائع بہت ہی محدود ہوتے ہیں، بالکل اس طرح جیسے کہ فوج میں جوان اکثر و بیشتر ان اضلاع سے آتے ہیں جہاں کوئی صنعت نہیں ہوتی، جہاں زمینداری بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں پرلے دے کے روزگار کے حصول کا واحد ذریعہ فوج میں بھرتی ہونا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان پسماندہ اضلاع میں دینی مدارس کے لیے کشش بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ان مدارس میں روٹی، کتاب اور تعلیم مفت مل جاتی ہے۔

اب ان دینی مدارس کے اخراجات کے بارے میں ذرا غور کیجیے کہ یہ تمام کے تمام مدارس اہل ثروت جن میں صنعتکار زمیندار، ملازمت پیشہ اور دین سے الفت رکھنے والے تمام لوگ شامل ہیں کی خیرات، صدقات اور زکوٰۃ سے قائم و دائم ہیں۔ اب جب افراط زر، زرعی اصلاحات، صنعتوں کو سرکاری ملکیت میں لینے کا عمل شروع ہو گا اور تمام اہل ثروت پریشان ہونا شروع ہوں گے تو اس کے اثرات دینی مدارس، ان کے طلبہ پر بھی پڑیں گے اور جس طرح اہل ثروت کے لیے بھٹو قابل نفرت ٹھہرا اسی طرح سے ان دینی طلبہ کے لیئے بھی وہ دشمن ٹھہرا کیونکہ ان کو یہ محسوس

ہونے لگا کہ ان کے مدارس اُجڑ جائیں گے اور یہ ایک طرف دین پر حملہ ہوگا تو دوسری طرف ان کی دینی تعلیم بھی رک جائیگی

صرف یہی نہیں بلکہ ۱۹۷۷ء کی پوری تحریک ان تمام قصبات میں زیادہ مؤثر رہی ہے جو منڈیاں تھیں جہاں روزانہ کروڑوں روپے کی آڑھت ہوتی ہے۔ اب ایسے قصبات اور اس پورے علاقے کی مساجد، مدارس، آئمہ ہر ایک کا براہ راست واسطہ ان آڑھتیوں اور تاجروں سے تھا جب یہ آڑھتی اپنی آڑھت کو بچانے کے لئے بھٹو کی مخالف تحریک کی پشت پناہی کرنے لگے تو ان کا ان دینی حلقوں پر بھی اثر ہونا لازمی تھا۔ اور جس طرح مغرب کا پارلیمانی نظام ہمارے ہاں کے وکلا ڈاکٹروں اور مغربی تعلیم سے لیس لوگوں کو متاثر کرتا ہے؟ کیوں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی تعلیم، ان کی تربیت اس پارلیمانی نظام کا تقاضا کرتی ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ اس نظام میں ان کے روٹی، روزگار کے، ترقی کے اور خوش حال مستقبل کے مواقع بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس پورے برصغیر میں آزادی کی تحریک کی رہنمائی، مغربی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل وکلا اور بیرسٹروں نے کی، گاندھی جی۔ بیرسٹر، قائداعظم محمد علی جناح بیرسٹر، جواہر لال نہرو بیرسٹر، لیاقت علی خاں بیرسٹر۔ چنانچہ اب تک بھی ہماری تحریکوں میں وکلا پیش پیش رہے ہیں لیکن اب ۱۹۷۷ء کی تحریک جس کی ابتدا ۳۲ نکات سے ہوئی تھی، جس میں نظام مصطفےٰ کا مسئلہ درپیش نہیں تھا لیکن بالآخر نظام مصطفےٰ کا نعرہ مقبول ہوا اور نئے حاکموں کے لئے "روٹی، کپڑے، مکان" کا جواب دینے کے لئے ایک جذباتی پلیٹ فارم حاصل ہوگیا، لیکن یہ پلیٹ فارم صرف جذباتی نہیں رہا بلکہ اس نظام مصطفےٰ سے ان آئمہ مساجد، ان درویشوں اور ان دینی مدارس کے طلب کو اپنا درخشاں مستقبل نظر آرہا ہے، وہ قاضیوں کے لئے مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اب پولیس میں رپورٹ کے لئے اپنی مہر تصدیق چاہتے ہیں۔ حکومت بھی اس وقت جبکہ وہ سیاسی طور پر ایک گونہ بے یار و مددگار تھی اس کو بھی کوئی حلقہ درکار تھا جس کو وہ اپنا پائیدار اور مستحکم اور محفوظ حلقہ نیابت بنا سکے۔ چنانچہ اس وقت یہ مولوی، یہ آئمہ مساجد، یہ درویش، یہ دینی مدارس کے طلبہ اس مارشل لا حکومت کا محفوظ حلقہ نیابت ہیں۔ یہ درست ہے کہ مارشل لا حکام موجودہ وزراء اور افسر شاہی اس وقت بہت مسرور و شاداں ہیں کہ ان کو ایک محفوظ حلقہ میسر آگیا ہے لیکن یہ حلقہ جیسے جیسے اپنے وجود کو منوانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا ویسے ہی نئے تضادات بھی جنم لیں گے۔ اور پھر وہ تضادات تلوار بن کر حکومت کے سر پر لٹکنا شروع ہو جائیں گے، وہ دن دور نہیں جب مولوی اور وکیل میں ٹھنے گی۔ جب مغربی قانون پر دسترس رکھنے والے ججوں پر مشتمل شریعت بنچوں پر عدم اعتماد شروع ہوگا، جب وکلا، ان کے منشی، ان کے دلال، جج، مجسٹریٹ سبھی کو اپنی نوکریاں، اپنی اہمیت، اپنا روٹی روزگار خطرے میں پڑتا دکھائی دے گا تو پھر نئی صورت حال پیدا ہوگی، اور نظام مصطفےٰ سے بھی تشفی نہ ہوئی تو

؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

بھٹو کے خلاف ۱۹۷۷ء میں جو تحریک چلی اس میں دینی حلقوں کی شمولیت کی ایک اور اہم وجہ کوثر نیازی کے اقتدار کی ہوس بھی تھی، وہ وزارت اوقاف حج کے ذریعے دینی حلقوں کو ایک طرف CORRUPT کر کے دینی حلقوں کے مسلمہ رہنماؤں کو پریشان کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ دینی مدارس کو حکومت کی تحویل میں لئے جانے کا بھی اعلان کر رہا تھا۔ اس سے اس نے بھٹو کو تو یہ پٹی پڑھائی ہوگی کہ دینی طلبہ کی فوج ظفر موج اس کے اثر و رسوخ میں آجائے گی اور یہ جو مفتی

محمود، احمد شاہ نورانی اور جماعت اسلامی والے ہیں ان کے پاؤں تلے سے زمین کھسک جائے گی۔ لیکن دوسری طرف یہ مفتی، یہ نورانی، یہ مودودی بھی تو کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھے وہ یہ سب سمجھتے تھے اور دینی حلقوں میں خود کوثر نیازی کا وجود ہی ایک گونہ اشتعال انگیز بن گیا تھا۔ چنانچہ کوثر نیازی کے ان تمام اقدامات نے بھٹو کو اور بھی غیر مقبول بنا دیا اور دینی مدارس کے طلبہ اور بھی زیادہ برہم ہونا شروع ہو گئے۔ کیونکہ جب یہ کہا جائے گا کہ دینی مدارس بھٹو حکومت اپنی تحویل میں لے گی تو یقینی طور پر ایک طرف ان دینی مدارس کے مہتمم جید علماء کو پریشان کیا ہو گا تو دوسری طرف ان دینی مدارس کے طلبہ کو بھی اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہو گا۔

بالخصوص جب بھٹو کے بارے میں یہ بات مسلسل پھیلائی جا رہی ہے کہ وہ سوشلسٹ ہے، وہ دہریہ ہے وغیرہ وغیرہ تو یہ تمام فضا ایک لاوا بن جاتی ہے اور اس لاوے کو اگر بین الاقوامی سامراج بھی استعمال کرنے پر تل جاتے تو پھر وہ دوست دشمن کی تمیز نہیں کرتا وہ پھر سزا دینے کا تہیہ کر لیتا ہے اور وہ نتائج سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس عمل میں نہ بھٹو بخشا جاتا ہے نہ شہنشاہ ایران یہ الگ بات کہ اس عمل میں خود سامراج کو بالآخر شکست ہو جاتی ہے لیکن بہرحال یہ عمل جاری ہو جاتا ہے اور تیسری دنیا کے وہ ممالک جو سرمایہ داری نظام اور سامراجی اداروں سے منسلک ہوتے ہیں ان کو ایسے دور میں کسی طرف سے مدد بھی نہیں ملتی ؎

میں دردِ فرقت سے جاں بلب ہوں، تمہیں یقینِ وفا نہیں ہے
مجھے نہیں اعتبار اپنا تمہیں نہیں اعتبار میرا

کیا یہ ستم نہیں کہ ایک طرف بھٹو خود امریکہ کو اس پوری تحریک میں ملوث بتاتا ہے وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ امریکہ اس کے مخالف تحریک کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب امریکی سامراج کوئی ردعمل کرتا ہے تو اس کے طبقاتی مفاد ہوتے ہیں، تو اب سامراج کے اقدام کی مزاحمت تو بین الاقوامی اور قومی سطح پر سامراج دشمن طبقے ہی کر سکتے تھے۔ لیکن تیسری دنیا کے اوپری طبقے کے قائدین کی طرح بھٹو تمام "دعدے وعید" کے باوجود ان سامراج دشمن عناصر سے لرزاں و ترساں تھا۔ چنانچہ وہ اسی گومگو اور ڈھلمل پالیسی کو اپنائے رہا۔ اس نے سامراج سے بھی ناطہ جوڑنا چاہا اور سامراج دشمنوں سے بھی اس نے اپنے وزیر خارجہ کو امریکی وزیر خارجہ سے گفتگو کے لئے بھی پیرس بھیجا۔ اور سیٹو کو خیرباد کہنے کی بھی باتیں کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت اس کے اوپر سے گذر گیا۔ یہ تاریخ کا زبردست المیہ تھا جس کا وہ شکار ہوا۔ یہ اس دور میں اوپری قیادت کے تمام انقلابی اور ترقی پسندانہ نعروں کا جنازہ تھا جو بہت دھوم سے اُٹھا۔ لیکن ساتھ ہی پاکستان کے مجبور و مقہور انسانوں کی امیدوں کا بھی جنازہ نکل گیا۔ ان کی خوابیں بھی تشنہ تعبیر رہ گئیں۔ اور خاموش اکثریت "خاموش تماشائی" بنی رہ گئی اور جب پانسہ پلٹ گیا تو اس خاموش اکثریت کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ کھو بیٹھی ہے، کچھ گنوا بیٹھی ہے لیکن کوئی اس اکثریت کو نہ بتا سکا ؎

یوں نہ ہو گا جفا کا استیصال | یوں نہ مانے گا وہ ستم ایجاد
اب کے تیشہ چلے گا خسرو پر | جوئے خوں اب کے لائے گا فرہاد

اور جس خاموش اکثریت، جن مزدوروں، کسانوں، غریبوں، ناداروں، جن کچی آبادی والوں، جن خواتین کو وہ آخری جنگ کے لیے تیار نہ کر سکا جس جنگ سے وہ گریز کرتا رہا، جن مجبوروں اور مقہوروں نے اس کو اپنی

امیدوں کا مظہر بنایا ان کو اس نے آخری فیصلہ کن لمحے پر غچہ دیا اور ان کو میدان کارزار میں اتارنے کی بجائے اپنے طبقے، سرمایہ داروں، زمینداروں اور صاحب جائداد والوں کی حفاظت کے لئے خالی خولی جمعہ کی چھٹی اور شراب نوشی پر بندش کے نعرے لگاتا رہا۔ لیکن جس طبقے کی حفاظت کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا اس طبقے نے اس پر اعتبار کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس کی اسلام دوستی اور اسلام پسندی پر نہ مولانا مودودی نے اعتبار کیا نہ مجید نظامی نے اور اس کی اسلام کے لئے تمام خدمات، "قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے" جیسی خدمت بھی دھری کی دھری رہ گئی حالانکہ اس کے "اسلام پسند مشیروں" نے اس کو کہا تھا کہ اگر اس نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دے دیا تو پھر وہ پنجاب کا بے تاج بادشاہ ہوگا اور اس کو اقتدار سے ہٹانے کا کسی کو یارا نہ ہوگا لیکن وہ ہٹا دیا گیا اور تا آنکہ ۴ اور ۵ جولائی ۷۷ء کی شب آگئی اور نصف شب کو پرائم منسٹر ہاؤس کو فوج نے گھیر لیا اور اس کو جب کسی فوجی جرنیل نے آگاہ کیا ہوگا اور پرائم منسٹر ذوالفقار علی نے اس کی طرف دیکھا ہوگا اور اس کی چشم حیراں سوال کناں ہوگی تو اس کو جواب مل گیا ہوگا ؎

کون تو ہے؟ کون ہیں؟ کیسی وفا

حاصل ہستی ہیں کچھ رسوائیاں،

فوج کا نیا انداز

انتخابی دھاندلیوں کے خلاف مہم کا انجام مارشل لاء کی صورت میں نکلا اور بساطِ سیاست پر نئے انداز سے نئے مہروں کے ساتھ شطرنج کھیلی جانے لگی۔ پی این اے کے زعما اور پیپلز پارٹی کے قائدین کو حفاظتی نظربندی میں لے لیا گیا اور ان سب کو مری کی خنک ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کے لئے مری منتقل کر دیا گیا اور صبح کو جنرل ضیاء نے مارشل لاء کی وجوہات اور جمہوریت اور انتخابات میں اپنے یقین کامل کا اظہار کیا اور ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کا وعدہ کیا گیا۔ اس تمام اعلان سے مقصد اس پورے عمل کو اس مارشل لاء کے نفاذ کو نہایت ہی شریفانہ، بے ضرر اور غیر جانبدارانہ ثابت کرنا تھا اور ایک عالم پر یہ ثابت کرنا تھا کہ بھٹو نے جس جمہوریت سے روگردانی کی ہے اس جمہوریت کے نفاذ کے لئے فوج میدان میں آئی ہے۔ اس پورے عمل کا مقصد اس coup کی تلخی سے دنیا والوں کی توجہ ہٹانا تھا۔

ادھر فوج اپنی غیر جانبداری پر اصرار کر رہی تھی۔ اُدھر مساجد میں حلوے تقسیم ہونے لگے۔ محلوں اور گلیوں میں مٹھائیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ پی این اے کے کارکن، ان کے حامی اخبارات مبارک سلامت میں مصروف تھے مقصود عوام کو یہ تاثر دینا تھا کہ اب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم ہو گئی ہے اور اب قومی اتحاد والوں کا دورِ حکومت شروع ہو رہا ہے اور فوج نے یہ تمام اقدام قومی اتحاد کو اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھانے کے لئے کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس فوج اس تاثر کو بہت ہی مدھم رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے بھٹو سے مری میں ملاقاتیں بھی کیں ان کی خیر خیریت بھی دریافت کی۔ مقصد یہی تاثر دینا تھا کہ فوج بھٹو دشمن نہیں ہے اس نے صرف ملکی حالات سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔

اس دور میں فوجی حکام کے سیاسی داؤ پیچ کا انحصار غالباً اس مفروضے پر تھا کہ بھٹو کا اقتدار ریت کا قلعہ ہے، جیسے ہی اس کو اقتدار کے سنگھاسن سے ہٹا دیا جائے گا اس کی مقبولیت، اس کی محبوبیت سب ختم ہو جائے گی۔ اور کوئی

اس پر رونے والا بھی نہیں ہو گا۔ اس لیے اس سے نہایت شریفانہ برتاؤ ہونا چاہیئے۔ ہر قسم کے اخلاق کا مظاہرہ لازمی ٹھہرا۔ چنانچہ اس زمانے میں جنرل ضیاء الحق بھٹو کی ذہانت اور فطانت کے گن بھی گاتے نظر آتے ہیں اور یہ بھی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ وہ کسی قسم کے مقدمات قائم نہیں کرنا چاہتے یہ تمام امور آئندہ کی منتخب حکومت کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ یہ تمام اقدام اور تمام طور طریقے اس مفروضے پر تھے کہ بھٹو جیسے ہی پرائم منسٹر ہاؤس خالی کرے گا وہ بے کار جاں ہو جائے گا۔ اور اس کو کوئی یاد نہیں کرے گا۔

ایوب کو کس نے یاد کیا تھا؟ یحییٰ کو کس نے پلٹ کے دیکھا تھا۔؟ ملک فیروز خاں نون پاکستان کی وزارت عظمیٰ سے ہٹنے کے بعد سالہا سال زندہ رہے لیکن وہ بے نام ہو کر رہ گئے۔ مشتاق گورمانی جن کا ایک زمانے میں طوطی بولتا تھا جن کے لیے نوائے وقت جیسے سنگدل جریدے کے دل میں بھی نرم گوشہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا والوں نے منہ موڑ لیا۔ مظفر علی قزلباش آج بھی چاق و چوبند ہیں، ان کے قہقہے آج بھی یاروں کی محفلوں بلند ہوتے ہیں لیکن سیاست کی وادی خار زار میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ ماشاء اللہ زندہ ہیں رونق محفل ہیں ان محفلوں میں وہ علم و دانش کے موتی لٹاتے ہیں لیکن سیاست میں وہ یوسف بے کارواں ہیں اور اب ان کو غالباً کارواں کی تلاش بھی نہیں ہے

میرے پردیسیو! سیکھی ہے یہ کس دیس کی ریت
جو تمہیں یاد کرے اس کو نہ تم یاد کرو

سیاست کے ان معمولات نے فوج اور اس کی پشت پر کام کرنے والے سیاستدانوں، نفسیاتی جنگ کے ماہروں اور نابغہ روزگار دانشوروں نے ان نئے فوجی حکام کو یہ باور کرا دیا کہ بھٹو کو تخت سے اتار دو۔ اس کو اقتدار سے محروم کر دو اور پھر دیکھو منٹوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر کوئی طاقت ہمارا راستہ نہ روک سکے گی۔ چنانچہ اسی یقین اور اعتماد کی بنا پر جنرل ضیاء الحق نے ایک طرف بلا خطر ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کا اعلان کیا اور دوسری طرف ملکی اور غیر ملکی اخباری نامہ نگاروں کو انٹرویو دیتے ہوئے اصرار کیا۔

اولاً میرا کام کسی قسم کا احتساب نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی قسم کے مقدمات قائم کرنا چاہتا ہوں۔
یہ کام آنے والی منتخب حکومت کے لیے چھوڑا جائے گا۔
دوم:۔ بھٹو کی مذمت کم تعریف زیادہ۔
سوم:۔ دھاندلی بہت کم ہوئی ہے اور دھاندلی کے بغیر بھی بھٹو اور اس کی جماعت کی جیت یقینی تھی۔

یہ تمام باتیں اس گمان پر کی جا رہی تھیں کہ بھٹو کا دور ختم ہو گیا اور اب وہ قصہ پارینہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر یہ پالیسی اور اس کے داؤ پیچ متعین کیے گئے اور انہی داؤ پیچ کا یہ تقاضا تھا کہ اب دو متحارب گروہ۔ بھٹو اس کے رفقا اور قومی محاذ کے رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے۔

ان ابتدائی ایام میں جنرل ضیاء کے بیانات اور غیر ملکی نامہ نگاروں کو دیئے گئے انٹرویوؤں میں بھٹو کے لیے کسی حد تک نرم گوشے کی جھلک نمایاں نظر آتی تھی۔ اور کچھ حلقوں میں تو یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ کہیں بھٹو اور جنرل ضیاء مل کر تو نہیں کھیل رہے۔ لیکن یہ تاثر بہت ہی وقتی تھا۔ اور اس زمانے کی پالیسی بھی چند دن ہی باقی رہی۔ کیونکہ ان شا

حکومت کو یہ رپورٹیں موصول ہونی شروع ہو گئی تھیں کہ بھٹو کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے اور جب ۲۸ جولائی کو رہائی ہوئی اور ریل کے ذریعے سفر پر پابندی بھی عائد کر دی اور صرف ہوائی جہاز کے ذریعے ہی سفر کی اجازت دی گئی تو اس کے باوجود بھٹو کو لاڑکانہ، کراچی، ملتان، لاہور، پشاور میں جو استقبال ملا اس نے مارشل لا کی پوری سیاست، پوری پالیسی، ان کے منصوبوں اور ان کے تمام سیاسی داؤ پیچ کو الٹ کر رکھ دیا اور عوام نے مارشل لا کی تمام ہدایات اور احکامات کو بالائے طاق رکھ کر بھٹو کا والہانہ استقبال کیا اور انہوں نے برملا کہہ دیا ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے، تری یاد سے ترے نام سے

سٹریٹ فورس

اس استقبال نے پوری سیاست کو ہلا کر رکھ دیا اور تمام مفروضے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھٹو کی اس مقبولیت کے سیلاب نے اگر ایک طرف مارشل لا، حکومت اور فوج کو پریشان کیا تو دوسری طرف قومی محاذ بھی لرزاں و ترساں نظر آنے لگا۔ لیکن محبوبیت کے اس سیلاب نے خود بھٹو کو بھی ایک گونہ "پاگل" بنا دیا۔ اس سٹریٹ فورس نے اس کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا توازن بگاڑ دیا اور وہ ان پر مستقبل کی پوری STRATEGY اور داؤ پیچ کا تعین اور ترتیب اس سٹریٹ فورس کی بنیاد پر کرنے لگا اور وہ یہ بھول گیا کہ یہ ۱۹۷۰ء نہیں تھا یہ ۱۹۷۷ء تھا۔

۱۹۷۰ء میں جب اس نے سٹریٹ فورس کو بے لگام کیا تھا تو اس عوامی مقبولیت اور تائید و حمایت کے ساتھ ساتھ فوج کا ایک خاصا اہم اور با اثر حلقہ، نوکر شاہی کا ایک بہت بڑا گروہ اس کا حامی و مددگار تھا۔ یحییٰ خاں سے بھی اس کی دوستی تھی۔ اور امریکہ بھی اس کا دوست تصور ہوتا تھا۔ اسی لئے تو اس نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ صرف ان کی قیادت ہی جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کی یلغار روکنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کراچی میں وہ بی۔ بی۔ سی کو انٹرویو دے کر آئے تو جب لاہور پہنچے تو ان کے حامی مزدوروں اور غریب کارکنوں نے ایشیا سرخ، ایشیا سرخ ہے کے نعرے لگائے تو مسٹر بھٹو اپنے پہلے انٹرویو سے منحرف ہو گئے اور پھر عوامی جمہوریہ چین سے اپنی دوستی کی باتیں کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے جلسوں میں الطاف گوہر اور اعجاز بٹالوی بھی دکھائی دیا کرتے تھے اور تو اور اس زمانے میں سرمایہ داروں کا ایک گروہ بھی بھٹو کو سرمایہ مہیا کرنے میں مسرت محسوس کرتا تھا۔ غرضیکہ اس وقت بھٹو اپنے روٹی، کپڑے، مکان کے نعروں کی جاذبیت کے سہارے ایک سو تیرہ علماء کے فتووں کے باوجود کامیاب و کامران ہو گئے۔

لیکن ۱۹۷۷ء اگست میں صورت حال مختلف تھی۔ اب کہ بھٹو کی حامی اس غیر منظم سٹریٹ فورس کے مدمقابل سب سے منظم گروہ یعنی فوج صف آرا تھی۔ اگر اس سمے بھٹو اپنا توازن نہ کھو دیتا اور اپنی مقبولیت کے اظہار کو ذرا LOW KEY یا مدھم سروں میں رکھتا تو شاید فوج اپنی اس ظاہرا غیر جانبداری کو کچھ دن اور قائم رکھتی اور غالباً ۹۰ دن کے بعد انتخاب ہو ہی جاتے۔ لیکن بھٹو نے اس غیر منظم سٹریٹ فورس کو فیصلہ کن طاقت سمجھ لیا۔ اس کو مارشل لا کی طاقت اور جبر کا پیدا احساس نہیں ہو پایا۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ پاکستان میں دونوں مارشل لاء کے دوران وہ مارشل لاء حکومت کا دوست ہی رہا تھا۔ ایک مارشل لاء میں وہ خود وزارت کی مسند پر براجمان تھا اور دوسری مارشل لاء میں بھی اس کا سٹار یحییٰ خاں اور اس کے رفقا جرنیلوں کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ اس لئے اسے پوری طرح مارشل لاء حکومتوں کے جبر اور دبدبے کا احساس ہی نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ جیسے جیسے بھٹو نے اس سٹریٹ فورس کے مظاہرے کرنے شروع کئے دیسے

ہی فوج اور مارشل لا حکومت کے رویے میں تبدیلی شروع ہوگئی۔

بھٹو کی اس مقبولیت نے صرف فوج اور مارشل لا کو ہی قدرے پریشان نہیں کیا بلکہ پی این اے کے لیڈر اور ان کے پیروکار بھی اس عوامی دباؤ سے لرزاں و ترساں ہو گئے۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر مولانا احمد شاہ نورانی کے ساتھ بھٹو کے حامیوں کی طرف سے جو سلوک ہوا وہ خاصا خوفزدہ کرنے والا تھا اور وہ تمام طبقے جنہوں نے بھٹو کے خلاف تحریک چلائی تھی وہ پریشان ہونے لگے۔ چنانچہ یہ دونوں خوفزدہ گروہ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ اور نئی پالیسیاں جنم لینے لگیں۔ کیونکہ بھٹو اور ان کی جماعت نے ایک طرف انتخابات میں شرکت کا اعلان کیا۔ دوسری طرف انتخابات کے سلسلے میں الیکشن کمیشن کو دیئے گئے اختیارات پر بھی کڑی تنقید کی۔ ان تمام اقدامات سے یہی تاثر ملتا تھا کہ بھٹو عوامی دباؤ منظم کرنے کے لئے بہت سنجیدہ ہے۔

بھٹو کے استقبال کا جواب مارشل لا کی طرف سے عام گرفتاریوں اور سمری ملٹری کورٹ کی طرف سے مختلف سزاؤں اور کوڑوں کی صورت میں دیا گیا، اس پر بھٹو نے احتجاج کیا۔ اس طرح سے مارشل لا اور بھٹو میں محاذ آرائی کی صورت اختیار کر گئی، لیکن یہ محاذ آرائی اور تصادم اگست کے وسط تک اس سمے جب انتخابات میں پارٹیوں نے امیدوار نامزد کرنا شروع کیے۔ نئی صورت اختیار کر گیا، اور مارشل لا اور پی این اے دونوں طرف سے بھٹو کے خلاف مہم تیز ہونے لگی۔ اور وہ یہ زمانہ تھا جب یہ طے کیا گیا کہ مقدمات دائر کیے جائیں اور کردار کشی کی مہم چلائی جائے اس وقت تک خیال تھا کہ بھٹو کو خاموش رکھنے کے لیے مقدمات کا اجرا اور کردار کشی کی مہم کافی ہوگی اور انتخابات جیتے جا سکیں گے۔ لیکن جب پکڑ دھکڑ کوڑوں اور کردار کشی کی مہم سے صورت حال حق میں ہونے کی بجائے بگڑنے لگی اور بھٹو اور پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تو پریشانیاں بڑھنے لگیں اور یہ وہ دور تھا جب ایک زبردست طبقاتی جنگ وجود میں آ رہی تھی۔ یعنی اس دیس کے تمام محروم طبقے بھٹو کو اپنا مظہر، اپنا قائد سمجھ رہے تھے اور تمام اہلِ ثروت پی این اے اور مارشل لا حکومت کو اپنا محافظ سمجھ رہے تھے۔

بائیں بازو کا المیہ

مارشل لا اور پی این اے یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر یہ لوگ بھٹو کے ساتھ ابھی تک کیوں ہیں اور تو اور بعض بائیں بازو کے زعما اور جماعتیں بھی پریشان تھیں اور وہ کبھی بھٹو کو پی این اے کی طرح آمر کہتیں کبھی فاشسٹ کہتیں اور نہ جانے کیا کیا القاب دیتیں لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ آخر بھٹو مقبول کیوں ہے یہ بائیں بازو کے وہ لیڈر تھے جن کے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

اپنے ہی گرد و پیش سے جو آشنا نہ تھا
اس بے خبر کو ہم نے کیا رہنما پسند

ان بائیں بازو والوں نے ۱۹۷۰ء میں بھٹو کو رد کیا اور ان کا حشر دیکھ لیا اور ۱۹۷۷ء میں وہ بھٹو کی مقبولیت کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس ملک میں رونما ہونے والی طبقاتی کش مکش سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ طبقاتی کش مکش کا عمل تاریخ میں سوشلسٹ پارٹیوں اور مارکسٹوں کی تنظیم کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ وہ جاری و ساری

رہتا ہے۔ چنانچہ ایوب کے زوال سے لے کر اب تک بھٹو اپنی تمام ابن الوقتیوں اور غیر اصولی پالیسیوں کے باوجود وہ اس طبقاتی کش مکش کو آگے بڑھانے میں بعض دفعہ شعوری طور پر اور بعض دفعہ غیر شعوری طور پر مدد معاون ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور نادار خواتین کا محبوب ٹھہرا ہے۔ اب سوشلسٹ پارٹی اس حقیقت کو اس لیے نہیں جان سکی کہ وہ بظاہر مارکسی لیننی پارٹی ہے لیکن اصل میں ان کی سوچ درمیانے طبقے کے دکلا کی سوچ کی زنجیروں میں جکڑی رہی ہے اور وہ یہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ طبقاتی کش مکش کا عمل کس طرح بھٹو کی سیاست عام غلطیوں کے باوجود آگے بڑھا رہی ہے اب یہ فرض مارکسی لیننی سوچ رکھنے والے بائیں بازو کے عناصر کا تھا کہ وہ اس عمل کو اور آگے بڑھاتے اور اس کو ابن الوقتی اور دوغلاپن کی تمام آلائشوں سے پاک کرتے۔ بہرحال یہ بذاتِ خود ایک اہم موضوع ہے لیکن واقع یہ ہے کہ بائیں بازو کے وہ عناصر جو اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ اپنے کو عوام سے الگ تھلگ کر رہے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ "سوشلزم" کی مجاوری سے سماجی تبدیلیاں نہیں آجاتیں۔ سماجی تبدیلیوں کا عمل بہت گنجلک ہوتا ہے اور اس عمل میں عوام کی پسند ناپسند کا احترام کر کے ان کے ساتھ رہ کر، ان کا اعتماد حاصل کر کے ہی بدلا جا سکتا ہے۔

بھٹو کی مقبولیت اور سٹریٹ فورس نے جب صورت حال کو ہی بدل ڈالا تو پھر ایک طرف بھٹو کو نظر بند کیا گیا اور دوسری طرف مقدمہ قتل قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ساتھ ہی مارشل لا کی حکومت کو یہ محسوس ہونے لگا کہ جب تک وہ سیاسی خلا کو پورا نہیں کرتی۔ اس وقت تک بھٹو کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیال اس لئے بھی راسخ ہو گیا۔ کیونکہ پی این اے کے پورے قائدین گو باہر تھے لیکن یہ سب کے سب بھٹو کی مقبولیت کے ریلے کو روکنے میں بالکل ناکام نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان ٹائمز کے کچھ لوگوں نے سیاسی جماعتوں کے قائدین سے اکتوبر میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں انٹرویو لیے تھے تو مولانا مودودی نے اپنی گفتگو کے دوران میں بالغ رائے دہندگی کے بارے میں تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ آخر لچوں لفنگوں کو ووٹ کا اختیار دے کر ہم اپنی قسمت ان کے حوالے تو نہیں کر سکتے۔ یہ طبقاتی سماج میں غریب اور محروم طبقے لچے لفنگے ہی کہلاتے ہیں۔ بہرحال یہ تھی فضا جب سیاسی جماعتیں خود بھی بھٹو کے ریلے کے سامنے ناکام ہوتی نظر آئیں۔ چنانچہ اس احساسِ ناکامی کی وجہ نے انتخابات کے التواء کا ڈول ڈالا گیا لیکن اس کا اعلان اکتوبر کے پہلے ہفتے تک نہیں ہوا۔ کیونکہ حاکموں کو ابھی تک یہ خیال تھا کہ قتل کا مقدمہ بھٹو کو ہراساں کر دے گا اور پیپلز پارٹی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیگی۔

اس دوران مارشل لا حکومت کو ابتدا میں خیال تھا کہ وہ تن تنہا حکومت کا کاروبار چلائے گی اور پی۔ این۔ اے کے ساتھ پوری ہمدردیوں کے باوجود اپنی غیر جانبداری برقرار رکھ سکے گی۔ اسی لئے جنرل ضیاء نے اپنی ابتدائی پریس کانفرنسوں میں جس میں تمام سپیشل ٹربیونل توڑنے کا اعلان کیا تھا۔ اس میں حیدر آباد ٹربیونل کو مستثنیٰ قرار دیا تھا اور ولی خاں اور نیپ کے دوسرے لیڈروں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کی وجہ بھی یہی تھی کہ ولی خاں اور نیپ کے بلوچی لیڈر نہ تو فوج کو قبول تھے اور نہ متعصب پنجابی درمیانہ طبقے اور ان کے نمائندہ نوائے وقت کو اور ساتھ ہی مارشل لا کے ابتدائی دور میں جنرل ضیا اور اس کے مشیر یہ باور کیے ہوئے تھے کہ وہ تن تنہا کاروبار حکومت چلالیں گے لیکن ان کو بھٹو کی مقبولیت نے جلد ہی یہ احساس دلایا کہ وہ تن تنہا یہ کاروبار نہ چلا سکیں گے۔

چنانچہ ان کو کسی ایسے قائد کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو سیاسی قد کاٹھ میں بھٹو کا مقابلہ کر سکے اور بھٹو دشمنی میں بھی ان کا ہمنوا ہو۔ اسی ضرورت نے مارشل لا کو ولی خان کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا ادھر بیگم ولی خاں اور مفتی محمود کی وجہ سے پی۔ این۔ اے بھی حیدر آباد کے ٹربیونل کو توڑے جانے اور ان کی رہائی کا مطالبہ کر رہا تھا چنانچہ اگست ۷۷ء میں ہی خان عبدالغفار خاں نے بھی مارشل لا کی تعریف کرتے ہوئے حیدر آباد ٹربیونل کو توڑنے اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا اور قرائن سے معلوم ہونے لگا کہ مارشل لا کے حکام بھٹو دشمنی میں ولی خاں اور نیپ سے اپنی نفرتوں پر کسی حد تک قابو پالیں گے، اب یہ عمل بھٹو کے لئے زبردست مہلک تھا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی مقبولیت کے راز کو سمجھ لیا تھا کہ عوام مارشل لا کی حکومت سے خوش نہیں ہیں اور وہ سیاسی دور کی واپسی کے خواہاں ہیں اس لئے وہ مارشل لا اور نیپ میں دوستی والفت کی پینگوں کے مخالف تھا چنانچہ یہی وجہ تھی کہ مارشل لا نے اُسے جب دوبارہ نظر بند کیا تو نصرت بھٹو کی طرف سے رٹ دائر ہوئی تو اس میں بھٹو نے جو حلفی بیان دیا تھا اس میں بالالتزام یہی کوشش کی گئی کہ جنرل ضیا اور فوج کے نیپ کے ساتھ جو تضادات ہیں ان کو پوری طرح ابھارا جائے اور نیپ والوں کو بھی بتایا جائے کہ بلوچستان میں لشکر کشی کا پورا اصرار فوج کا تھا۔ ادھر نیپ کی علیحدگی پسندی پر اصرار کر کے پنجاب کے متعصب عنصر اور ان کے نمائندے "نوائے وقت" کے لئے ایسی صورت پیدا کر دی جائے کہ وہ نیپ اور ولی خاں کو بھٹو دشمنی کے باوجود بھی قبول نہ کر سکیں۔

عدلیہ اور سیاسی تضادات

بھٹو نے اپنی بیگم کی طرف سے جو اپنی نظر بندی کے خلاف پہلی آئینی درخواست پیش کی اس کا مقصد ہی ایک طرف مارشل لا حکومت اور جنرل ضیا کے اندرونی تضادات کو ابھارنا تھا چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی اس رٹ سے مارشل لا حکومت کو اتنا پیچھے دھکیلا اور اس حکومت کے اتنے تضادات آشکار کیے کہ اب تک وہ کسی نہ کسی صورت میں اس صورت حال سے استفادہ کر رہا ہے اور پانسہ اپنے حق میں پلٹنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

پہلا تضاد سپریم کورٹ کے چیف جسٹس یعقوب کی ریٹائرمنٹ کی صورت میں نکلا اور شیخ انوار الحق چیف جسٹس بنائے گئے۔ اب ایسی فضا میں جب چیف جسٹس انوار الحق کو یہ آئینی رٹ درخواست کی سماعت کرنی پڑی تو ظاہر ہے وہ تمام ہمدردیوں کے باوجود مارشل لا کی کلیتہً حمایت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ فیصلہ بھی یہی کیا گیا کہ مارشل لا کے نفاذ کا صرف محدود حد تک جواز ہے اور وہ محدود حد انتخابات کروانا ہیں۔ دوسرے ۱۹۷۳ء کا آئین کالعدم نہیں ہوا ہے بلکہ موجود ہے اور مارشل لا حکومت صرف شدید ضرورت کے تحت ہی اس میں ردوبدل کر سکتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارشل لا حکومت کے اقدام بہت حد تک عدلیہ کے ماتحت ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال مارشل لا حکومت کو دل سے پسند نہیں ہو گی۔ لیکن وہ ایسے حالات میں پھنس گئی تھی جس میں اس فیصلے کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس طرح سے بھٹو نے اپنی رٹ درخواست کے ذریعے بساط سیاست کی شطرنج پر کامیاب چال چلی جس سے اس کی پوزیشن کافی مضبوط ہو گئی۔

سب سے پہلی کامیابی تو یہ ہوئی کہ مارشل لا کی مطلق العنانیت کو لگام پڑ گئی اور بہت حد تک عدلیہ کی ماتحتی میں

آگئی۔ اب عدلیہ کتنی بھی اپنی سوچ میں بھٹو کے مخالف ہو اور مارشل لا حکام کی حامی ہو بہرحال اس کو تھوڑا بہت قانونی موشگافیاں کرتے ہوئے بھرم رکھنا پڑے گا۔

دوسرے اس کے رٹ درخواست کی سماعت کے دوران بھٹو نے اپنے حلفی بیان کے ذریعے حیدرآباد ٹربونل کے توڑے جانے اور نیپ کے لیڈروں کی رہائی میں تاخیر کرادی اور اس طرح سے سیاسی خلا میں بھٹو کی واحد شخصیت ہی میدان میں تھی جو اس گھٹن کے ماحول میں جیل میں رہتے ہوئے بھی ایک امید کی کرن بنتی چلی جا رہی تھی اور جیسے جیسے حکومت کی طرف سے پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان پر تشدد بڑھتا گیا ویسے ویسے بھٹو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور فوجداری مقدمہ سیاسی صورت اختیار کرتا گیا۔

بھٹو کی مقبولیت میں خود پی این اے کے اپنے تضادات اور مارشل لا حکومت کی حمایت نے بھی خاصا اہم رول ادا کیا اور بھٹو نے انتخابی تقریروں میں جو کہا تھا وہ حرف بحرف سچ نکل رہا تھا کہ صرف بھٹو کی نفرت ان نو ستاروں کو یکجا کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ بھٹو کے پابجولاں ہونے کے بعد جب بظاہر اس کا خطرہ کم ہو گیا تھا تو پی این اے کے تضادات اور گروہی مفادات کی کش مکش نمایاں ہوتی چلی گئی اور جیسے یہ تضاد نمایاں ہونے لگے ویسے ہی لوگ بھٹو کی سیاست اور شخصیت کے اور بھی گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ اور ہائیکورٹ میں مقدمہ جو رخ اختیار کر رہا تھا اور بھٹو اور چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کے درمیان جس انداز سے تصادم ہو رہا اس کا بہت حد تک فائدہ بھٹو کو پہنچتا رہا اور مقدمے کی نوعیت روز بروز بین الاقوامی بنتی گئی اور یہ مسلمہ طور پر ایک سیاسی مقدمہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اس پورے عمل نے بین الاقوامی رائے عامہ کو بھی متحرک کرنے میں مدد دی اور اس فضا کو مصطفیٰ کھر اور بھٹو کے صاحبزادوں نے پوری جانفشانی سے مزید متحرک کیا اور تمام اہم مغربی ممالک میں خاصے مؤثر حلقوں نے بھٹو کے حق میں آواز اٹھانا شروع کی۔

ہائیکورٹ میں مقدمے کے دوران پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان کی طرف سے جتنی بھی مہم چلی اسکو مارشل لا حکومت نے بہت حد تک دبا دیا، ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تحریکوں میں ہمہ گیر مقبولیت اور عوام کے مختلف طبقوں کو پوری طرح متحرک کرنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ مغالطہ تھا کہ صرف بھٹو کی شخصیت اور ذات کے لئے یہ تمام محروم طبقے سربکف میدان کارزار میں اتر آئیں گے، بھٹو، ان کے پورے خاندان اور پیپلز پارٹی کے قائدین یہ بھول گئے کہ بھٹو کی شخصیت کا جادو محروم طبقوں کی مادی اور ٹھوس ضرورتوں کی کوکھ سے ابھرا تھا۔ بھٹو اس واسطے محترم ٹھہرا تھا کہ اس نے غریب کو، مزدور کو، کسان کو روٹی کپڑے اور مکان کا مژدہ سنایا تھا۔ وہ اس واسطے محبوب ٹھہرا تھا کہ اس نے سرمایہ دار سے صنعتیں اپنی تحویل میں لی تھیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا تھا کہ ان صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو تحفظ ملا تھا۔ ان کو بہتر شرائط ملازمت ملی تھیں، مزدوروں کے ملازمتوں کے تحفظ کے لئے اسنے قوانین بنائے تھے، اس نے بے زمین کسانوں اور مزارعوں کو پانچ مرلے زمین کے ٹکڑے دینے شروع کئے تھے۔ کچی آبادی کے مکینوں کو حقوق ملکیت کا یقین دلایا تھا، یہ تمام اقدام تھے جنہوں نے اس خاموش اکثریت کو اس کا گرویدہ کیا تھا اور آج وہ اپنے محسن، اپنے محبوب اپنے محترم کو پابجولاں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے، ان کی آنکھیں بھی پرنم تھیں، ان کے دل سے اس کے لئے دعائیں بھی نکلتی تھیں۔ لیکن اس کے لئے وہ بڑے پیمانے پر گلی کوچوں میں نکلنے سے گریزاں تھے آخر کیوں؟ اس کی وجہ صاف تھی کہ اگر پیپلز پارٹی کے قائدین نے ٹھوس طریقوں سے بھٹو کی رہائی کو روزمرہ کے مسائل سے ہم آہنگ کیا ہوتا، عوام کو افراط زر کے خلاف، مہنگائی کے خلاف، ملاوٹ کے خلاف، رشوت ستانی کے خلاف جلسوں اور جلوسوں میں بلایا ہوتا۔

محلوں میں، دیہات میں کمیٹیاں قائم کی ہوتیں اور ایک منظم مہم شروع کی ہوتی تو آہستہ آہستہ صورتِ حال میں تبدیلی پیدا ہونے لگتی، یہ درست ہے کہ بڑے پیمانے پر گرفتاریوں، تشدد اور کوڑوں کی سزاؤں نے مایوسی پیدا کی لیکن اگر احتجاج منظم طریقے سے کیا گیا ہوتا اور اس کی بنیاد لوگوں کی ٹھوس ضرورتوں پر رکھی ہوتی تو پھر مایوسی کی فضا پیدا نہ ہوتی اور پھر کوڑوں کی سزا کے خلاف بھی ایک احتجاج کیا جاسکتا تھا۔ اس میں تمام روشن خیال لوگوں کو شامل کیا جاسکتا تھا اور ایسی تحریکوں میں بھٹو کے مخالفین کو بھی جمہوری اصولوں کی بنیاد پر احتجاجی تحریک میں شامل کیا جاسکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ پوری پیپلز پارٹی اس میدان سیاست میں بالکل ناتجربہ کار اور نابلد نکلی۔ نتیجہ ناکامی اور مایوسی۔

جو تند بگولوں سے اُلجھے، وہ عزم سفر کی بات کرے
اس منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

لیکن نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو اور پوری پیپلز پارٹی صرف بھٹو کی رہائی کی بات کرتی رہیں، اسی کے لیے وہ دعائیں مانگتی رہیں اور تو اور کچھ عناصر نے بھٹو کی محبت کے اظہار کے لئے خود سوزی کی وارداتوں کے لیے بھی متحرک کرکے ان کو موت کے حوالے کر دیا۔ ان مرنے والوں نے عظیم قربانیاں دی ہیں۔ پوچھنے، سوچنے اور سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ جنہوں نے یہ تحریک شروع کی کیا وہ دیانت دار تھے۔ کیا وہ تحریکوں کی سائنس، ان کی پوری ماہیت، ان کے نتائج سے بالکل بے بہرہ نہیں تھے اور بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ اگر شعوری طور پر نہیں تو کم از کم غیر شعوری طور پر یقیناً دشمن کے ہاتھ میں کھیل رہے تھے۔

خود سوزی منظم تحریکوں کی آخری منزل ہوتی ہے۔ جب عوام کا دباؤ پورے شباب پر پہنچ جائے، جب جلسے جلوس روزمرہ کا معمول ہو جائیں، جب مظاہرے شہروں اور دیہات کی ریت بن جائیں اور پھر حکومت، اہلِ اقتدار عوامی دباؤ کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نظر نہ آئیں تو پھر آخری وار کے لیے عوام کو زبردست عمل کے لیے متحرک کرنے کے واسطے خود سوزی کی جاتی ہے تاکہ عوام ایک گونہ مشتعل ہو کر شدت کے ساتھ اپنے غم و غصہ کا اظہار کریں، دوسری طرف پوری دنیا ایسے واقعات سے لرز جائے لیکن راجہ انور اس ناتجربہ کاری کے ہاتھوں ایسے مہم جو نکلے جنہوں نے بھٹو سے زیادہ بھٹو کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کئے اور وہ یہ بھول گئے کہ تحریکوں اور احتجاج کی ایک اپنی سائنس ہوتی ہے ؎

یوں بھی سنتا ہے کہیں کوئی فسانہ غم کا
ایسے مضمون کو ذرا اور بنا کر لاتے

سزائے موت

مارشل لا حکام نے جب یہ مقدمہ قتل قائم کرنے کی اجازت دی ہوگی تو وہ خود اور ان کے مشیر یہی سمجھے ہوں گے کہ قتل کے مقدمے سے بھٹو پر زیادہ سے زیادہ دباؤ استعمال کیا جاسکے گا اور سچ تو یہ ہے کہ اس مقدمے کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ بھٹو کو سیاسی میدان سے خارج کرکے فوجداری مقدمے کی موشگافیوں میں مقید کر دیا جائے اور ایک عالم کو بھی یہ تاثر دیا جائے کہ بھٹو ایک فوجداری اور گھناؤنے قتل کے جرم میں ملوث ہے لیکن مارشل لا حکام اور ان کے مشیروں کی اس سے زیادہ بھول کیا ہو سکتی تھی کہ انہوں نے یہ باور کر لیا کہ وہ بھٹو کو مقدمہ قتل میں ملوث کرکے اس کو سیاست سے خارج کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن کون جانتا تھا کہ مارشل لا حکام عدلیہ کے ہاتھوں بھٹو کو سیاست کے میدان سے خارج کراتے کراتے خود عدلیہ کو عوام کے اعتماد سے محروم کر بیٹھیں گے اور عدلیہ کو ایک ایسے بحران میں پھنسا

دیں گے کہ اب خود عدلیہ کے افراد بھی اس بحران سے نکلنا چاہتے بھی ہیں تو نکل نہیں پاتے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

بھٹو نے بھی عدلیہ کے اس بحران کو اور گہرا کیا۔ ان کے تضادات کو آشکارا کیا۔ تا آنکہ اعتماد کے آبگینے ایک ایک کر کے چور ہونے لگے۔ بھٹو نے ایک طرف عدالت کے اندر ہائیکورٹ میں سماعت کرنے والے بنچ اور اس کے چیف جسٹس پر جانبداری اور تعصب کا الزام لگایا اور اس پر اصرار کر کے ایک عالم کو یہ تاثر دیا کہ حکومت نے یہ مقدمہ سیاسی اغراض کے تحت قائم کیا ہے اور عدالت حکام کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے اور مارشل لا حکومت کی اغراض پوری کر رہی ہے ورنہ اس مقدمے کے مقاصد کلیتہً سیاسی ہیں۔

پاکستان کے اندر طبقاتی کش مکش کے عمل کے تیز ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ عوام کی بڑی بھاری اکثریت جو محروم طبقوں پر مشتمل ہے نے اس مقدمہ قتل کی سچائی اور حقیقت کو سرے سے تسلیم کرنے ہی انکار کر دیا اور اگر تسلیم کرنے پر مائل بھی ہوئے تو یہ کہنے لگے کہ روز قتل ہوتے ہیں اور کوئی نام لیوا نہیں ہوتا اس بھٹو کے گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے اس لئے بے تابی ہے کہ وہ غریبوں کا حامی ہے چنانچہ جب ہائیکورٹ نے سزائے موت کے احکام سنا دیئے تو چاروں طرف ایک سکتہ طاری ہو گیا، ایک سناٹا چھا گیا، یہ درست ہے کہ لوگ گلی کوچوں میں زیادہ تعداد میں نہیں نکلے اور حکومت کی تمام تیاریاں، تمام پیش بندیاں بے کار ہو گئیں، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی شخص موت کی سزا کا خیال بھی نہیں کر رہا تھا اور جب یہ موت کی سزا سنا دی گئی تو لوگوں کی زبانیں گنگ تھیں اور وہ حیران و پریشان ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ؎

ہر اک صورت، ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

لیکن جو خاموشی پاکستان میں چھائے رہوئے تھی وہ خاموشی باہر کی دنیا میں نہ تھی۔ وہاں احتجاج بھی ہوا اور سزائے موت نہ دینے کی اپیلیں بھی شروع ہوئیں ایک کے بعد دوسرا ملک اور اس کے سربراہ مارشل حکام اور جنرل ضیاء سے درخواستیں کرنے لگے کہ بھٹو کو موت کی سزا نہ دی جائے۔

بین الاقوامی صورت حال اور بھٹو

بین الاقوامی احتجاج سے زیادہ مختلف ممالک بالخصوص عرب ممالک امریکہ، سوویت روس اور چین کی طرف سے اپیلوں نے مارشل لاء حکام کو قدرے پریشان کر دیا اور اس کا توڑ سوچا جانے لگا، چنانچہ ان اپیلوں کے جواب کے لیے ہی ایک طرف جنرل ضیاء نے بین الاقوامی دورے خود شروع کیے اور بھٹو کی پیروی میں مختلف سربراہوں سے ذاتی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں تاثر دینا شروع کیا لیکن ذاتی تعلقات قائم ہوئے یا نہیں ہوئے لیکن مقصد یہ تھا کہ بھٹو کا امور خارجہ کے ماہر ہونے کی حیثیت سے جو ایک خاص مقام ہے اس کو ایک واہمہ کے طور پر پیش کیا جائے اور یہ باور کرایا جائے کہ بیرونی ممالک کے تعلقات پاکستان سے تھے نہ کہ بھٹو کی ذات سے۔ یہاں بھی جنرل ضیاء اور ان کے مشیروں نے ٹھوکر کھائی اور یہ نہ سمجھ پائے کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنی تمام ابن الوقت پالیسیوں اور قدرے بے اصولیوں کے باوجود جس طرح اپنے ملک کے محروم طبقوں میں محبوب ہے اسی طرح وہ تیسری دنیا میں ہی نہیں بلکہ سرمایہ دار اور ترقی یافتہ دنیا میں بھی مقبول و محبوب ہے وہ سوشلسٹ

دنیا میں بھی عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے

فوجی حکام اور ان کے مشیر اپنی تربیت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں ۔ وہ اپنی ناک سے آگے دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے وہ میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب، ان کے حملے ان کی پسپائی کے مسائل ہی پر غور کر سکتے ہیں ۔ وہ فوجوں کی کارروائی سے عالمی رائے عامہ اور اس کے رّدعمل اور پھر اس رّدعمل کے اثرات کو جاننے اور سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، دگرنہ اسی فوج نے مشرقی پاکستان میں لشکر کشی سے پہلے عالمی رائے عامہ کو جان لیا ہوتا تو وہ شاید یہ اقدام نہ کرتے جس طرح اس وقت فوجی حکام نے اس لشکر کشی سے مرتب ہونے والے نتائج کو نہ جانا اسی طرح وہ یہ نہ جان سکے ۔ ذوالفقار علی بھٹو بین الاقوامی دنیا میں پاکستان کے سربراہ کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں اور اپنے اقدام کی وجہ سے مقبول اور محبوب بنا ۔

تو کوئی اور ہے میں اور ہوں ایسا کیوں ہے
یہ سوال آج محبت نے اٹھایا کیوں ہے

ذوالفقار علی بھٹو اس وقت عالمی سیاست میں ابھرا اور اس دور سے وہ متاثر ہوا جب تیسری دنیا تشکیل پا رہی تھی اور سامراج دشمنی کی تحریک اس تیسری دنیا میں واضح اور ٹھوس شکل اختیار کر رہی تھی ۔ بھٹو اس وقت ایوب کابینہ میں لیا گیا جب تیسری دنیا میں ناصر، نکرومہ، سکارنو، کاسترو، بن بیلا اپنے اپنے انداز میں سامراج کو للکار رہے تھے اور عرب قوم پرستی کے سامنے پرانے تاج وتخت لرزاں وترساں تھے ۔ جب سویز قومی ملکیت میں آچکی تھی، جب برطانوی، فرانسیسی سامراج کو شکست ہو چکی تھی چنانچہ تیس سالہ بھٹو بھی ایک ANGRY YOUNG MAN کی حیثیت سے ان شخصیتوں، ان کی قوم پرستی، ان کی سامراج دشمنی اور ان کی سماجی تبدیلیوں کی خواہش اور سوشلزم سے متاثر ہوا ۔ چنانچہ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ اس نے اپنے دورِ وزارت میں سوویت روس کے ساتھ تیل کا معاہدہ کر کے پہلی بار پاکستان میں "شجر ممنوعہ" کو چھونے کی، ہاتھ لگانے کی ہمت کی ۔ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ ہندوستان دشمنی کے لبعد کی فضا کو ایسے انداز میں استعمال کیا جا ایک طرف خود عوامی جمہوریہ چین کے علاقائی مفادات کی اگر تشفی ہوتی تھی تو دوسری طرف ہمارے عوام کی ہندوستان دشمنی کے جذبات بھی تسکین پاتے تھے ۔ اور ساتھ ہی فیلڈ مارشل ایوب خاں کی شخصیت کا قد کاٹھ بھی اس خطے میں اہمیت اختیار کرتا تھا ۔

اسی طرح جب بھٹو خود برسر اقتدار آیا تو اس نے اسلامی سربراہوں کی کانفرنس کو بومدین یاسر عرفات، قذافی جیسے رہنماؤں کے ساتھ مل کر تیسری دنیا کی امنگوں سے ہم آہنگ کرنے میں مدد دی اور اس کو رجعت پسند عرب بادشاہوں کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننے دیا ۔ اس نے ایک طرف ترقی پسند عربوں میں اگر مقبول بنایا تھا تو دوسری طرف اس نے عرب امارتوں اور سعودی عرب کے شاہ فیصل کو اپنی فوج اور ٹیکنولوجی کے سہارے سے متاثر کیا اور ان کو یہ یقین دلایا کہ ان کو عجم کی طرف دیکھنے کی ضرورت سے وہ بے نیاز کر دے گا ۔ اس طرح سے اسے عربوں کی روایتی عجم دشمنی کی تشفی کی ۔ ادھر شہنشاہ کو بھی مختلف پہلوؤں سے ساتھ رکھا ۔ اقدام کتنے ہی بے اصولے ٹھہریں لیکن اس نے ان اقدام کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا میں ایک نئے اقتصادی نظام کے لیے جو آواز بلند کرنی شروع کی تو یہ پوری صورت حال عالمی سطح پر لڑی جانے والی طبقاتی جنگ کا اظہار تھا ۔ یہ اس جہانِ رنگ وبو کے پیمانے پر لڑی جانے والی امیر وغریب کی جنگ تھی ۔ یہ پسماندہ اور زرعی ملکوں کی صنعتی طور پر ترقی یافتہ سرمایہ دار اور سامراجی ممالک کے خلاف جنگ

تھی، یہی وہ طبقاتی جنگ تھی جس کو بین الاقوامی طور پر شمال اور جنوب NORTH اور SOUTH کے مکالمات کا نام دیا گیا۔ اس پوری جنگ میں ذوالفقار علی بھٹو زرعی، پسماندہ اور محروم ملکوں کی آواز بن رہا تھا۔ وہ ان کی آسوں پیاسوں اور تمناؤں کا مظہر بن رہا تھا، بھٹو کے ان اقدام نے اس جدوجہد نے اس نئے اقتصادی نظام کے نعرے نے اس کی تمام بے اصولیوں اور ابن الوقتیوں پر پردہ ڈال دیا اور یہ نعرے، یہ تحریک، یہ تیسری دنیا کے دل کی آواز بنتی چلی گئی تو یہ سامراج دشمن تحریک سوشلسٹ ممالک کو بھی متاثر کرنے لگی۔ اور وہ بھی ذوالفقار علی بھٹو اور اس کی پالیسیوں کے اس پہلو کو بنظر استحسان دیکھنے لگے۔ ناوابستہ اقوام اس کو سینٹو کی رکنیت کے باوجود قدرے احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے چنانچہ یہی کارنامے تھے جنہوں نے بھٹو کو مختلف ملکوں میں محبوب ٹھہرایا۔ اور آج یہی وہ لوگ ہیں جو اس کی جان بچانے کے لئے سرگرم عمل ہیں، اپیلیں کر رہے ہیں اور فوجی حکام اور ان کے مشیر یہ سمجھ نہیں پاتے کہ آخر یہ اپیلیں کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ شاہ سعود ایک طرف مودودی کو فیصل ایوارڈ دیتا ہے دوسری طرف پوری سنجیدگی سے بھٹو کی جان بخشی چاہتا ہے اور یہ مارشل لا کے حاکم اور وزیر کبیر حیران و پریشان ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ؎

وہ اکثر باتوں باتوں میں اغیار سے پوچھا کرتے ہیں
یہ سر بہ گریباں دیوانے کس شے کا تقاضا کرتے ہیں

اس لئے فوجی حکام کے تمام رابطوں اور دوروں کے باوجود بین الاقوامی دنیا کو ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت سے کنارہ کش کروا لینا قریب قریب ناممکن ہے۔

بھٹو، عوامی جمہوریہ چین اور امریکی سامراج

عالمی سطح پر سامراج دشمن تحریک سے بھٹو کی وابستگی اور اس نئے اقتصادی نظام کی جدوجہد کی رہنمائی تصویر کا ایک رخ تھا۔ اور وہ اس کے بل پر ایک طرف اگر بین الاقوامی دباؤ استعمال کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ اس برصغیر اور اس کے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات کو بھی اپنے حق میں استعمال کرنے سے نہیں چوک رہا تھا۔ ان علاقوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں اس کا تجزیہ اس کی ابن الوقتی اور اس موقف کا اعادہ تھا کہ مارشل لا حکومت پر بالآخر دباؤ امریکہ اور اس کے نئے دوستوں عوامی جمہوریہ چین اور سعودی عرب کا ہی کارگر ہو سکتا ہے چنانچہ جب اپریل ۱۹۷۸ء میں افغانستان میں انقلاب رونما ہوا تو اس پورے علاقے میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس کے پیش نظر بھٹو کی باچھیں کھل اٹھیں اور اس نے نئے سرے سے اپنے مہرے ترتیب دینے شروع کئے اور اپنی پرانی دوستیاں اور تعلقات استوار کرنے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔

افغانستان کا انقلاب بھٹو کی سیاست اور طریق کار میں اس لئے اہمیت نہیں اختیار کر گیا تھا کہ وہاں ایک زبردست عوامی انقلاب آیا تھا۔ جہاں ریاست کا پورا ڈھانچہ تہس نہس کر کے ایک نئی قسم کی ریاست کو وجود میں لایا گیا تھا۔ وہ اس انقلاب کو بالکل ایک دوسری نظر سے دیکھ رہا تھا اور یہ نظر تھی کہ کس طرح اس خطے میں امریکی سیاست اور اثر و نفوذ کو یکدم دھچکا لگا ہے۔ اب تک امریکہ اس برصغیر میں ان تمام طاقتوں کو کسی نہ کسی انداز میں شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تھا جو طاقتیں گو امریکہ کے مخالف نہ تھیں۔ لیکن قدرے آزاد منش ہو رہی تھیں وہ ایک گونہ خودسر

بھی ہو رہی تھیں اور اپنے ممالک میں کلیتہً سامراج کو کھلی چھٹی دینے کے مخالف بھی تھیں۔ چنانچہ امریکہ کو یہ انداز پسند نہ تھے۔ اس کو نہ تو اندرا گاندھی ایک آنکھ بھاتی نہ بندرا نائیکے اور نہ مجیب الرحمان ہی اس کو پسند تھا اور ان کے نزدیک بھٹو بھی اپنے جامے سے باہر نکلا جا رہا تھا وہ ایٹمی توانائی اور ری پروسیسنگ پلانٹ کی بات کرتا تھا وہ دنیائے عرب اور تیسری دنیا کا لیڈر بننے کا خواب دیکھتا تھا وہ ان کو نئے اقتصادی نظام کے خواب دکھا رہا تھا تو غرضیکہ وہ بھی امریکہ کی درگاہ سے راندہ جا رہا تھا اور پھر ۱۹۷۷ء نے دیکھا کہ ایک ایک کر کے یہ تمام مہرے یکے بعد دیگرے اقتدار سے ہٹا دیئے گئے، کچھ کو انتخابات میں شکست ہوئی، کچھ کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے اور کچھ کو پا بجولاں کوٹ لکھپت میں پہنچا دیا گیا اور اس طرح سے یہ پورا خطہ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ امریکہ کا ایک محفوظ خطہ بن گیا ہے۔ اس فضا میں افغانستان کے انقلاب نے دیکھتے دیکھتے پوری فضا بدل دی اور جیسے جیسے اس انقلاب کے بارے میں یقین ہوتا گیا کہ افغانستان کی نئی حکومت کے سوویت روس سے گہرے تعلقات استوار ہو رہے ہیں اور پھر افغانستان اور روس کی دوستی کے پرانے معاہدوں کی از سر نو تجدید ہوئی تو اس سے امریکہ نواز حلقے، نوائے وقت، مودودی اور مفتی محمود جو مودودی اور نوائے وقت کے نئے حلقہ بگوش ہوئے تھے۔ پریشان ہونے لگے دہائیاں دی جانے لگیں اور اٹھتے بیٹھتے یہ نعرہ سنائی دینے لگا کہ کمیونزم تو رخم کی سرحدوں پر دستک دینے لگا ہے اس لئے دہائی ہے دہائی ہے، بھاگیو، بچائیو، لٹ گئے اس فضا میں بھٹو نے یہی راگ الاپا۔ اس کی پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو نے بھی اسی قسم کی قرارداد پاس کی جس میں افغانستان اور روس کے معاہدے پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا اور اس طرح سے بھٹو مودودی، نوائے وقت ایک ہی صف میں نظر آنے لگے۔ اس پالیسی کا مقصد کیا تھا کہ امریکہ کو مجبور کیا جائے اور باور کرایا جائے کہ افغانستان میں تبدیلیوں اور انقلاب نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اور امریکہ کے اثر و رسوخ کو جو نقصان پہنچا ہے اس عمل کو روکنے کی "ہمت" اور "حوصلہ" اگر کسی میں ہے تو وہ ذوالفقار علی بھٹو ہی ہے۔ اس لئے اس کی رہائی امریکی مفاد میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ بھٹو نے عوامی جمہوریہ چین کی قیادت میں امریکہ نوازی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو بھی بھانپ لیا تھا۔ اور وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اب امریکہ اس خطے میں عوامی جمہوریہ چین کے ذریعے اپنی پالیسیوں کو آگے بڑھائے گا۔ اس لئے بھٹو نے جیل میں بیٹھ کر خارجہ پالیسی سے متعلق اور امریکی افسر مسٹر ڈبوسم کے دورے کے بعد جو مضامین لکھے اس میں اپنے سینٹو سے پاکستان کے نکلنے کی مخالفت کی تھی۔ اور اس طرح سے اس نے عوامی جمہوریہ چین کو بھی یہ باور کرایا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور امریکہ، جاپان اور چین کا جو محور وجود میں آ رہا ہے اس کے لئے بھٹو موزوں ترین سیاست دان ہے جس کو ابھی تک پاکستان میں مقبولیت عامہ حاصل ہے، لیکن کون جانے!

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

اب بھٹو کی یہ امریکہ نوازی اور امریکہ کی قیادت میں چین، جاپان اور جس میں امریکہ بھارت کو بھی شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک عالمی سطح پر لڑی جانے والی طبقاتی کش مکش ہے اور اس کے اثرات ہر ملک میں پڑ رہے ہیں۔ اب بھٹو کے اس عمل سے خود پیپلز پارٹی اور عوام کے اندر ایک زبردست کش مکش تیز ہو رہی ہے کہ بھٹو نے پچھلے دو سال سے اپنی مقبولیت کی اساس بہت حد تک امریکہ دشمنی کی بنیاد پر رکھی اور عوام کی امریکہ دشمنی کے حوالے سے ہی

بھٹو ان کا محبوب ٹھہرا تھا۔ دیہات کے کونوں کھدروں میں بھی جاہل عورتوں تک اتنی بات سمجھ گئی تھیں کہ امریکہ ان کو ری پروسیسنگ پلانٹ نہیں لینے دیتا۔ یہی جذبہ عوام کو سینٹو کے خلاف کرتا تھا۔ اسی جذبے نے ان کو انقلاب افغانستان کا حامی و مؤید بنایا تھا۔ اور اسی جذبے نے ان کو چین کی امریکہ سے دوستی اور امریکہ نوازی نے ان کو پریشان کر دیا ہے۔ چنانچہ اب اس طبقاتی کشمکش میں وقتی طور پر بھٹو اسی صف میں کھڑا ہے جس میں سرفہرست جنرل ضیاء رہیں، نوائے وقت ہے، مودودی ہے، مفتی محمود ہے، وغیرہ وغیرہ۔ پیپلز پارٹی کی قرارداد اور اس کے بعض اہم لیڈروں کے بیانات اور روس دشمنی اس مؤقف کی غمازی ہے کہ بھٹو اب محسوس کر رہا ہے کہ وہ اپنی سٹریٹ فورس اور عوام کے مظاہروں اور جلوسوں کے سہارے باہر نہیں آ سکتا اور یہ مہرے جنرل ضیاء کو مات دینے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے اس نے اب اعلیٰ سطح پر امریکہ نوازی اور آج جس وقت امریکہ نوازی کہا جاتا ہے تو اس میں چین شامل ہوتا ہے کی راہ اپنائی ہے چنانچہ یہ عمل رونما ہو رہا ہے اس نے پیپلز پارٹی کے سامراج دشمن حلقوں کو پریشان کر دیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان حلقوں کی اپنی غیر منظم اور غیر مربوط سوچ نے ہمیشہ ان کو ابن الوقتی کی راہ پر ڈالا اور وہ خود بھٹو کی چکنی چپڑی باتوں کو فلسفہ مہیا کرتے رہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اپنے مربوط اور منظم حملے سے بھٹو کی ابن الوقتی کو روکا جاتا اور اس کے بڑھتے ہوئے پاؤں میں زنجیریں ڈالی جاتیں۔ اس لیے آج بھی اگر پیپلز پارٹی کے عام لوگ مزاحمت کریں تو بھٹو جیل میں بھی بیٹھ کر اپنی پوزیشن بدلنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ سٹریٹ فورس اور منظم رائے عامہ سے ڈرتا ہے۔ اور یہ رائے عامہ، یہ سٹریٹ فورس اسے للکار سکتی ہے ؎

ہم سے بھاگا نہ کرو دور، غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمہیں، چاہنے والوں کی طرح

اب یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف بھٹو سوویت روس کے مخالف پالیسی اختیار کرتا ہے دوسری طرف سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل اور سوویت ریاست کے سربراہ لیونڈ برزنیف اس کی جان بخشی کے لیے حتی المقدور پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور اس طرح سے وہ بھی امریکہ، عوامی جمہوریہ چین، سعودی عرب اور دوسرے ممالک کی صفوں میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف طاقتیں اس خطے میں مختلف مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ سوویت روس اور سوشلسٹ ممالک اس خطے میں استحکام اور امن کے خواہاں ہیں اب اگر بھٹو کو پھانسی لگ جاتی ہے تو اس خطے میں عدم استحکام کا عمل شروع ہو سکتا ہے اور آج کسی بھی خطے میں عدم استحکام سرحدوں کی ردوبدل اور جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے پر منتج ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی ایسے عمل کے اجرا کے حامی نہیں ہو سکتے جس سے اس خطے کے امن کو خطرہ ہو۔ آخر امن اور جنگ کی کشمکش تو اس دور کی سب سے بڑی کشمکش ہے ؎

ہم امن کے حامی ہیں، حملہ آور کو پسپا کرتے ہیں
ہم موت اور زیست سے کھیلنے والے ہر دم آگے بڑھتے ہیں

اور یہی وہ بہت گنجلک قسم کی طبقاتی کشمکش ہے جس کا بھٹو کو بھی پوری طرح ادراک نہیں ہے، بجا طور پر اس کا فوری مقصد اپنی جان بچانا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے اور صحیح سمجھتا ہے کہ جنرل ضیاء پر دباؤ امریکی کیمپ کا یعنی سعودی عرب اور چین کا پڑ سکتا ہے کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ سوشلسٹ کیمپ تو اپنے اصولوں کے جبر تلے دبا ہوا ہے اسے تو ہر حال اس کی جان بخشی کی کوشش کرنا ہی ہے۔

اندرونی بحران

اب جیسے جیسے بھٹو کے مقدمے کے تمام مراحل ختم ہو رہے ہیں تو ویسے ہی پاکستان کا اندرونی بحران مزید گہرا ہو رہا ہے۔ یہ بجا ہے کہ بھٹو کی سٹریٹ فورس میدانِ کارزار میں نظر نہیں آرہی، پیپلز پارٹی کے تمام فعال کارکن اور قائدین جیلوں میں بند ہیں لیکن اس کے باوجود بھٹو کی مخالف طاقتیں پریشان ہیں اور ان کے آپس کے تضادات شدید طور پر واضح ہو رہے ہیں، یہ طبقاتی کش مکش ایک دوسری صورت ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ جب دائیں بازو کے نظریات رکھنے والے عناصر، گروہ اور جماعتیں آپس میں دست وگریباں ہوتی ہیں تو بایاں بازو اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ دائیں بازو کے جھگڑے، ان کے تضادات، ان کی ہاتھاپائی بذاتِ خود طبقاتی کش مکش ہی کی ایک شکل ہوتی ہے۔ اگر ذرا غور سے اس طبقاتی کش مکش کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ کش مکش اصل میں نتیجہ ہے اس دباؤ کا، اس خطرے کا جو محرومین کے طبقے کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے حکمران طبقے کو انتخابات کروانے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے ویسے ہی یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے اور نئی صف بندیاں شروع ہوتی ہیں۔ نئے داؤ پیچ وضع ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ جب پی این اے کی مختلف جماعتوں میں ادغام کی باتیں ہونی شروع ہوئیں تو یہ بھی ایک طرف بھٹو کی مقبولیت اور محبوبیت کی یلغار ہی تھی۔ جس کی روک تھام کے لیے وہ ادغام ضروری سمجھتے تھے اور جو جماعتیں پی این اے کی جماعتوں کے ادغام کی پالیسی کے مخالف تھیں وہ بھی بھٹو دشمن تھیں لیکن ان کے اپنے مقاصد تھے اور وہ یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ مارشل لا کی حمایت کر کے اور اس کی بی ٹیم کہلا کے بھٹو کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے زیادہ تلخ تجربہ تو ولی خاں کو ہوا۔ جنہوں نے قید و بند سے آزاد ہونے کے بعد مارشل لا کی حمایت اور بھٹو دشمنی کو اپنی سیاست کی بنیاد قرار دیا لیکن دیکھتے دیکھتے ولی خاں جن کا جسمانی طور کے علاوہ بھی سیاست میں قد کاٹھ خاصا بلند تھا وہ بونے نظر آنے لگے اور خود صوبہ سرحد میں نوجوان نسل ان پر لعن طعن کرنے لگی۔ چنانچہ بالآخر ان کو اور ان کی بیگم کو اپنا لہجہ، اپنا انداز سب کچھ بدلنا پڑا۔ اب ان کی تقریروں میں بھٹو کا ذکر شاذ ہی ہوتا ہے، اب وہ بھی ایک طرف لوگوں کی محرومیوں کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف مارشل لا حکام کے وعدوں سے اپنی مایوسی کا برملا اظہار کرنے لگے ہیں۔ اب یہی حال ائر مارشل اصغر خاں اور ان کی تحریک استقلال کا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ کیا ہے کہ یہ دایاں بازو، یہ سرمایہ دار، جاگیردار، زمیندار، آڑھتی، تاجر، پیشہ ور افراد کے نمائندہ جماعتیں ۵ر جولائی، کو یک جان دو قالب نظر آتی تھیں۔ ایک زبردست طاقت دکھائی دیتی تھیں، یہ بھٹو کی بجائے خود کو سٹریٹ فورس کا "بادشاہ" بتاتی تھیں لیکن کہاں ہے آج ان کا اتحاد، کہاں ہے ان کے اتحاد کی بنیاد بھٹو دشمنی، کہاں ہے "نظام مصطفےٰ" کے لیے ان کا عزم راسخ۔

درست کہ عوام میدان کارزار میں نہیں اترے، کوئی بڑے پیمانے پر ایجی ٹیشن نہیں ہوا، کوئی گولی نہیں چلی، کوئی مظاہرے نہیں ہوئے۔ ان سب کے بغیر ہی ہزاروں مرد اور عورتیں جیلوں میں بند پڑے ہیں۔ لیکن اس خاموشی کے باوجود دائیں بازو میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ اور یہ دن بدن بڑھتے جائیں گے، وسیع ہوتے جائیں گے، اسے ہی طبقاتی کش مکش کہتے ہیں۔ یہی تاریخ کا جبر کہلاتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اس بحران نے "نظام مصطفےٰ" کے نعرے اور اس پر عملدرآمد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور اس امر کا اظہار اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن جماعت اسلامی کی قیادت میں مسلم لیگ اور جمعیۃ العلمائے اسلام نے مارشل لا ر

حکومت میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ان جماعتوں کے اقتدار میں آنے سے نئے تضاد ابھرے، ایک طرف تو تضاد تھا اقتدار میں آنے والی جماعتوں اور اقتدار سے محروم ان جماعتوں کے مابین جو کل تک پی این اے میں اکھٹی تھیں۔ دوسری طرف خود اقتدار میں آنے جماعتوں کے اندر سے بھی تضادات ابھرے ہیں کیونکہ ان کے کچھ عناصر کو اپنی غیر مقبولیت اور عوام کے غیض و غضب کا احساس ہو رہا ہے اور یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ عوام کو مارشل لاء سے جو نفرت ہوتی ہے اس کا نشانہ یہ جماعتیں بن رہی ہیں اب جماعت اسلامی اور جمعیتہ العلمائے اسلام کو وہابی قرار دے کر احمد شاہ نورانی سنی کانفرنس کر رہے ہیں، ملتان میں سنیوں کی کانفرنس اور اس میں لاکھوں کے اجتماع نے جماعت اسلامی جس کو وہاں پر "فرقہ مودودیہ" کے لقب سے پکارا گیا ہے کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہو رہا ہے اب اس طرح کی اور بھی سنی کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اور اس طرح پاکستان کے دور دراز علاقوں میں بھی فرقہ مودودیہ کے خلاف نفرت کا اظہار ہو رہا ہے یہ نفرت اصل میں مارشل لاء کے خلاف ہے اور اس کی لپیٹ میں فرقہ مودودیہ آگیا ہے۔

بھٹو کے خلاف نفرت کے اظہار کے لیے جب مذہب کی زبان کے استعمال کا رواج ڈالا گیا تو اب مودودی اور مارشل لاء کے خلاف بھی مذہب ہی کی زبان استعمال ہو گی۔ کیونکہ جب جماعت اسلامی اور اس کے ہمنواؤں نے مذہب کا نام لے کر اقتدار سنبھالا ہے تو احمد شاہ نورانی بھی تو مذہب کا نام لے کر ہی ان کو اقتدار سے ہٹانے کا کام سرانجام دے سکتے ہیں اور جب اس ملک کے بسنے والوں کی بہت بھاری اکثریت مودودی صاحب کے مذہبی مسلک اور اعتقادات کی ہمنوا نہیں ہے تو یہ اقلیتی اعتقادات رکھنے والی جماعت کتنے دن مارشل لاء کے لیے باعث تقویت بنی رہے گی۔ یہی حال جمعیتہ العلمائے اسلام کا ہے اس کے اندر بھی ایک خاصا گروہ موجود ہے جو جمعیتہ العلمائے اسلام مودودی سے اتحاد کو ناپسند کرتا ہے کیونکہ دیوبندی قائدین اور خود جمعیتہ العلمائے اسلام کے بانی مولانا احمد علی کی سیکڑوں تحریریں موجود ہیں جن میں مودودی صاحب کے اعتقادات کو خلاف اسلام قرار دیا ہے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے اس کے انتشار کی داستان تو ہر محفل کا موضوع ہے اور اب تو مسلم لیگ ایک قصہ پارینہ بنتی جا رہی ہے اور اس کی زندگی صرف وزارت کے طوطے میں ہے جیسے ہی یہ اڑ گیا ویسے ہی مسلم لیگ بھی غائب ہو جائے گی۔

ایک طرف یہ دایاں بازو انتشار کا شکار ہے تو دوسری طرف بایاں بازو بھی کوئی کم پریشان نہیں ہے، بائیں بازو کی مختلف جماعتیں اور عناصر جن کا عوام میں اثر خاصا کم ہے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بھٹو کے خلاء کو پر کرلیں گے لیکن وہ طبقاتی کشمکش اور اس کی جدلیات کو سمجھنے سے انکار کر رہے ہیں، وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آج بائیں بازو کا کوئی بھی مؤثر متحدہ محاذ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا۔ جب تک کہ پیپلز پارٹی کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پیپلز پارٹی کی ابن الوقتی بجا، اس کے قائدین کی امریکہ دوستی بھی تسلیم، یہی نہیں اس جماعت میں اور لاکھ عیب موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ابھی تک غریب عوام کے دل کی دھڑکن ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا طبقاتی کش مکش سے انکار کرنا ہے اور طبقاتی کش مکش کی جدلیات کو تسلیم کئے اور سمجھے بغیر کوئی سماجی تبدیلی وجود میں نہیں آسکتی اور بھٹو زندہ رہے یا مر جائے تاریخ کا عمل ہر صورت تیز تر ہو گا۔

رُت کو آخر بدلنا تو ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اُس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصل دار و رسن ہوئے گی

ڈاکٹر سلیم اختر

مضطرب دائروں میں خطِ مستقیم

۱۹۷۷ء کا اختتام عارف عبدالمتین کی "وطن کے لئے ایک نظم" پر ہُوا تھا:

تِرے لئے ہے سکون میرا، تیرے لئے اضطراب میرا
مِرا مقدّر ہو سنگ تیرا، ہو تیری قسمت گلاب میرا
مِرے شب و روز کی مسافت ترے خیالوں کے دم سے طے ہو
تو ہی مِرا ماہتاب ٹھہرے، تو ہی بنے آفتاب میرا
مِری محبت پھوار بن کر برس پڑے تیرے دوستوں پر
مثالِ برقِ تپاں ہو نازل ترے عدو پر عتاب میرا

۱۹۷۸ء کا آغاز احمد ندیم قاسمی کی نظم "۱۹۷۷ء" سے ہُوا:

اُدھر موسم بدلتا ہے
اِدھر گل تو نہیں کھلتے، مگر پتھر جو یخ تھے، تپنے لگتے ہیں
اُدھر پتوں پہ شبنم آئینے بن کر اترتی ہے
اِدھر لوٹے ہوئے ذرّے کا جوہر
اپنے دانتوں میں لئے شہ رگ زمیں کی
دندناتا پھیر رہا ہے
جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا صرف اسی کے حکم سے ہوگا!
اُدھر کے اور اِدھر کے پاٹ میں انسان دب کر رہ گیا ہے
اور چکّی چلنے والی ہے!

اور چکّی چلنے والی ہے! یہ احساس ۱۹۷۸ء میں شدید سے شدید تر ہوتا گیا چنانچہ اس سال کی بیشتر تخلیقات میں جانے اندیشے اور انجانے خوف ذہن کو بانٹ کرنے والی پرچھائیوں کی طرح ملتے ہیں۔ جن ادیبوں کے ذہنوں، آنکھوں اور کانوں پر مہریں لگا دی گئیں ان سے قطع نظر سبھی تخلیق کاروں نے چکّی میں پسنے والی کیفیت اور اس سے وابستہ متنوع احساسات و جذبات اور خوابوں کی ترجمانی کی اور خوب کی! ۱۹۷۸ء کی تخلیقات میں سوچ اور جذبہ نے دو جہات پر اظہار پایا۔ ایک طرف پژمردگی، کرب اور یاس

ملتی ہے اور ان ہی کے حوالے سے اپنی زندگی اور عصر کی بے معنویت کا کلبلاتا احساس جنم لیتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اس ہونے کو نہ ہونے ہیں اور نا موجود کو وجود میں لانے کی تمنّا کا اظہار ملتا ہے۔ کبھی عزم کی صورت میں، کبھی خواہش کی صورت میں تو کبھی خواب بیداری کی صورت میں، چنانچہ منیر نیازی اس عزم کا اظہار کرتا ہے :-

ایک نگر کا نقش جلا دوں ایک نگر ایجاد کروں
ایک طرف خاموشی کر دوں ایک طرف آباد کروں
جا کے سنوں آثارِ چمن میں سائیں سائیں شاخوں کی
خالی محل کے برجوں سے دیدارِ برق و باد کروں
شعر منیر لکھوں میں اٹھ کر صحنِ سحر کے رنگوں میں
یا پھر کام یہ نظمِ جہاں کا شام ڈھلے کے بعد کروں

عصری تضادات کے بھنور میں گھرے ہوئے فن کاروں کی سوچ کے انداز میں خاصہ تنوع ملتا ہے۔ دھوکا کھا جانے کے بعد کی پژمردگی اور حال سے مایوسی تقریباً سبھی کے ہاں مشترک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے نتیجے میں جدید شعری ادب میں ذات کے کرب اور اندوہ کے جس گلیے نے رواج پا لیا تھا اس کے پہلو بہ پہلو مگر اس سے کہیں زیادہ قوی اور شاداب رجحان حال اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے بارے میں ایک واضح قسم کے ردِّ عمل کے اظہار کی صورت میں رونما ہوتا نظر آ رہا ہے یہ وہ اندازِ نظر ہے جو نفی پہ استوار ہونے کے باوجود احساسِ اثبات رکھتا ہے۔ اگر اس رجحان کو دیگر شعری رجحانات سے ممیز کرنا مقصود ہو تو بجا طور پر اسے ردِّ عمل کی شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جب کشور ناہید "تقریر نمبر ۲" کا آغاز یوں کرتی ہے، تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

میری آواز میرے شہر کی آواز ہے
میری آواز میری نسل کی آواز ہے
میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی
کیا سمجھ کے تم میری آواز کو شور کا نام دے رہے ہو
کس برتے پہ تم میرے اندازِ تخاطب کو مجنونانہ کہہ رہے ہو
کس زعم پر تم بڑھتے ہوئے طوفانوں کو نظر کا دھوکہ سمجھ رہے ہو

یہ احتجاج کی شاعری ہے مگر با اندازِ دگر!

احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، منیر نیازی اور کشور ناہید، ان چار شعراء کی نظموں میں عصری شعریات کے چار منفرد رجحانات ملتے ہیں۔ یہ نظمیں ان کے فن میں نئی جہت کے ساتھ ساتھ عصر اور اس سے وابستہ مسائل کے احساس اور پھر ان کے بارے میں ایک خاص نوع کے ردِّ عمل کے چار استعارے قرار پاتی ہیں۔ وطن کی محبت میں سرشار عارف متین اپنی دھرتی کو گلاب کی طرح نظر افروز اور دل نواز دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ رجحان جذبات نوازی کا ہے۔ اس کے بعد دوسرا

رجحان احمد ندیم قاسمی کے اشعار کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ یہ بصورت زمانہ بدلتے تاریخی حالات کے ادراک کا رجحان ہے اور اس کرب ناک احساس کا مظہر کہ — ادھر اور ادھر کے پاٹ میں انسان دب کر رہ گیا ہے! منیر نیازی کو موجودہ صورتِ حال کے جبر سے گھبرا کر خوش منظر فینٹیسی میں پناہ لینے کے رجحان کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ فرار کی شاعری نہیں بلکہ بے قراری کے لئے حصولِ قرار کا ایک انداز ہے اور منیر نیازی تنہا اس کا نمائندہ نہیں بلکہ جدید شعراء میں خاص تعداد ان پر مشتمل نظر آئے گی جو دل میں ایک نگر ایجاد کرنے کی تمنا کا دیپ جلائے ہیں۔ ان تین رجحانات کے نتیجہ میں ردِّ عمل کا انداز کشور ناہید کے ہاں روپ پاتا نظر آتا ہے۔ یہ احتجاج کا رجحان ہے۔ یہ اپنی آواز منوانے کا مطالبہ ہے کہ بعض اوقات آواز ہی وجود اور تحفظِ ذات کا ذریعہ قرار پاتی ہے یہ آواز محض احتجاج کی چیخ نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر تاریخی شعور کی حامل ہے کہ آنے والے طوفان کی خبر یا پنچھی کو ہوتی ہے اور یا کشف رکھنے والے کو! تو یوں کشور ناہید اور اس ایسا ذہن رکھنے والے شعراء اپنے اشعار سے تاریخی کشف کا کام لے رہے ہیں۔

یہ شاعری اعصابی تناؤ کی پیداوار ہے۔ یہ شاعری بے یقینی کی پیداوار ہے۔ یہ شاعری ماس ہسٹریا کی پیداوار ہے۔ لیکن ——— اور یہ لیکن بہت بڑی ہے کہ یہ شاعری روحِ عصر کا آئینہ ہے تاریخ کے جبر کا استعارہ ہے۔ یہ اس لئے کہ بعض اوقات اشعار کیکٹس کی صورت اختیار کر جاتے ہیں اور کیا پتہ کل کو شعر کی قومی پیداوار کا تخمینہ لگانے پر یہ کیکٹس ہی متاع ثابت ہوں

۲

اعجاز راہی نے جدید افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مجموعہ "گواہی" کا سرنامہ حضرت علیؓ کا یہ قول بنایا ہے:

> "میں نے اس وقت اپنے فرائض انجام دیئے جب دوسرے اس راہ میں قدم اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور اس وقت سر اٹھا کر سامنے آیا جب دوسرے گوشوں میں چھپے ہوئے، اس وقت زبان کھولی جب سب گنگ نظر آئے، گو میری آواز سب سے دھیمی تھی۔ مگر بسبقت و پیش قدمی میں سب سے آگے"

دیکھا جائے تو آج کے تخلیق کاروں کی اکثریت اپنے اپنے انداز اور لہجہ کے مطابق اسی منشور پر عمل پیرا نظر آتی ہے اور کمال یہ ہے کہ سب سے زیادہ سرگرمِ عمل جدید ترین افسانہ نگار نظر آ رہے ہیں آج تک علامتی اور بالخصوص تجریدی افسانہ مشکوک سا رہا ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ صرف اس بات کا کریڈٹ دیا جاتا تھا کہ یہ زندگی کی بے معنویت کو لایعنی سے اجاگر کرتے ہیں اور انتشارِ اقدار کو پراگندہ خیالی سے واضح کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح اس افسانے نے "آج" کو اپنے اندر سمویا اور جس طرح اس نے آج کی ترجمانی کی ہے۔ اس نے جدید افسانہ کو معتبر بنا دیا ہے۔ بلکہ اس نقطۂ نظر سے اگر عام روایتی افسانہ کو دیکھیں تو وہ خاصا بے شعور نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کی اساس حقیقت پسندی پر استوار ہوتی ہے۔

لیکن حقیقت سے خوف نے ہی علامتی اور تجریدی افسانے کو اگر ایک طرف نئی جہت عطا کی تو دوسری طرف بہت سے نئے لکھنے والوں کو اس طرف راغب بھی کیا اور ان نئے لکھنے والوں سے مراد نوآموز نہیں بلکہ وہ حضرات جنہوں نے روایتی افسانہ میں نام پیدا کر رکھا ہے اسی لئے تو ۱۹۷۸ء جدید افسانے میں فرگرمی کا سال ثابت ہوتا ہے۔ اب تک جدید افسانہ لاشعور کی بھول بھلیوں میں گم اور آزاد تلازمے کے پرچے پر اڑتا رہا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کے پاؤں زمین پر ٹک گئے ہیں اور اس لئے اس میں نئی توانائی اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ اب تک جدید افسانہ بے سمت تھا مگر اب اس میں منزل کا احساس فروزاں نظر آتا ہے۔ جس نے اسے نئی معنویت بخشی ہے۔

انتظار حسین، انور سجاد اور مسعود اشعر نے اپنے اپنے انداز میں افسانے کے جدید اسلوب سے بات کہنے یا بات چھپانے کا کام لیا۔ انتظار حسین کی علامتیں اساطیر اور قدیم داستانوں سے پھوٹتی ہیں اور یہ اس کا کمال ہے کہ اس نے سینکڑوں سال قبل کے واقعات کے ... سے علامات اخذ کر کے انہیں "آج" کا ترجمان بنا دیا ہے۔ "چکر" "دوسری دیوار" "کشتی" اور "خواب اور تقدیر" اس کے کئی افسانے کو کیوں نہ لے لیں۔ سب میں حال کی ماضی کے استعارے سے شناخت ہوتی ہے۔ چنانچہ "چکر" عمومی زندگی کی جس بے معنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسے "خواب اور تقدیر" میں زبان مل جاتی ہے اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ ہم مکہ جانے کا خواب دیکھتے ہیں، مگر ہمارے مقدر میں ہمیشہ کوفہ ہوتا ہے۔ تو عصری حوالہ سے یہ تلخ حقیقت تاریخی صداقت کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ تاریخی صداقت جس کا اظہار یوں ہوتا ہے:

"یاجوج" ماجوج بولا" ہمیں کبھی کبھی بولنا بھی چاہیئے کہ ہمیں کم از کم یہ تو یاد رہے کہ زبان کس کام کے لئے بنی ہے"۔

یاجوج کو ماجوج کی بات اچھی نہیں لگی۔ کہنے لگا "ماجوج بولنا کون سی کمال کی بات ہے۔ سب ہی لوگ جنہیں خدا نے زبان دی ہے بولتے ہیں مگر ہم بولنے سے بڑا کام انجام دے رہے ہیں"۔

"بڑا کام تو ہم انجام دے نہیں پائے"۔

ماجوج جل کر بولا" مگر اسی چکر میں ہم چھوٹے کام سے بھی گئے"۔

"میرے یار تھوڑا صبر کر، جو زبانیں اس دیوار کو چاٹنے کی سکت رکھتی ہیں وہ بول بھی سکتی ہیں۔ پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا جب ہم بولنے جوگے ہوں گے ..... (افسانہ "چکر")

اب ان سطروں کے ساتھ کشور ناہید کے یہ مصرعے ملا کر پڑھیں تو شاعر اور افسانہ نگار دونوں کا مسئلہ ایک ہی نظر آتا ہے:

میری آواز، میرے شہر کی آواز ہے!

جس طرح منیر نیازی نے شعر میں خوبصورت خواب دیکھنے کی تمنا کی اسی طرح مسعود اشعر کے افسانے "خواب" میں زندگی خوابوں کے سہارے کاٹنے کی تمنا نے کومل کومل طور پر اظہار پایا ہے۔ دونوں کا صبح اٹھ کر بچوں ایسا اشتیاق لئے ایک دوسرے سے پوچھنا "کوئی خواب دیکھا؟" ان کرداروں کے حوالے سے ہر حساس انسان کے المیے کا مظہر بن جاتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانے "خواب اور تقدیر" کے ساتھ مسعود اشعر

کے "خواب" کا تقابلی مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ انتظار حسین نے جس یاس اور ناامیدی پر افسانے کو ختم کیا مسعود اشعر کا "خواب" اس سے عاری ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ خواب ہی نائٹ میئر بن جاتا ہے۔ یاس اور ناامیدی مسعود اشعر کے ہاں بھی ہے مگر اس کے ہاں یہ یاس اور ناامیدی زندگی سے خواب نکل جانے کی بنا پر جنم لیتی ہے اور پھر "بتاشوں پر چلنے والے" میں اس نے اسی نائٹ میئر کو ایک اور روپ میں پیش کر کے اسے آج کا استعارہ بنا دیا ہے۔

"ستارے بہت ہیں اور وہ سب میرے دوڑتے پیروں کے نیچے ہیں۔ میں دوڑ رہا ہوں۔ تاروں بھرے کھیت ہیں — بتاشوں پر، جو پہلے بن پانی بھی گھل جاتے تھے مگر اب — پتھر ہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے، میرے پاؤں زخمی ہو چلے ہیں۔ پتھروں سے رگڑ کھا کھا کر اور میں دوڑ رہا ہوں۔ اب میرے اندر چٹیل میدان کی سنسان خاموشی ہجوم کرتی ہے اور وہ بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتی ہے۔ اب میں اکیلا نہیں ہوں تنہا نہیں ہوں ایک ہجوم ہے میرے ساتھ جو دوڑ رہا ہے۔ ماتھے سے ٹپکتے پسینے کی بوند بتاتی ہے کہ میرے اندر گرمی آگئی ہے اور اب یہ حرارت آگے بھی منتقل کی جا سکتی ہے۔ محبت کا یقین حاصل کرنے کے لئے کسی جواز کسی دلیل اور کسی وجہ کے بغیر؟"

مسعود اشعر کے افسانوں میں "ہجوم" اپنی ایک خاص معنویت اور مخصوص تلازمہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ہجوم کے اس مخصوص مفہوم کے تناظر میں اس افسانے کی یہ اختتامی سطور اور بھی گہری معنویت اختیار کر جاتی ہیں اور ہجوم ہی کا ایک اور حوالہ محمد منشا یاد کے افسانے "۱۹۷۰ء" کا آخری افسانہ "پناہ" میں یوں اجاگر ہوتا ہے۔

"ہمیں چھینکنے دو، ہمیں کھانسنے دو، ہمیں کھجلانے دو!"

"ہماری مرغیاں پتھریلے انڈے سہتی سہتی ہلکان ہو گئی ہیں۔"

"ہمارے سروں پر شکر دوپہر تن گئی ہے اور ڈھلنے کا نام نہیں لیتی"

اسے پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کون لوگ ہیں اور وہ ان کے ساتھ کیوں ہے۔ اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ جلوس نہ ہو جنازہ ہو۔ جنازہ! اسے جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ مگر کس کا؟"

انتظار حسین کے کردار فرد کے المیہ کے استعارے بنتے ہیں جو مسعود اشعر کے افسانوں کے خاموش ہجوم میں ڈھل کر ایک طرح سے SILENT FURY کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر منشا کے ہاں ہجوم زبان حاصل کر چکا ہے۔

۳

انور سجاد نے بہت PUNGENT انداز اختیار کیا۔ اس نے تجرید کو بھی تبلیغ کی زبان دی۔ "ماں بیٹا" "نئی کونپل"، "چھپکلی کی کٹی دم" بہت واضح سیاسی بصیرت اور ماحول کی گھٹن کے عکاسی افسانے ہیں۔

منظر الاسلام نے "گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی" "بارہ ماہ" "گنبد سے پرے کبوتر" اور "ہرا سمندر" میں بہت معنی خیز کنایوں سے کام لیا ہے بالخصوص اوّل الذکر اور موخر الذکر میں۔ "ہرا سمندر" کا مردسب کا

ہمدرد ہے جسے بارش میں بھیگتے ہر مکان اور گھر کی فکر ہے لیکن جو اپنے مکیں کی نگہداشت میں ناکام رہتا ہے۔ مظہر الاسلام کو کم لفظوں میں بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات اس کے افسانوں میں غزل کے شعر ایسی ایمائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

رشید امجد نے "پت جھڑ میں مارے گئے لوگ"، "ریزہ ریزہ شہادت" اور بالخصوص "دھند لکے میں عجیب ہانٹیڈ فضا تخلیق کی ہے۔ ایسی فضا جو عصری فضا کا عکس محسوس ہوتی ہے۔ کیا ہم "دھند لکے" کے مسافر کی مانند اکثر یہ نہیں سوچتے کہ "سڑک اتنی لمبی کیوں ہو گئی ہے؟" یا پھر یہ "یہ مجھے کہیں اور تو نہیں لئے جا رہی ہے" — لیکن پوچھیں کس سے کہ ٹیکسی کے اندر بیٹھ کر ٹیکسی ڈرائیور پر قابو نہیں رہتا۔

منصور قیصر نے "ایک بانسری ہزار نیرو" اور "نئی بشارت کا نوحہ" میں ان انسانی حسرتوں کا ماتم کیا ہے جنہیں زمانہ ڈس لیتا ہے اور اس طرح کہ ماتم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ "نئی بشارت کا نوحہ" میں منصور قیصر نے باغ و بہار کے درویشوں کو آج کی صورتِ حال کے بلیغ استعارے میں تبدیل کر دیا ہے — — درویش جو آنے والی رُت کی بشارت کے خواہاں ہیں مگر گلے میں لٹکی تختیوں پر سے نجات دلانے والا اسم اعظم مٹ چکا ہے۔

اعجاز راہی کی مرتبہ کتاب "گواہی" کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اس میں اعجاز راہی کا اپنا افسانہ "مبہم ظلمات" قابلِ توجہ ہے جس میں اکتیسویں منزل کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ جو مغرب سے چلنے والی ہواؤں کی زد پر یوں ہے۔ جیسے آندھیوں میں کمزور تنکوں سے بنا آشیانہ!

اسی کتاب میں مرزا حامد بیگ کا افسانہ "تربیت کا پہلا دن" شامل ہے۔ جس میں کاغذی تخریبی کارروائیوں، تہمد، تتر بتر عورتوں اور اکیس اور بائیس کے اعداد کو مرزا حامد نے نئے تلازمات دے کر افسانہ میں تحیّر کی فضا پیدا کی ہے۔

احمد داؤد نے "وسکی اور پرندے کا گوشت" میں ایک بہت خطرناک موضوع چن کر اس پر خوب واشگاف انداز میں لکھا، نہ علامت سے کام لیا نہ تجرید کا سہارا لیا۔ دو ٹوک بات کر دی۔

جن چند افسانہ نگاروں کا مجملاً تذکرہ کیا گیا۔ ان سب کے ہاں اگرچہ آج کی صورتِ حال کے خلاف ردِ عمل ملتا ہے اور جس میں لو کی دعا مانگنے کی حالت نظر آتی ہے۔ مگر اظہار اور تکنیک کے تجربات کے ساتھ پس پردہ سوچ اور اس سے وابستہ رجحانات کے لہر در لہر سلسلے بھی ملتے ہیں۔ جدید افسانہ آج جتنا با عمل اور پُر معنی نظر آیا ہے وہ اتنا کبھی بھی نہ رہا تھا— ہرچند کہ یہ تاریکی میں جگنو ہے مگر روشنی تو ہے۔

۴

سانپ جب بین سے باہر نہ نکلے تو بل میں پانی پھینکا جاتا ہے۔ مگر یہ سپیرے کی اپنی مہارت اور سوجھ بوجھ پر ہے کہ کب بین بجانی بند کر کے بل میں پانی پھینکنا ہے!



ہندوستان

ایشیا اور افریقہ کے لوگ ہم ادیبوں اور ثقافت کے علمبرداروں سے بہت توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ ہمارے کندھوں پہ ہمارے عوام کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ہمیں عوام کی توقعات ـــــ ـــــ اور خواہشات کی ترجمانی کا فریضہ حاصل ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہمارا مقدر، ہمارا ایقان، ہمارا مقصد اور ہماری زندگی، ہمارے عوام کے ساتھ ہے۔ اس لئے ثقافتی اور اخلاقی انقلاب کے لئے، ہم اپنے شعور اور ادراک کو وقف کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم عوام سے کئے ہوئے وعدے کو نہ تو اس وقت تک پورا کر سکیں گے، نہ مقاصد کے حصول کے کامیاب ہوں گے، جب تک کہ ہم اس جدوجہد میں اپنی ذاتی اور شعوری کاوش کو مربوط نہیں کریں گے۔ جب تک کہ ہم اپنے لفظوں اور قلم کو اپنے اوّلین ہتھیاروں کے طور پر استعمال نہیں کریں گے۔

یوسف السباعی ـــــــــ مصر

پابلو نرودا
ترجمہ :۔ علی سردار جعفری

امن کے لئے نظم

امن آنے والی ہر شفق کے لئے
امن پلوں کے لئے امن شراب کے لئے
امن ان شعروں کے لئے جو میرا تعاقب کر رہے ہیں
جو میرے خون کی لہروں سے اُٹھتے ہیں
اور میرے اگلے گیتوں کو
زمیں اور محبت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں
امن ان سب کے لئے جو زندہ ہیں
امن ہر سرزمین کے لئے ہر بہتے ہوئے پانی کے لئے
مگر مجھے اپنے چھوٹے سے سرد ملک کی سرزمین سے
اُگنے والے پیڑوں کی جڑوں تک سے محبت ہے
اگر مجھے ہزار بار مرنا پڑے
تو میں اس سرزمین پر مروں گا
اگر مجھے ہزار بار پیدا ہونا پڑے
تو میں اس سرزمین پر پیدا ہوں گا
بلند قامت صنوبروں کے قریب
وہاں جہاں جنوبی ہوائیں طوفان خیز ہیں

اور نئی خریدی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہیں
کسی کو میرے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے
ہمیں سارے کرّہ ارض کے بارے میں سوچنا ہے
آؤ میزوں پر محبت کے ڈھیر لگا دیں
میں نہیں چاہتا کہ خون دوبارہ
روٹیوں کو اور اناج کو اور موسیقی کو شرابور کر دے
میری خواہش ہے کہ سب میرے ساتھ آئیں
کان کن ننھی سی لڑکی
وکیل ملاح گڑیاں بنانے والے
سب میرے ساتھ آئیں اور ہم مل کر سینما دیکھیں
اور سرخ سے سرخ تر شراب پئیں
میں کوئی مسئلہ حل کرنے نہیں آیا ہوں
میں تو یہاں گانے آیا ہوں
اور چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ گاؤ

پابلو نرودا
ترجمہ :- علی سردار جعفری

نظم

(ایک اقتباس)

(۱)

رات کے وقت سویا ہوا مزدور اپنی نیند سے جاگتا ہے
اور اندھیرے کے دل میں اپنا ہاتھ ڈال دیتا ہے
وہ پوچھتا ہے
اے صبح اے صبح کے سورج
اے تھرتھراتی ہوئی جھلملاتی ہوئی روشنی
اپنے روشن ہونٹوں سے یہ بتا
کیا عوام کے بے داغ ہاتھ پہلے کی طرح
اپنی عزت اور غرور کے قلعے کی حفاظت کر رہے ہیں
جواب دے اے صبح
کیا لوہا پہلے کی طرح اپنی طاقت کے شعلے کو تیرے چہرے کے سامنے لہرا رہا ہے

(۲)

جب تیرا دل ہزاروں گولیوں سے زخمی ہے
جب اسے اسٹالن گراڈ
زہریلے بچھو تیرے دل پر ڈنگ مارنے کو تیار ہیں
اس وقت نیویارک ناچ رہا ہے
لندن سوچ رہا ہے
لیکن میں صرف ایک لفظ کہتا ہوں
——— بدمعاش
اب میں اس دنیا کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا
اب میں اس دنیا کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا
اب ہم اس دنیا کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتے
جہاں سورما تنہا جان دے رہے ہوں

کمار پاشی

آزاد شہری : ایک تعارف

وہ مرنے پہ راضی نہیں تھا
بڑا ڈھیٹ تھا
شاہی فرمان پر
اس نے اپنی زباں کاٹ لی تھی

وہ آنکھوں سے اندھا تھا
کانوں سے بہرا
اسے اپنے چاروں طرف
دیکھنے کی اجازت نہیں تھی
سماعت پہ پابندیاں تھیں
مگر شاہی دستور میں
ذکر ایسی کسی بات کا بھی نہیں تھا

وہ آزاد تھا
اپنے گھر کی حدوں تک
بدن کی تہوں تک
وہ آدھا ادھورا تھا
دل اس کا
گہرے عذابوں سے خالی نہیں تھا
سنا ہے وہ اس پر بھی
مرنے پہ راضی نہیں تھا

وہ خوش تھا کہ اس ملک کے
شاہی دستور میں
اس کو آزاد لکھا گیا تھا

باقر مہدی

لفظ ـــــ بیکار ہیں

حکمرانوں کی ثقافت کے امیں
ایک ہی سانس میں دونوں باتیں

"لفظ بیکار ہیں
صرف جمہوری قصیدوں کی ضرورت ہے"

ع۔ رشید

نظم

ہم اس شہر میں
تجہیز و تکفین کے لئے آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں
ہمارے کارکنوں کی انتظامیہ صلاحیت سارے علاقے میں مشہور ہے
ہمارے گزشتہ گاہکوں کی فہرست طویل غیر معمولی اور مؤثر ہے
ہمارے مرمریں کتبوں کا جواب نہیں
نوحہ خوانوں کا انتظام بھی ہم ہی کریں گے
دعائے مغفرت کے لئے بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں
ہمارے کارکن ہر وقت موجود ہیں
ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ ہمارے دام معقول اور مناسب ہیں
اور
اس موسم میں
نہایت ہی کم قیمت پر
پاؤں پھیلانے کو
ایک پر سکون گوشے کی یہ پیش کش
صرف
دوستوں اور نیک لوگوں کے لئے ہے

بنگالی نظمیں

سنیل گنگو پادھیائے [1]

وہ لڑکا اور میں

اس لڑکے کی آنکھوں میں حوصلوں کا ثبات جھلملاتا ہے
اس کے ہونٹوں میں غصیلی روح کا ساعقہ
وہ خواب دیکھتا ہے رائفلیں اُٹھانے کا
میں خواب دیکھتا ہوں اس میں اپنے لڑکپن کے !
اپنے لچکیلے چھریرے بدن کے ساتھ وہ لڑکا
لپکا برآمدے سے گلی کی جانب
آنسو گیس اور آگ کی لپٹوں کے گورکھ دھندے میں
ناوقت ——
وہ دوڑتا جاتا تھا ٹھیک میرے اپنے لڑکپن کی طرح !
لڑکے کا لباس تار تار، ماتھے پر لہو کے دھبے
پھر بھی اس نے ہار نہ مانی
تباہی کی آگ میں سپنے دیکھتا
نوکیلی آواز میں چلاتا ہے، "انقلاب، زندہ باد!"
سڑک کے دوسری طرف سے سنائی دی
مجھے اپنی ہی آواز

---

[1] سنیل گنگوپادھیائے: پیدائش ۱۹۳۴ء۔ کرتی باس کے مدیر۔ کہانی اور ناول لکھتے ہیں۔ ان دنوں ایک اہم روزنامے سے متعلق ہیں۔

پرسن کمار مکھوپادھیائے[1]

کلکتہ احسان فراموش ہے

ناشکرے کلکتہ، تم اپنی ترقی اور اپنے نظم و نسق سے چمٹے ہوئے ہو
——تم آرام سے بیٹھے ہوئے ہو، اپنی للت کلاؤں، ‌رابندر بھون،
کلامندر کے بیچ، اور تمہارے پیچھے، باغی جوانوں کی لاشیں، لہو
اور ہڈیاں دبی ہوئی ہیں، فٹ پاتھوں پر، حوالاتوں میں تمہارے مہذب شہری
بھکاری کے چولھے پر، ہر روز پانی انڈیل دیتے ہیں —— اور ہوائی حملوں کا کوپ
جاری رہتا ہے
بلیک آؤٹ کی مشقوں کے ساتھ۔ انہیں اس سب کا مزہ لینے دو——
"امن دستے کے لوگوں نے کس طرح کسان لڑکیوں کی عصمت دری کی
جبکہ وہ انہی کے لئے چاول چھپا کر لائی تھیں——"
انہیں اس سب کا مزہ لینے دو——"نوکری سے نکالا ہوا مزدور کس طرح بھاگ کھڑا ہوا
پولیس کی گاڑی دیکھتے ہی فٹ پاتھ پر اپنی لوٹ کا مال چھوڑ کر——"
انہیں مزہ لینے دو—— آج اس سب کا مزہ لینے دو

اس لئے کہ لہو سے سینچی دھان کی کھیتی کسان کی کٹیا تک پہنچ نہ سکے
اس لئے کہ استحصال جاری رہے اور درندے پنپتے رہیں،
ہر گاؤں کو ابھی کچھ اور چاہیئے —— (اب ہم چپ ہو جائیں)
اور اسی کارن یہ ضروری ہے کہ شہروں کا نظم و نسق قائم رہے
پس کلکتہ، —— تم اپنی ترقی، اپنے نظم و نسق سے چمٹے رہو
اپنے یُوا وانی سیمنار، بٹک، ڈہلیا اور روزمرہ کے دوسرے پردرشنوں سے

---

[1] پرسن کمار مکھوپادھیائے: چھٹے دہے کے ایک معروف شاعر۔ نئی بنگالی شاعری کو ایک واضح سمت دینے میں سرگرم

نارائن سُرودے

میرے وطن کی کتاب اندراج میں میری رائے

خروشچیف ـــــــــ کینیڈی ـــــــــ ناصر وغیرہ وغیرہ
اِن کے ساتھ میرا نام؛ واقعی یہ ٹھیک نہیں
اس لئے پچیسویں ورق کو عبور کر کے
چھبیسویں ورق پر گلاب کا پھُول رکھ کر
میں آغاز کر رہا ہوں ـــــ

اے میرے وطن!
سُورج کے خاندان کے رکن ہم بھی ہیں، اس لئے
سُورج کے خاندان کے شایانِ شان برتاؤ لازمی ہے ـــــ

ویسے آج میں خوشی سے شگفتہ نہیں ہوا
اُداس بھی نہیں ہوا
ان دونوں کے درمیان کسی جگہ اے وطن!
ہم ایستادہ ہیں
شاید، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تُو اور مَیں
دونوں ہی بالغ ہو چکے ہیں
میں یہاں آنے کے لئے نِکلا تو، اُس وقت
مجھ پر سبز درختوں نے شہر کی سرحد تک
شفقت کا سایہ کیا
ندیاں سُکڑتی سِمٹتی پیچھے ہی ٹھٹک گئیں
مجھے پہنچانے کے لئے، مجھ سے بھی آگے
پتے پھڑپھڑاتے پھڑپھڑاتے پنکھ لگا کر دور اُڑ گئے
راستے میرے آگے چل رہے تھے

مگر اُن میں سے ایک
بڑا ہی باتونی شخص لگا
تم کو راستا معلوم نہ ہو تو،
میں بتائے دیتا ہوں، ــــــ کہتا ہوا وہ مجھ سے آگے چل پڑا

اے میرے وطن!
یہ قریوں سے اُبھرتے ہوئے بڑے بڑے شہر
ان کے بار بار کھلتے اور بند ہوتے ہوئے اندھیرے اُجالے کے دروازے
اطراف کے سرسبز دیہات
بچھڑوں جیسے، تھنوں پر جھپٹتے ہوئے اور ....
اِن میں سے کوئی مستی میں رسّی تڑاتا ہوا
یہ راستے، یہ خون کی شریانیں اور
یہ اپنا وسیع و کشادہ شہر
کھولتے ہوئے بوائیلر جیسا، یہ اپنا دل
تیرا اور میرا
خوشی میں نہار رہا ہے
تارے کی مانند چمک رہا ہے، تیری انگلی میں
ہیرے کی انگوٹھی جیسا یہ شہر دمک رہا ہے
کیا تو نے کبھی
بحیرۂ عرب کے ساحل سے اپنا سراپا دیکھا ہے؟

سورج کے خاندان کے ہم رکن ہیں، اس لئے کہہ رہا ہوں
یہ جو آسمان ہے نا؟
اس پر رنگوں کے چار ہاتھ پھیرنے کی ضرورت ہے
سورج کے سُرخ گولے کا رُخ
بھیلائی کی دہکتی بھٹی کی طرف پھیر دینا چاہیے
سمندر کو خالی کر کے

اس کا بھی کوئی اچھا سا نام رکھ دینا چاہیئے
کھیتوں کے ٹکڑے جھٹک کر، ان کو پھر
قرینے سے بچھا دینا چاہیئے
اور اسے وطن ! ــــــ وطن کسے کہتے ہیں ؟
ہمیں اس کا بھی ہوش رکھنا چاہیئے

لوک سبھا میں تجویزیں پیش ہونے سے پہلے، وہ
دامنِ کوہ کے پتّوں کے کچے سائے میں
کڑکڑاتے بادلوں کی نمی میں
لاٹونی کے مٹیالے ہاتھوں میں پھڑپھڑائیں

اُن کو کارخانے کی طرف بھیج دیا جائے
بیچ کے وقفے میں، لیتھ سے ٹیک لگا کر
کوپن پر ملنے والی چائے، کیتلی میں سے لیتے دیتے ہی
بحث کرتے کرتے ــــــ ناخواستہ الفاظ
فولادی چمٹے میں پکڑ کر
ہتھوڑوں کی ضرب سے از سرِ نو ڈھال لئے جائیں

ان کو گانو سے باہر کی بستی میں بھیج دیا جائے
چمڑا کماتے کماتے
پانچ دس ٹانکے وہاں بھی ڈال دیئے جائیں
اور وہ، اس طرح نہ آئیں
جیسے خشمگیں چہرہ لئے ہوئے کوئی وائس چانسلر
کسی یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوتا ہے
وہ اسی طرح آئیں
جیسے یار کے آتے ہی خوشبو پھیلنے لگتی ہے

اے میرے وطن!
ہم سورج کے خاندان کے رکن ہیں، اس لئے کہہ رہا ہوں
عورت: محض ایک نشہ آور اور جذبات انگیز شے ہے
آج کی خاندانی نگاہوں کے دیکھنے کے انداز سے یہی مفہوم نکلتا ہے
پھول والے کے پاس کی وہ ایک پڑیا
ایک جھمکا، ایک گڑیا، اُوہ.......
اے وطن! مَیں شرم کے مارے گڑتا چلا جا رہا ہوں

یہ! اور ایسی کتنی ہی یادیں دُہرا کر
اندرون میں پٹرول سا جمع کئے ہوئے چل رہے ہیں
اگر کبھی.........کسی وقت
ہم، جو بے سکون و مضطرب ہیں
جسموں کی بتّیاں بنا کر انہیں جَلائیں؛ اور
اُن سے تیری آرتی اُتار کر
ایک نئے انقلاب کی جانب
ایک نئی روشنی کی طرف،
اپنے گھوڑے دوڑا دیں تو، اے وطن!——
ہمیں احسان فراموشی کا الزام نہ دینا
تیرے آسمان کے ستارے ہم بھی ہیں، یہ
بھول نہ جانا

پنج سنگم

اسعد زیدی

اس بارش میں

اس بارش میں کیا کیا گرا دھرتی کی آگ پر
آگ پر آگ، آگ پر آگ، آگ پر آگ
برسیں ہم پر زہر کی ہزار قسمیں دماغ میں پھیلتی ہوئی
آباؤ اجداد! تم نے کیسے نبھائے تھے رشتے
آباؤ اجداد! تم نے کیسے جھیلا تھا آگ کی بے شمار بوچھاڑوں کو
آباؤ اجداد! تم نے کیسے کیا تھا زندگی سے پیار
ہم چاہتے ہیں
پھولوں اور بچوں کے بارے میں باتیں کرنا اس بارش میں
جو ہمارے آس پاس نہیں ہیں اس وقت
اسلحہ اور سیاہ الفاظ کے قافلے میں اپنی ہڈیوں کے ڈھانچے جھلاتے
ہم ڈھونڈ رہے ہیں سبز چیزیں، اس بارش کے باوجود
ہم جو نہیں جانتے وہ جاننا ہے ہمیں، اس بارش میں
ساون بھادوں کی بوچھاڑیں ہوں، ہمارے غصّے کی لے پر بھاگتی ہوئی
ہمیں جھکے ہوئے سایوں کے جنگل سے اٹھنا ہے آواز کی طرح
جو روٹی اور پیار میں تبدیل ہو جاتی ہے
ہمیں پوچھنا ہے اس بارش میں
اساڑھ کے پہلے دن کس نے کیے تھے قتل
کس نے چھین لیں، ہم سے ہماری عورتیں
اساڑھ کے پہلے دن کس نے غلام بنائے ہمارے بچے
اس بارش میں ہمیں کوئی سوال نہیں چھوڑنا ہے، اگلے وقتوں کے لئے

پیدائش اور پرورش مظفر پور (بہار) عمر اٹھائیس سال آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔

پنجابی نظم

پہچان

افسر چلّایا
"بُڑھیا!
بھوک سے چلّاتے لوگوں کو
ورغلانے اور گمراہ کرنے والے
ملک و قوم کے غدار وہ سامنے کھڑے ہیں
ان میں سے پہچان لو
اپنے بیٹے کو......"

جھرّیوں بھرے چہرے پر
بُجھتی آنکھوں کے ساتھ
ان باغیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے
ماں نے کہا:
"مجھے تو یہ سب اپنے ہی بیٹے لگتے ہیں"

نظم

صدیوں کا سفر کرتی انسانیت
نہ جانے کیا کھو کر آئی ہے
راہوں میں
بہت کچھ سنگسار ہوا ، بہت کچھ زندہ جلا دیا گیا
لیکن شکر ہے کہ وہ پھر بھی ،
آگ کے دریا عبور کر کے
اور پتھریلے ، اجاڑ بیابانوں میں سے ، ننگے زخمی پیروں کے ساتھ گزرتی

بہت کچھ بچا لائی ہے
آئیے ہم سب اس بہت کچھ کو سلام پیش کریں
جو کسی کسی پیشانی پر ، ایک لکیر کی طرح دکھائی دیتا ہے

اور انسانیت کی فتح کا اعلان کرتا ہے

جوگا سنگھ
—— ترجمہ ——
احمد سلیم

پنجابی نظم

جھنڈو موچی کی گواہی

پنجایت! میں ٹھیک ہی کہتا ہوں، گٹو کی سوگند
ٹھیک ہی کہتا ہوں
آپ سے کیا چھپانا، پنچایت تو خدا کا روپ ہوتی ہے! اور آپ سے چھپا ہوا بھی کیا ہے؟

آپ اس وقت بھی جانتے تھے کہ پچھلے سال کشنے کھوجی نے،
بھری محفل میں سرداراں کے بیٹے کو گالیاں کیوں دی تھیں؟
آپ کو اب بھی معلوم ہے کہ اس کی گائے جیسی بیوی،
کلکتہ کے سوناگاچی[1]، میں کیسے پہنچ گئی
گائے ہوتی تو میں بھی سمجھ جاتا کہ بیچاری پچھتے ہوئے زندہ ہی تل گئی ہوگی
اور اس کی کھال، کب کی، باٹا کے چمڑے کے کارخانے میں رنگ دی گئی ہوگی
لیکن وہ گائے نہیں تھی، گائے جیسی تھی
اور کشنا کھوجی چوری ہونے والی گائے کا کھوج تو لگا سکتا تھا، گائے جیسی عورت کا سراغ —
اور کلکتے کا سوناگاچی، اس کی پہنچ سے بہت دور تھا، پنچایت!

خیر چھوڑیئے! اس بے چاری بیوہ کی کیا بات کریں
اس کا پیٹ چلتا ہے، روئیں دار بال پلتے ہیں
بچے تو خدا کی نعمت ہیں، ان کی پرورش کرنا تو گاؤں والوں کا فرض بنتا ہے

---

[1] کلکتہ کا چکلہ

لیکن میں کیا کروں پنچو! بب روپ انسانو!
جب سامنے والی کوٹھڑی میں سے، ایک پراسرار مردانہ آواز آتی ہے
اور میرے فالج زدہ باپ کا آدھا بدن تپنے لگتا ہے
اور اس کا واحد زندہ ہاتھ کھونٹی کی طرف بڑھتا ہے
تو میں شرم کا مارا لحاف میں دبک جاتا ہوں
آپ سب کچھ جانتے ہیں کہ میں اندھیرے ہی میں کیوں گھر سے نکلتا تھا
میری نظریں ہر وقت زمین میں کیا ڈھونڈتی رہتی تھیں
اور پھر مجھ سے رہا نہ گیا پنچایت! مجھ سے رہا نہ گیا
کل جب میری رولو کی پہلی چیخ، اس کے سسرال کی کوٹھڑی کی کچی دیواروں کے بجائے
سرداراں کے کالے سیاہ، پکے ہوئے باجرے کی فصل نے سنی تو مجھ سے رہا نہ گیا
تم سب کچھ جانتے ہو لیکن خاموش ہو، لیکن تم نہیں جانتے کہ تمہاری چپ نے ایک باپ سے
اپنی ہی بیٹی کی عصمت دری کی بات، پنچایت میں کہلوادی
معاف کرنا! اس بھیانک گناہ کے لئے مجھے معاف کرنا

مراٹھی شاعر:۔ مر دھیکہ
ترجمہ:۔ کشور ناھید

کیا کوئی کسی کا نہیں ہے

اگر کوئی کسی کا نہیں ہے
باپ، بھائی یا کزن
پھر کیا طلسم ہے
اس گردشِ کائنات میں
ماں، بچے کو چھاتی سے کیوں لگاتی ہے
اور باپ کیوں شفقت سے پیش آتا ہے
کسی چھنال پہ دل آجانے پہ
افسوس کیوں ہوتا ہے

اگر کسی نے کچھ نہیں دینا ہے
تو پھر دل کیوں دُکھتا ہے
یا ترحم سے پارہ پارہ ہوتا ہے
قربان ہونے اور جان دینے کا
یہ کیا سلسلہ ہے
او خدایا
تم نے یہ کیا تماشہ رچایا ہے
سخت پلاسٹر کے ذریعہ
سینے سے سینہ جڑ جاتا ہے
یہ نازک ساخت

یہ صرف ایک خوشنما فریم ہے
ہلاکت کے لئے
وہ سرابوں کا ایک طویل مامن
پھر، مسکن کہاں ہے
جو طلسماتی دستگیری سے مزین ہو،
جس میں کہ ابد کے سہاروں کی شاخ لگائی گئی ہو
اگر کہیں
کوئی ایسا مسکن ہے
جس کی سیڑھیاں فقید المثال
اور جس کی اینٹیں اور گارا، چونا
لازوال ہیں
پھر اے خدا
میں تجھ سے بے محابا پوچھتا ہوں
"تم نے ہڈیوں کا ایک محل پتھروں پہ کھودا ہے
جس میں تم نے یہ کمزور اور نحیف نوجوان
قید کیا ہے
کیوں
ساری کائنات میں سے
تم نے صرف اس سرزمین کی اختراع کو
شیشے کے گھر میں تجسیم کیا
اور انسان کو
شیشے کے گھر میں رہنے والے کرایہ دار کی طرح
وضع کیا

دلبیر دیپک
احمد سلیم

بھاجی[1]

یہ جو گولیاں بوتے ہو،
بھوک کے پیٹوں میں
جب جڑیں بن کر پھیلیں گی
تو گھر گھر بارود کے پھل لگیں گے
اور آج بارود کی بھاجیاں بانٹنے والو!
یاد رکھو
ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں
کہ بھاجی بھی نہ اتار سکیں

---

[1] بھاجی۔ پنجاب کی برادریوں میں کھانے پینے کی چیزوں کے تحفے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا سماجی قرض ہوتا ہے۔ جسے حسبِ موقع واپس کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

کملیشور
ترجمہ: احمد سلیم

اتنے اچھے دن

سچ مچ اتنے اچھے دن تو کبھی نہیں آئے تھے۔

قریب ہی اگر ہڈی گودام نہ ہوتا تو بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ سب کچھ بڑھیا تھا۔ پاس ہی تین چار گاؤں۔ دیہات کے درمیان خشک چراگاہیں۔ اتنے سارے رشتہ داروں کے گھر —— تین کوس کے فاصلے پر بہتی ہوئی ندی —— اونچے ٹیلوں والی روہیاں —— قریب سے گزرتی ہوئی بستی کی سڑک —— سڑک پر بنا ہوا ٹرکوں کا اڈہ —— اڈے سے ایک آدھ میل کے فاصلے پر ہڈی گودام —— وہاں سے تین میل دور اسٹیشن۔

چاروں میں اگرچہ اتنے سارے رشتہ دار اور چوپائے نہ ہوتے تب بھی بات نہیں بنتی تھی۔ اگر بیس میل کی مسافت پر شکر کی ملیں نہ ہوتیں تب بھی بڑی الجھن پیدا ہوتی تھی۔ اگر سڑک اونچے نیچے ٹیلوں والی روہی سے نہ گزر رہی ہوتی تو پھر بھی ٹھیک نہ ہوتا۔

گھر میں اگر چھوٹی بہن کملی نہ ہوتی تو کام کیسے چلتا۔ اس اجاڑ روہی سے اگر ٹرک نہ گزرتے تو بھی بڑی مشکل پیش آتی تھی اور اگر بنتا سنگھ ڈرائیور رات کے اندھیرے میں کملی کو نہ اٹھائے جاتا تو اس کی تمام زندگی ہی برباد ہو جاتی تھی۔

سب کچھ اچھا ہی ہوا تھا۔

سب سے اچھی بات تو یہ ہوئی کہ علاقے میں تیسرے سال بھی قحط پڑ گیا۔ اگر قحط نہ پڑے تو آدمی گھر سے ہی نہیں نکلتا۔ جن کے اپنے کھیت ہوتے ہیں وہ تو اندر باہر جا آ بھی لیتے ہیں۔ جن کے اپنے کھیت نہیں ہوتے ان کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا وہ کھیت والوں کی چاکری کرتے ہوئے گاؤں تک محدود رہ کر مر جاتے ہیں۔ ہر جگہ یوں ہی ہوتا ہے۔

کملی کے لئے تو اور بھی اچھا ہوا۔ وہ گاؤں سے باہر کہاں جا سکتی تھی۔ بالا کے لئے تو پھر بھی یہ تھا کہ وہ ایک آدھ گاؤں گھوم سکتا تھا۔ ندی تک ہو آتا تھا۔ پانچویں جماعت تک پڑھتا بھی رہا تھا۔

بالا بغیر پوچھے ندی تک جا سکتا تھا۔ اگر پوچھتا تو دادی گھرکیاں دینے لگتی —— "ندی پر مت جایا کر۔ اگر چلے بھی جاؤ تو نہانا ہرگز نہیں ——" دادی بولتی رہتی اور پیر کی انگلی میں پہنے ہوئے کانسی کے چھلّے کو گھماتی رہتی —— شاید چھلّا اسے چبھتا رہتا تھا۔ دادا کا بھی یہی خیال تھا۔

وہ دونوں یہ بات نہیں مانتے تھے کہ ندی پر جا کر نہیں نہائیں گے لیکن بالا ندی میں اترتے ہوئے ہمیشہ ڈرتا رہتا

اوپر سے دادی جھوٹ بولتی تھی ــــ ’’کہاں ماں پانی کا رنگ نہیں ہوتا۔
بالا ہمیشہ کہتا ــــ دادی، میری بات سن۔ میں دیکھ کر آیا ہوں پانی کا رنگ سرخ ہے، لہو کی طرح سرخ۔
دادی قہقہہ مار کر ہنس پڑتی ــــ کیسی باتیں کرتا ہے تو ــــ پانی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ تو ندی پہ نہ جایا کر۔ اگر چلا بھی جائے تو نہانا کبھی نہیں۔
دراصل دادا دادی کی یہ باتیں بالا کو اب یاد آتی ہیں۔ ہنسی بھی آتی ہے۔ ان کے پاس اور باتیں بھی کون سی تھیں کرنے کے لئے؟ اپنے پاس تو بہت کچھ کیا، سب کچھ ہے۔
سردی سالی کچھ زیادہ ہی تھی۔ جدھر سے بھی لحاف ذرا اُتر جاتا، ہوا ارجن کے تیر کی طرح لگتی کملی کھلکھلا کر ہنس رہی۔ اسے محسوس ہوا ــــ چلو سب ٹھیک ہے۔ کملی خود تو پیتی نہیں لیکن ڈرائیوروں کی بوتل میں سے دو چار گھونٹ بچا کر رکھ لیتی ہے۔ اس کے لئے ــــ اور کیا چاہیئے۔
سالے کلینر نے کچھ زیادہ ہی شور مچا رکھا تھا نہ خود سوتا تھا نہ کسی اور کو سونے دیتا تھا۔ بار بار بیڑی سلگاتے ہوئے کھانستا۔ لحاف کھینچتا۔ اگر اتنی ہی سردی لگتی ہے تو موبل آئل ڈال کر دُھونی دھالے۔ سونے کون دیتا ہے سالا۔ کتنی بڑھیا نیند آتی ہے اس سرائے میں۔ کملی کی وجہ سے سب ٹرکوں والے بستیاں چیر کر سیدھے یہاں آجاتے ہیں۔
ٹرک سرائے کے مالک نے بھی پورا انتظام کیا ہوا ہے۔ بڑے سے احاطے کے گرد چاردیواری کھینچ کر سرائے بنائی ہے۔ باہر بھی دس بارہ ٹرک ٹھہر سکتے ہیں۔ دن میں کھانا کھانے کے لئے میز اور بنچ بچھ جاتے ہیں اور رات کو چارپائیاں۔ تھکے ہارے ڈرائیور اور کلینر دن کے وقت بھی گھڑی بھر کے لئے سستا لیتے ہیں۔ رات بسر کرنے کے لئے تو پورا انتظام ہے ہی۔
ہر قسم کا کھانا ــــ مرغ کھانا ہو تو سامنے ڈربے میں سے چھانٹ لیجئے۔ اپنے سامنے پکوا کر کھائیے۔ بیڑی سگریٹ کی بھی کمی نہیں۔ گراموفون بھی بجتا رہتا ہے۔ اگر دانت کچکچانے والی تصویریں دیکھنی ہوں تو بہت سی لگی ہوئی ہیں۔ بھگوان کی تصویریں پسند ہوں تو وہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ گوربانی سننی ہو تو ریکارڈ سن لیجئے۔ عورتوں کی تصویریں دیکھنی ہوں تو وہ بھی حاضر ہیں۔ کپڑے دھونے کا انتظام بھی ہے۔ ٹیوب ویل لگا ہوا ہے۔ سُکھانے کے لئے تار لٹکا ہوا ہے۔ جنگل پانی جانے کے لئے خشک کھیت پڑے ہیں۔
ــــ اوئے تو اُٹھ کر کیوں بیٹھ گیا؟ صبح ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ سردی لگ رہی ہے؟ مجھے بتا ــــ بیڑی تو دیکھو، سالا کیسے پی رہا ہے ــــ؟ بیڑی کے جلتے گل کی روشنی میں آنکھیں کیسے چمک رہی ہیں کتوں کی طرح ــــ لکھن کلینر کی۔
کُتا بھی سالا بہت بڑھیا جانور ہے۔
قحط پڑنے پر بھی نہیں بھاگے۔ گاؤں کی روہی میں ہی لاشیں چباتے چباتے مر گئے۔ گِدھ سالا بہت تیز ہوتا ہے۔ چار پانچ کُتے پیچھے نہ پڑیں تو ایک گِدھ کو لاش سے ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے۔
تو یہاں آیا کیسے؟ لکھن نے پوچھا۔

—— تو پہلے بیڑی پھونک لے، اچھی طرح کھانس لے۔ بتاتا ہوں پھر۔ بالا نے کہا تھا۔

—— ہاں بتا۔

—— تو سُن، نیند کیوں نہیں آتی تجھے۔ اچھا، اچھا سن، یہ کملی میری بہن ہے ناں ۔۔۔۔ ایک شام ۔۔۔۔

—— سچ؟ اور لکھن کملی کی بات پر ہی رک گیا۔

—— اوئے اور کیا؟

—— کملی لڑکی اچھی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ ڈرائیور کہیں بھی رکیں۔ اسی کی بات کرتے ہیں ایک رات ٹرک بگڑ گیا تو ہم نے ہی اسے سمجھایا ۔۔۔ یہاں سے دس کلومیٹر دور ہے۔ اُدھر جاتا کوئی ٹرک پکڑ لے۔ صبح واپس آ جانا۔ میں تو ہوں ہی۔ پھر لدے ہوئے سامان کی ذمہ داری بھی تھی۔ اسی لئے وہ نہ گیا۔

—— اچھا! تو سن ۔۔۔۔ سالی بوری میں سے بہت بو آ رہی ہے۔ پہلے اسے پرے ہٹا دیں۔

—— کیا ہے اس میں؟ لکھن کلینر نے پوچھا تھا۔

—— سالی ہڈیاں ہیں!

بات لکھن کلینر کے پلے نہ پڑی۔ بیڑی پی کر کھانسنے لگا —— سردی میں اٹھنے کی ہمت نہ ہونے کے باعث اس نے بوری میں سے آتی بو کو برداشت کر لیا۔ جب کلینر بیڑی پیتا ہے بدبو دب جاتی ہے —— بیڑی پھینک کر وہ اونگھنے لگا —— مجھے کیا ضرورت ہے قصہ سنانے کی سو، سو سالے ۔۔۔۔

صبح اٹھتے ہی بتھول کی ٹہنی توڑ کر بالا نے مسواک کی —— لکھن آرام سے سو رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی —— ایک ڈرائیور لحاف میں ریچھ کی طرح ہلا —— اس نے اُٹھ کر چادر باندھی اور دونوں بانہیں چھاتی کے ساتھ جوڑ کر باہر چلا گیا۔

لکھن کا ڈرائیور بنتا سنگھ پہلے ہی سے اٹھ بیٹھا تھا —— وہ باہر سے ہو آیا تھا —— چھپر میں کملی گٹھڑی بنی سو رہی تھی۔ اس کی چارپائی کے پایوں پر بنتا سنگھ کی پگڑی سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

جلدی اسے بھی تھی —— اس نے بوری اٹھائی اور ہڈی گودام کی طرف چل پڑا —— سالی بوری میں سے بڑی بدبُو آتی ہے لیکن پیسے تو خوب بنتے ہیں ۔۔۔۔ کملی بھی چار پانچ روپے کما لیتی ہے —— ایک آدھ روپیہ ہڈیوں کی بوری کا بھی مل جاتا ہے۔ چھ روپے روز کون سالا کماتا ہے؟

یہ تو اچھا ہی ہوا کہ چینی کی ملیں کھل گئیں اور یہ ہڈی گودام بھی —— چینی کو چمکانے کے لئے شورے کی ضرورت ہوتی ہے —— پتہ نہیں ان خشک ہڈیوں میں کہاں سے نکلتا ہے —— نکلتا ہو گا ۔۔۔۔

گودام کے ترازو میں بوری لٹکا کر اس نے چندو کو موٹی سی گالی دی —— تولنا تو ۔۔۔۔ یہ سالی سردی ۔۔۔۔ چندو کہیں نظر نہ آیا —— پھر وہ گودام میں بھری منوں ہڈیوں میں سے آتا دکھائی دیا۔ جیسے پنجر چلا آ رہا ہو۔ اس نے آتے ہی دانت نکال دیئے۔

آج صبح صبح ہی آ گیا ۔۔۔۔ بالا ۔۔۔۔

کل شام دیر ہو گئی تھی۔

کمّی ٹھیک ہے؟

وہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ چندو کے من میں ایک خلش ہے۔ ورنہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ترازو کے پلڑے میں باٹ پھینکتے ہوئے چندو، تو کمّی کا خیال دل سے نکال دے۔۔۔۔ کھانا جب دو آدمیوں کو نصیب نہیں ہوتا تو تین کے لئے کہاں سے آئے گا؟

اگر قحط پہلے ہی پڑ جاتا اور ہڈیوں کا دھندا شروع ہو جاتا پھر کیا مشکل تھی ـــ! وہ اسی سوچ میں تھا کہ چندو نے بوری تول کر نیچے پھینک دی۔ چندو کو بھی بالا کا خیال تھا۔ آہستہ سے بولا ـــ انگریزوں کے وقت کا ایک قبرستان تین میل شمال کی طرف ہے۔ قبروں کے پتھر تو لوگ اکھیڑ کر لے گئے ہیں لیکن ہڈیاں ابھی تک دفن ہیں۔ انہیں نکال لا۔

ـــ ان میں سے شورا نکلے گا؟ بالا نے پوچھا تھا۔

ـــ ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ ہڈیوں میں بھی ہو جائیگی۔ چندو نے آنکھ دباتے ہوئے کہا تھا۔

سالا ـــ بالا نے من میں ہی اسے گالی دی۔ دنیا چاہے تو ایک کے پانچ روپے بھی دے سکتا ہے۔ یوں نہیں کرے گا لیکن اس طرح اپنائیت ضرور جتائے گا ـــ بالا پیسے لے کر چل پڑا تھا۔

لیکن چندو نے قبرستان کی ٹھیک ہی تو اطلاع دی تھی ـــ ہڈیاں تازہ تو نہیں تھیں لیکن کوئلے کی کان ہی تو ہاتھ لگ گئی تھی۔ جہاں کھودو وہیں ہڈیاں۔ انہیں محسوس ہوا کہ اگر ایسی دو چار کانیں اور ہاتھ لگ جائیں تو زندگی ہی بدل جائے۔ آدمی اچھا ہے چندو! لیکن پرانی ہڈیوں سے بات زیادہ بنتی نہیں۔

دراصل جب تیسرے سال بھی قحط پڑ گیا تو بالا کو احساس ہوا کہ اپنے رشتہ داروں کی ہڈیاں کتنی قیمتی تھیں اپنے رشتہ داروں کے ڈھور ڈنگر کی ہڈیاں کتنی قیمتی تھیں۔ پھر ہڈیوں کے لئے مہا بھارت چھڑ گیا۔ لوگ پہرہ دینے لگ گئے تھے۔۔۔۔ ایہہ ہمارے رشتہ داروں کی ہڈیاں ہیں۔۔۔۔ یہ ان کے ڈھور ڈنگر کی ہڈیاں ہیں ان پر ہمارا حق ہے۔ ان دنوں بالا نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ ڈھور ڈنگروں کے پنجروں کے لئے بھی۔

پھر آٹھ دنوں کے وقفے سے دادا دادی مر گئے۔ ستائیسویں دن باپو بھی چلا گیا۔ ماں تو خیر آٹھ سال پہلے ہی مر گئی تھی ـــ باپو نے دادا کی لاش کو جلانے پر بہت زور دیا تھا لیکن بالا نہیں مانا تھا ـــ جلانے سے کیا مل جائے گا؟ بالا چیخا تھا۔ اور باپو بھی چیخا تھا ـــ کمینے! تو ہڈیاں بھی بیچ کر کھا جائے گا۔ اس اولاد سے تو بے اولاد ہی مر جاتا ـــ باپو نے خواہ کچھ بھی کہا ہو اگر وہ اس کی بات مان لیتا تو یہ دن کیسے آتے۔ کیا تھا کھانے کے لئے؟ اور جینے کے لئے بھی کیا تھا؟ دھرتی تو چاروں طرف جھلسی پڑی تھی۔ اسی لئے تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جھلسی تپتی دھرتی میں لاش دبا دی جائے تو ہڈیاں جلد ہی صاف ہو جائیں گی ـــ گدھ اور کتے لاش کو صاف کرنے کے لئے بہت دیر لگاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر بکھیر بھی دیں گے۔ لیکن رات کے وقت ہڈیوں کو کہیں کوئی کھود کر نہ لے جائے۔

اسی لئے تو اس نے کمّی کو پہرے پر بٹھایا تھا اور وہیں سڑک سے بنتا سنگھ اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا ـــ اچھے دن آتے ہیں تو اکٹھے ہی آتے ہیں۔ جب بالا کو معلوم ہوا تھا کہ کمّی ٹرکوں کی سرائے میں ہے تو وہ وہاں گیا تھا۔ باپو اس وقت زندہ تو تھا لیکن اتنا نہیں کہ سرائے تک جا سکتا۔ وہ آہستہ

آہستہ بھوک سے مر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی جینے کے لئے، کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ دراصل یہ بڑا اندرونی علاقہ تھا۔۔۔ یہاں سرکاری پانی جاتا ہے ناں ۔۔۔ جہاں تک پہنچ سکا، پہنچ گیا۔ اس کے بعد۔۔۔۔ ہونا تو وہی تھا۔ باپو نے بھی مرنا ہی تھا۔۔۔

پہلے دادا مرا ۔۔۔ اس کے بعد دادی ۔۔۔ پھر باپو ۔۔۔ رشتہ دار اور ان کے ڈھور ڈنگر تو مر ہی رہے تھے لیکن ابھی باپو نہیں مرا تھا۔ اس کے مرنے سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ بالا جانوروں کی ہڈیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ گِدھوں اور کتوں کے درمیان ۔۔۔ سالے کھینچ کھینچ کر کتنی دور لے جاتے ہیں۔ ان دنوں مکلی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک آ پہنچی تھی۔ بالا گِدھوں اور کتوں کے جھرمٹ میں گھرا اسے نظر آ رہا تھا۔ ان کے درمیان ہڈیاں جمع کرتا ہوا وہ خود بھی ایک گِدھ کی طرح ہی بیٹھا ہوا تھا۔ صاف ہو جانے والی ہڈیوں کو چننے کیلئے۔

جب وہ دادی کی لاش تپتی ہوئی دھرتی کے نیچے دبانے گیا تھا مکلی نے کہا بھی تھا ۔۔۔ دادی کی پاؤں کی انگلی سے چاندی کا چھلا اتار لے۔

۔۔۔ چاندی نہیں، کانسی ہے ۔۔۔ اس نے اُسے پرکھتے ہوئے جواب دیا تھا ۔۔۔ مکلی کو آتی پہچان بھی کہاں تھی ۔۔۔ کانسی کا ہی ہو گا۔

بھلا ہو جینی کی ملوں اور بنتا سنگھ کا ۔۔۔ وہ دونوں نہ ہوتے تو یہ دن کہاں سے آنے تھے؟ ہڈیوں کا خزانہ وہ کیوں کھودتا؟ مکلی ٹرکوں کی سرائے میں اتنے آرام سے کیسے رہتی۔

یہ سالا چندو تو پاگل ہے۔ جواب بھی مکلی پہ آس لگائے بیٹھا ہے۔ جو کچھ مکلی کو دوسروں سے ملتا تھا وہ چندو سے تو ہرگز نہ ملتا ۔۔۔ ہو گا تو وہی جو ہونا ہوتا ہے لیکن چندو کو مفت میں کھلانا پڑے گا ۔۔۔ اس طرح سوچتے سوچتے وہ ہڈیوں کے ڈھیر کی طرف چلا گیا تھا۔ سات، آٹھ دن تو اتنا کام رہا کہ فرصت ہی نہ ملی۔ بوری پہ بوری بھر کے لے جاتا رہا۔ چندو تولتا رہا اور ساتھ ساتھ مکلی کا ذکر بھی کرتا رہا۔ لیکن سالے نے نہ تولنے میں کوئی فرق ڈالا اور پیسوں میں ۔۔۔ ہے سالا کمینہ!

ہڈیوں کے کام سے وہ آٹھ دن بعد لوٹا تھا۔ رات کو ۔۔۔ مکلی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہ لحاف لے کر لیٹ گیا تھا۔ مکلی کی چارپائی پر ہل چل ہو رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر پوچھا تھا۔۔۔۔ کون ہے؟

۔۔۔ بستی کا لالہ ہے ۔۔۔ مکلی نے کہا تھا۔

۔۔۔ اس سالے سے دس لینا۔ کہتے ہوئے بالا اپنی چارپائی پر لوٹ آیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ پُر سکون ہو گیا تھا۔ یہ اچھی بات تھی ۔۔۔ بستی کا لالہ جب بھی آتا، شروع میں بہت شور مچاتا لیکن آدھ گھنٹے کے بعد ہی سو جاتا تھا۔ ڈرائیور تو رات بھر میں اسے تھکا مارتے تھے۔ وہ دوسرے دن سوئی رہتی تھی۔۔۔

مکلی تو سو گئی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی ۔۔۔ اس بوری کے باعث اس کا جی نہیں لگ رہا تھا ۔۔۔ دادی بہت یاد آ رہی تھی۔ آج سردی بھی بہت تھی اور وہ گاؤں کے پاس دو اونچے ٹیلوں میں سے دادی کی ہڈیاں نکال لایا تھا۔۔۔

مکلی نے تو رات کاٹ لی تھی لیکن اس سے نہیں کٹ رہی تھی۔ سڑک پر ٹرکوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

تھوڑے بہت سرائے پر بھی رک رہے تھے۔

حد سے زیادہ سردی اور ارجن کے تیر جیسی ہوا۔ نیم کا درخت بھی بڑبڑا رہا تھا۔ تاریکی اتنی گھنی تھی کہ اٹھنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ جی میں تو آیا کہ ٹکلی کو جا کر جگائے اور کہے.... ٹکلی! دادی کی ہڈیاں اس بورے میں ہیں۔ بڑی بدبو آرہی ہے۔ یہ بدبو مجھے سونے نہیں دیتی۔

لیکن ٹکلی تھک ہار کر سوئی تھی۔ بستی کا لالہ بھی ساتھ ہی پڑا ہوا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ پل بھر کے لئے آنکھ لگی بھی لیکن کوئی ڈرائیور چیختا تھا....

اوئے دینیا! چل چلیں۔

دینا اونگھتا ہوا ٹھنڈی سیٹ پر جا کر نیم دراز ہو گیا ٹرک سٹارٹ ہوا اور ہاتھی کی طرح سڑک پر کہرے میں گم ہو گیا۔ وہ لحاف کی ٹکل مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سڑک پر پھیلے کہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ چاروں اور گہری چپ تھی۔ مرغ وغیرہ بھی کونوں میں چپ پڑے تھے۔ کاسنی پھولوں کی بیل پٹرول پمپ کی گمٹی کے سہارے کانپ رہی تھی۔ گونجتی ہوئی ہوا۔ منہ سے نکلتی بھاپ۔ سردی کے مارے درخت۔ سامنے پھیلے میدان میں ریچھوں کی طرح کھڑی گھاس......

بالا نے پھر سونے کی کوشش کی۔ لیٹ بھی گیا لیکن نیند نہیں آرہی تھی —— دادی! ناراض نہ ہونا.... یہ دن اگر تو بھی دیکھ لیتی تو شاید آسانی سے مرتی۔ اب ٹکلی بھی بچ گئی ہے اور میں بھی۔ یہ یار بھی چل پڑا ہے۔ اگر یہ قحط نہ پڑتا اور راستے ڈھور ڈنگر اور رشتہ دار نہ مرتے تو اپنا بھی یہی حال ہونا تھا۔

بھلا ہو ہڈی گودام کا۔ چندو بھی اسی میں لگ گیا ہے۔ ٹکلی بھی سمجھدار ہو گئی ہے دادی! میرے ساتھ اس نے بات کی تھی۔ کہنے لگی.... چندو سے کہہ دے، کیا فائدہ ہے؟ گھر بساؤں گی تو دوبارہ گاؤں سے باہر جھونپڑی ڈالنی پڑے گی۔ کنواں خشک ہو گا تو پھر ادھر ہی بھاگنا پڑے گا تب ایک ایک گڑوی پانی کے لئے برہمن ٹھاکر چھوڑ دیں گے کیا؟ قحط تو ہم لوگوں کے لئے ہی پڑتا ہے۔ باقی لوگوں کے پاس تو برسوں کے لئے اناج پانی ہے.... یہاں کوئی یہ تو نہیں پوچھتا کون سی ذات ہے؟ لوگ اپنی ضرورت کے لئے آتے ہیں۔ کل نہیں آئیں گے تو سرائے کے برتن دھو کر گزارہ کر لوں گی۔ ایسے دن بار بار نہیں آتے.... چندو سے کہہ دے.... کیا فائدہ ہے......

ٹکلی بہت سمجھدار ہو گئی ہے دادی! تو سُن رہی ہے ناں!

ارجن تیر پھر لگا —— اس نے لحاف کو کس کر لپیٹ لیا۔ پتہ نہیں وہ کب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ کہرے کی سرنگ سے ایک ٹرک نکل کر پھر اسی سرنگ میں گم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک آواز آتی رہی۔

بالا اٹھا —— ٹکلی کو جگا دے۔ لیکن.....

اس وقت ٹکلی کی چارپائی پر حرکت ہوئی۔ لالہ لحاف میں سے نکل کر مُڑ مُڑ کرتا کھڑا ہو گیا۔ ٹکلی بولی.....

پڑا رہ..... بہت سردی ہے۔

لیکن لالے نے تو اندھیرے ہی میں جانا ہوتا ہے رات کہیں بھی گزرے لیکن اس کا دن بستی میں چڑھتا ہے

ٹوپا پہن، چادر لپیٹ کر لالہ بستی کی پگڈنڈی پہ چل پڑا۔

بالا اسی طرح بیٹھا رہا۔ بوری کی طرف دیکھتا رہا۔ مکلی کی نیند بھی اُکھڑ گئی۔ شاید اس نے لحاف میں سے دیکھ لیا تھا۔ پاس آ کر بولی ــــ بالا! تو ابھی تک سویا نہیں؟

ــــ نیند نہیں آتی۔

ــــ تھوڑی سی اُدھر پڑی ہے۔ اڈّھے میں۔ پی لے۔ گرم ہو جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سو جا ۔ ۔ ۔ سو جا ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ کہتے ہوئے مکلی اپنی چارپائی کی طرف جانے لگی۔

ــــ سن ــــ بالا نے کہا

ــــ بتا!

ــــ دادی سونے نہیں دیتی۔

ــــ دادی؟ مکلی نے حیرت سے پوچھا۔

ــــ ہاں ۔ ۔ ۔ اس کی کایا اس بوری میں بیٹھی ہے۔ بالا نے کہا۔

ــــ پرے ہٹ ــــ مکلی نے جھڑک دیا۔

ــــ مکلی یہ تو اچھا ہی ہوا کوئی اور نہ کھود کر لے گیا۔ ہم ہی جا پہنچے ۔ ۔ ۔ ۔ ثابت پنجر نکلا ۔ ۔ ۔ ۔

ــــ یوں کہہ رہا ہے جیسے پہچان لیا ہو۔ کہتے ہوئے مکلی اسی کی چارپائی پہ آدھا لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئی۔

ــــ دادی کے پاؤں میں وہ کانسی کا چھلّا اب بھی پڑا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بالا کی بات سُن کر مکلی اور کچھ نہ بولی بوری کی طرف دیکھتی رہی۔

دونوں پٹرول پمپ سفید لحاف اوڑھے، کانوں میں انگلیاں ڈالے کھڑے تھے۔ چھپر کے بانسوں پہ لٹکے ٹائر پتلی سے خالی آنکھ کے کنول کی طرح چمک رہے تھے۔ سڑک پر کھڑے نیم کے درختوں کی گردنیں کہرے کی تلوار نے کاٹ دی تھیں۔ ٹیوب ویل کے سرنل کا بازو کچی کُٹی کی کمر میں لپٹا ہوا تھا اور وہ دونوں وہاں چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ سردی لگ رہی تھی اور دونوں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ پتہ نہیں اس وقت کیا بجا تھا؟

گھٹنوں پہ باہیں ٹکائے اور ان پہ ٹھوڑی رکھے، مکلی بیٹھی تھی۔ کہنی کے سہارے بالا نیم دراز تھا۔ اس وقت دور کہرے کے ٹکڑوں کے پیچھے کالے آسمان میں کچھ حرکت ہوئی ــــ کالے بادل کا لوہے کا کنارہ کچھ چمکا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے اس کے پیچھے آگ کی بھٹی دہک اٹھی ہو۔ لیکن پھر لوہا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ پل بھر کے بعد کالے لوہے کے کئی کناروں پر شعلوں کے نشان دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ پھر بجھ گئے لیکن بھٹی شاید لگاتار تپ رہی تھی۔ گاڑی لوہاروں کا کوئی قافلہ آسمان کے پیچھے کہیں پڑاؤ تو نہیں ڈال رہا تھا؟ دھونکنی چل رہی تھی اور آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ لوہے کے کنارے زرد ہوتے جا رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جگہ جگہ سے بادلوں کے ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ آگ نے کہرے کی تہیں خشک کر دی تھیں۔ آسمان میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پھر گھاس کے روئیں سرمئی اور سنہرے ہو گئے اور گردن کٹے درختوں کے سر ابھر آنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔

بالا جھنجھلا کر سیدھا بیٹھ گیا۔

ککی نے پوچھا ــــــ یہ ہڈیاں گودام میں سے کہ جائے گا؟

ــــــ ہاں، بالا نے جواب دیا تھا

ــــــ سُن بالا . . . . . ۔ انہیں ندی میں بہادے

بالا حیران رہ گیا۔ کچھ اسی طرح سے وہ بھی تو سوچ رہا تھا لیکن یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ دادی کی کایا کو ندی میں بہا آئے ــــ

ــــــ ٹھیک ہے ناں! ککی نے کہا . . . . برے دن ہوتے تو اور بات تھی ۔ پھر بے شک گودام میں ہی دے آتے۔

ــــــ ہاں! اس نے کہا، منہ اندھیرے ہی چلا جاتا ہوں ــــ ندی دور ہے ۔ دن چڑھے لوٹ آؤں گا۔

اور وہ بوری اٹھائے، سڑک پار کر کے میدان میں اُتر گیا ــــ اس ڈنڈی پر، جو ندی کی طرف" جاتی تھی۔ ککی اُسے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب نہ ہو گیا۔

ککی اپنے لحاف میں گٹھڑی بن کر لیٹ گئی ۔ آدمی ساتھ لیٹا ہو تو ٹانگیں سیدھی کر کے سونے میں بھی اتنی سردی نہیں لگتی ۔ سکون بخش حرارت ملتی رہتی ہے لیکن اس آنکھیں بند ہو رہی تھیں ۔ انگیٹھیاں جل چکی تھیں ۔

رات کو رکے ٹرکوں والے چائے پانی پی کر چلے گئے تھے ۔ ٹیوب ویل چل رہا تھا ۔ ولکنائزر کے چھپر میں مشین پر ربڑ کا ٹانکا لگانے والے لڑکے بھی آ گئے تھے ۔ سرائے کے مالک نے جب جی کا ریکارڈ لگا دیا تھا ۔ اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ ککی گہری نیند سو رہی تھی ۔

بالا لوٹا ــــ وہ اس وقت بھی سو رہی تھی ۔ آتے ہی اسے جگانے لگا ۔ ککی نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا ۔

ــــــ بہا آیا ہے ؟

ــــــ ہاں، اس کے دانت اب بھی بج رہے تھے ۔ ارجن کے تیر تو خیر چل ہی رہے تھے ۔

ــــــ اچھا ہوا ککی نے کہا ۔

ــــــ تجھے یاد ہے دادی کو میں ہمیشہ کہا کرتا تھا ــــ میری بات سُن دادی! میں دیکھ کر آیا ہوں ۔ پانی کا رنگ لال ہے ۔ لہو کی طرح لال ۔ دادی مانتی نہیں تھی ۔ ضد کرتی تھی . . . . ۔ پانی کا رنگ نہیں ہوتا ۔ اس لئے اس کی کایا بہاتے ہوئے میں نے اسے کہا ــــ لے دادی، آج دیکھ لے . . . . ۔

ککی نے اس کی طرف دیکھا اور چوڑیوں کو سرکا کر اپنی بانہیں گرمانے لگی ۔ اس کے چہرے پہ رات کا باسی پن تھا ۔ یا شاید پالے کی سفیدی ۔ وہ اپنے گال رگڑنے لگی ۔ بالا نے دیکھا . . . . اس کے بائیں گال کی سانولی چمڑی پر لہو کا ایک خشک ٹپکا جما ہوا تھا ۔ ککی اس پر انگلی پھیرنے لگی تو بالا نے پوچھا ۔

ــــــ کیا ہوا؟ اس سالے لالہ نے پھر اتنے زور سے دانت گاڑ دیئے کیا؟ . . . .

ــــــ نہیں . . . . ککی نے سرسری انداز میں کہا . . . . اس کے ایک دو دانت سونے کے ہیں ناں ۔

. . . . وہی کھُب جاتے ہیں . . . . کہتے کہتے وہ ٹیوب ویل کی طرف منہ دھونے چلی گئی ۔

بلراج مین را

آخری کمپوزیشن

اس کے لفظ چھین لو اور اسے چھوڑ دو۔

یہ مجھے منظور نہ تھا اور نہ ہے۔

گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کا یہ درمیانی لمحہ جسے میرا ایک رفیق آج کہتا ہے، چھ ضرب چھ کا ایک ننگا بُچا سرد کمرہ ہے، جس کی تین دیواریں پتھر کی ہیں اور چوتھی لوہے کی۔

جگ بیتے، اس آج سے پہلے گزرے ہوئے کل، کھلے آسمان تلے میں انجانے میں ان گنت لفظ کھو بیٹھا تھا۔ تاریخ، جغرافیہ، دیومالا، کہاوتیں، خون کے رشتے ناطے اور دل کے معاملات، صبح و شام تھے۔ کبوتروں کا پھڑپھڑانا بھوک تھی اور لغزش یا پیاس۔ ہنستے ہنستے رو دینا شاعری تھی اور روتے روتے ہنس دینا کہانی۔ پو پھٹنے سے پہلے بدھ ملتا۔ بعد دوپہر خیام اور شام ڈھلے دیوداس نہ کبھی قدر رعنا کو آنکھیں نم کئے غم کی تصویر دیکھتے اور کبھی روکھے سوکھے گھنے لمبے پریشان سیاہ بالوں میں سورج کے ذرے۔ بازوؤں پر پسینوں کا ہلکا سا دباؤ موسم سرما کی صبح کی دھوپ، لبوں کا لمس، الاؤ کی آنچ، بدنوں کا ملاپ، بارش اور بعد بارش کا سکھ —— زمان و مکان کی ایک ایسی سازش کہ جس کا میں شکار تھا کہ جس میں شریک تھا۔

میں، جو بیک وقت سازش کا شکار اور سازش میں شریک تھا، لفظوں کو معنی نہ دے پایا۔ لفظ، جو دن تھے، گرما سرما خزاں بہار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ موسم، جو لفظ تھے، معنی نہ تھے —— سازش کا شکار میں یوں تھا کہ لفظوں کے حصار میں تھا اور سازش میں شریک یوں تھا کہ میں نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش نہ کی —— وہ دن، ہوس پرستوں اور شہرت پسندوں کے دن تھے۔

گزرے ہوئے کل کی ایک رات تھی، جسے میرا رفیق آج کہتا ہے۔

اس رات نرم گرم بستر بنے ہوئے بدنوں کے سانسوں کی دھونکنی مدھم پڑ رہی تھی اور تھپکیاں دے رہی تھی کہ پاس ہی کی کوئی سیڑھیاں، کوئی وزنی، غیر مہذب قدم اترتے سنائی دئیے۔ میرا دایاں ہاتھ، جو نرم گداز بھرے بھرے، لعاب لتھڑے ماند ہوتے ہوئے پستان پر رکھا ہوا تھا جیسے وہیں کا ہو، آپ سے آپ علیحدہ ہو گیا، دھونکنی سرد پڑ گئی اور میں ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ مجھے محسوس ہوا، کسی نے سسکی لی ہے۔ ایسی پھیلتی ہوئی، سمٹتی ہوئی سسکی جیسے اک پل پھیل جائے، سمٹ جائے۔ ایسی بے چارگی، ایسا ضبط۔ جیسے رات نے سسکی لی ہے —— کوئی آئے تھے، کسی کو لے گئے تھے، کوئی ضبط کر رہا تھا۔

اس رات کی آج سی اُجلی صبح ہوئی۔

اک چہرہ تھا سانولا سا، اُداس اُداس، اجلی آنکھوں والا، جسے بارہا دوست کہنے کو جی چاہا، ہر صبح نظر پڑتا تھا۔ کہیں نظر نہ آیا۔

راتیں سسکیاں بن گئیں۔

دن اُجلے ہو گئے۔

بازاروں میں جوان چہرے کم نظر آنے لگے۔

طول و عرض میں اک ایسی چپ چھائی کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی۔

گھر سے ذرا پرے، اس طرف کورے بدن سلگنے لگے۔

کان سے جو سنا، ناک سے جو سونگھا، سچ تھا اور آنکھ سے جو دیکھا، ابھی جھوٹ تھا۔

لفظوں کی کھال اُدھڑ گئی۔

کورے بدن جُھلس رہے تھے —— گلیاں، بازار، یونیورسٹیاں، کھیت کھلیان، ندی نالے، پہاڑیاں، بادل، سب اک سُلگتا نعرہ تھے۔ لفظ، معنی۔ آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی تھی، معنی تھے۔

ہر حس اک معنی بن گئی۔

کتابیں حوصلہ، کھوپڑیاں ٹائم بم، ہاتھ رائفلیں، پہاڑیاں پناہ گاہیں۔

دل لبھانے والے لفظوں سے کھینچی گئی جغرافیائی لکیروں کی بھٹیاں جواب تک کورے بدنوں سے سلگائی جاتی تھ

کلفٹن، میرین ڈرائیو اور ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے ایندھن سے دہکنے لگیں۔

لفظ، جو دن تھے اور بے معنی موسموں کے گرد بے کار چکر کاٹتے تھے، اک معنی اور اک موسم بن گئے۔

اس رات گھر لوٹتے سمے میں نے دیکھا، دہکتی بھٹی کی تپش سے لرزاں ندی میں دمکتے بدن بہہ رہے ہیں۔

مجھے محسوس ہوا، میں سازش کا شکار نہیں ہوں، میں سازش میں شریک نہیں ہوں۔

گھر پہنچا، دیکھا، بے معنی کل کے دوست میرے منتظر ہیں —— دوستی بے معنی سی شناسائی محسوس ہوئی۔ ان گنت لفظ کھو دینے کا دکھ ہوا۔

ایک سکوں کے شہر سے لوٹا تھا اور خوش تھا۔ دوسرا تعلقات کی سیڑھیوں کی خرید و فروخت سے نالاں تھا۔ تیسرا بے حسی کے محکمے میں ترقیاں کر رہا تھا۔

"اک زمانہ ہوا، دل کا خوں کئے ——"

"بھنے ہوئے آلو ——"

"دہکتی آگ ——"

میں کیا کہتا؟

میں نے کہا، "دل خون ہو رہے ہیں، بدن بھن رہے ہیں اور ہمارے چاروں اور آگ ہی آگ ہے۔"

تیسرے نے میری بات کاٹ دی۔

"بند بوتل کی آگ ہی سے آنکھیں چندھیا گئیں؟ میاں! یار اپنا اس شہر سے لوٹا ہے، جہاں گلیوں میں چاندی بہتی ہے —— یار کے آسمانی رنگت کے کرتے نے وہاں جادو جگا دیے ہیں ——"

دوسرے نے بات بڑھائی۔

"یار کی باتوں کے ہیرے اسی شہر میں بک سکتے تھے ــــ"

میں نے پہلے کی جانب دیکھا اور پھر تیسرے اور دوسرے کی جانب ــــ وہم وگماں کے کردار۔

میں نے اُسی سمے گھر چھوڑ دیا۔

گھر چھوڑا ــــ ہر گھر اپنا ہو گیا ــــ سہمے ہوئے گھر، دل والے گھر، بے حس گھر

اور پھر اس رات وہ آئے، مجھے لے گئے؛ ضبط کا کوئی قصہ ہی نہ تھا۔

ــــ تم نے جو سنا ہے، تم نے جو سونگھا ہے، تم نے جو دیکھا ہے، اسے جھوٹ کہہ دو ــــ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔

یہ مجھے منظور نہ تھا ــــ میں خاموش رہا۔

میری خاموشی اک لفظ "نہیں" تھی ــــ میں نے اب تک ان گنت لفظ کھوئے تھے، اب میں نے پہلی بار اک لفظ پایا تھا۔ اگر میں ان کی بات مان لیتا، میں اک لفظ اور کھو دیتا اور پہلا لفظ کبھی نہ پا سکتا۔

ــــ تم اپنا یہ لفظ ہمیں دے دو، ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔

میرا لفظ میری قوت اور ان کا خوف تھا۔

میں نے اک لمبا سانس کھینچا ــــ چند ہی لمحوں میں میں نے کئی لفظ پا لئے تھے۔

ــــ اس کے لفظ اس کے پاس رہنے دو اور اسے بند کر دو۔

یہ ان کی بھول تھی کہ ان لفظوں کے ساتھ میں آزاد تھا۔ قید بے معنی تھی۔

تین ننگی بچی سرد دیواریں پتھر کی اور چوتھی لوہے کی ــــ انہوں نے مجھے بند کر دیا۔

آزادی کے وہ دن سکھ کے پہلے دن تھے ــــ بھنچی ہوئی مٹھیوں کے پسینے کا نمک اس سے پہلے بھلا کب چکھا تھا!

ہر حس اک معنی تو کب کی بن چکی تھی، تجربہ اب بنی۔

قدموں کو چاپ ملی، آنکھوں کو روشنی ــــ ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر ٹہلتا تو آنکھوں کو بے پناہ سکون ملتا۔ ٹہلنا اک نشہ تھا۔ تھک جاتا تو جی بھر کر سوتا۔ سوچتا تو خوب سوچتا۔ ایک اور دیکھتا تو دیکھتا ہی رہتا۔

چند ہی دنوں میں میں نے محسوس کیا، میری پتلیوں کی جنبش سے میرے بدن میں زلزلہ آ جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک دن لوہے کی دیوار سے پشت جوڑے، ٹانگیں پسارے ننگے فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور چھ فٹ کے فاصلے پر سامنے کی پتھر کی دیوار پر آنکھیں گاڑے ہوئے تھا۔

دیوار میں اک بے صدا لہر اٹھی اور اک ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ فرش میں اتر گئی۔

دیکھا، سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

پہلی نظر میں پہچان نہ پایا۔

یکایک محسوس ہوا، فاصلہ کچھ زیادہ ہے ــــ فاصلہ واقعی زیادہ تھا۔ فاصلہ بارہ فٹ تھا۔

فاصلے کا صحیح اندازہ ہوا تو جان پڑا، دیوار چھ فٹ کے فاصلے پر ہے اور وہ دیوار میں چھ فٹ اندر میری اور رُخ کئے، ٹانگیں پسارے بیٹھا ہوا ہے اور لوہے کی دیوار سے پشت ٹیکے ہوئے ہے۔

پہلی نظر میں پہچان نہ پایا تھا، ذرا سوچا تو مسکرا دیا ـــــ میرا رفیق ہے !
مسکرا کر خیر مقدم کیا۔ مسکراہٹ میں شکریہ ملا۔
سامنے چھ فٹ کے فاصلے پر پتھر کی دیوار کے چھ فٹ اندر لوہے کی دیوار تھی، میری دیوار جیسی۔ یخ، مضبوط زنگ جیسے زنگ۔
وہیں اپنی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہم نے نہ جانے کتنی ان کہی باتیں کیں (وہ سُن نہ لیں ؟) تھک گئے تو آنکھیں موندلیں آنکھیں کھولیں، تو پھر وہی تعجب اور پیار بھری آنکھیں۔
ایسے ہی ایک پل اس کی لوہے کی دیوار کی جانب دیکھ رہا تھا کہ پھر دیوار میں اک بے صدا لہر اُٹھی اور ایک ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ فرش میں اُتر گئی۔
دیکھا، اس کی پشت کے ساتھ پشت جوڑے کوئی بیٹھا ہے اور اُدھر دیکھ رہا ہے۔
میں کیسے پہچانتا کہ میری جانب تو اس کی پشت تھی اور بارہ فٹ کی دوری۔
میں نے اس کی جانب دیکھا۔
وہ بھی حیران تھا۔
وہ میری جانب دیکھ رہا تھا اور اس کی پشت کے ساتھ کسی اور کی پشت جڑی ہوئی تھی۔
میں نے پھر اُدھر دیکھا اور چونکا۔
اس کے تھوڑے اور فاصلے پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا اور پتھر کی دیوار کے چھ فٹ اندر لوہے کی دیوار کے اندر لوہے کی دیوار سے پشت جوڑے میری یا شاید اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔
میرا سر گھوم گیا۔
میں نے آنکھیں بھینچ کر ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلیں۔
چند لمحوں کے بعد سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھولیں اور حیرانی اور بڑھ گئی۔
دیوار کے اندر، دیوار کے اندر، دیواروں کے سلسلوں میں پشت سے پشت جوڑے، آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ان گنت وہ، جو مجھے دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو، دوسرا تیسرے کو، تیسرا چوتھے کو، چوتھا پانچویں کو پانچواں...
حیرانی کو معنی دیئے تو مسکراہٹیں ہی خیر مقدم بنیں اور مسکراہٹیں ہی شکریہ بنے ـــــ سب رفیق ہیں !
لفظ بھی یہاں پائے تھے اور لفظوں کو معنی بھی یہیں ملے تھے ـــــ اب معنوں کو لفظ دینے کا وقت آ گیا تھا۔
آنکھوں آنکھوں میں وقت بندھ گیا اور جب ـــــ جب وہ گھڑی آئی، ایک ساتھ سب ہاتھ اُٹھے، ایک ساتھ سب قدم اُٹھے، ایک ساتھ سب سر دیواروں سے ٹکرائے۔
دیواریں کرچی کرچی ہو گئیں۔
جب مجھے ہوش آیا، میں نے دیکھا: میں سائیں سائیں کرتے جنگل میں پڑا ہوں۔ قطرہ قطرہ خون میری رگوں میں اُتر رہا ہے۔
تھوڑی دیر بعد مجھے خبر دی گئی۔ ہمارے تین رفیق ہلاک ہوئے ہیں، دو لاپتہ ہیں اور باقی سب محاذ پر ہیں۔

سرِیندر پرکاش

بھُوکا

پریم چند کی کہانی کا، ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھنوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت سے اُبھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اُس کے ہاں دو بیٹے ہوتے تھے جو اب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا۔ اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے۔ بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا ـــــ اور ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوتے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر اُن کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی۔ اُس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ان دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے اُن کے پانچ بچے۔ تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلہ میں مارے جانے والے کے۔ اب ان سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا اور اس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اس دِن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سُرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنوئیں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہا رہے تھے۔ اس کی بڑی بہو کنوئیں سے پانی نکال کر اُن پر باری باری انڈیلتی جا رہی تھی۔ اور وہ اُچھلتے ہوتے اپنا پنڈا ملتے پانی اچھال رہے تھے ـــــ چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی۔ اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گذر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

"سب تیار ہیں ؟ "اُس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

ہاں باپو ـــــ سب بچے ایک ساتھ بول اُٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلّو درست کیے اور ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا ـــــ سب جھوٹ بول رہے تھے ـــــ اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے، اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ ان کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اُسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے، پوتیاں اور بہوئیں ـــــ ابھی ابھی بولے ہوتے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے

جُٹ گئیں جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے۔
اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔
اُن کا کھیت لہلہا اُٹھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انہوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔
ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوتے سوچا۔ کتنا اچھا سمے آ پہنچا ہے۔ نہ اہلمد کی دھونس نہ بنیئے کا کھٹکا۔ نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصّہ ــــــ اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اُٹھے۔
"چلو باپو" اُس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی۔ باقی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔
بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آ گئے اور پھر دائیں طرف مُڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔
گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے۔ سب کے دلوں میں مسرت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اُس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوتے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے ــــــ جو جیپ گاڑی کے پہیّوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے تھے۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ غریب کسان کی بہو عورتیں ہوتی ہیں، چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوتے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔
وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گذر کر آگے کھلے کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کُتا بے فکری سے سویا ہوا تھا۔ دور طویلے میں کچھ گائیں بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوتے سنہری کھیت تھے ــــ ان سب کھیتوں کے بعد، ذرا دور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا جس میں جھونا پک کر انگڑائیاں لے رہا تھا۔
وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوتے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے سوکھی گھاس پر رینگ رہے ہوں ــــ وہ سب اپنے کھیت کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے آگے تھل تھا۔ دُور دور تک پھیلا ہوا، جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھا ــــ اور مٹی یوں بھر بھری ہو گئی تھی جیسے اُس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا، جب تک بچے جوان ہوں وہ تھل اُس کے کھیت تک نہ پہنچے اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصّہ بن چکا ہوگا۔
پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اس پر ہوری اور اُس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوتے ننگے پاؤں ....

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے ان کے پاؤں مٹی سے اٹ گئے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے، وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انہوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام بہنے کو بھی نہ تھا —— اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے —— اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آ رہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اچھلنے لگا —— فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھڑی اناج سے۔ پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد اُن سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رُک گئے ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری کو اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھُرتی پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

"ابے کون ہے .... رے —— ؟"

اور پھر سب نے دیکھا اُن کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے —— اب وہ سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلایا۔

"ابے کون ہے رے —— بولتا کیوں نہیں —— کون فصل کاٹ رہا ہے میری —— ؟"

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آ چکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سراپ سراپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے للکارا۔

"کون ہے حرام کا جنا —— بولتا کیوں نہیں؟" اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی درانتی سونت لی۔

اچانک کھیت کے پرے حصے میں سے ایک ڈھانچہ سا اُبھرا اور جیسے مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا ہو —— پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"مَیں ہوں ہوری کاکا —— بجوکا!" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ اُن کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی —— کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آ گئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے —— وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یُگ —— اس کا ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انہوں نے ہوری کی غصہ سے کانپتی ہوئی آواز نہ سُنی انہیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

"تم ...... بجوکا ...... تم۔ ارے تم کو تو مَیں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا —— بانس کی پھانکوں سے اور تم کو اسی انگریز شکاری کے کپڑے پہناتے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرہ میرے گھر

کی بیکار ہانڈی سے بنا تھا اور اُس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا ارے تُو بے جان پتلا میری فصل کاٹ رہا ہے؟"

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اور بجوکا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا ــــ جیسے اُس پر ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے انہوں نے دیکھا ــــ فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوتے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آئی ــــ وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا تھا ــــ مگر آج ــــ وہ آدمی لگ رہا تھا ــــ گوشت پوست کا اُن جیسا آدمی ــــ یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اُٹھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اُسے ایک زوردار دھکا دیا ــــ مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا ــــ سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا ــــ سب نے اسے سہارا دیا۔ اور اُس نے خوفزدہ ہو کر بجوکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو...... تو مجھ سے......؟ بھی طاقت ور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے.....؟ جس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ــــ اپنی فصل کی حفاظت کے لیے"

بجوکا حسبِ معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا۔ "تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو، ہوری کاکا۔ مَیں نے تو صرف اپنے حصّے کی فصل کاٹی ہے۔ ایک چوتھائی ــــ"

"لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچّوں کے حصّہ لینے کا ــــ تم کون ہوتے ہو؟"

میرا حق ہے ہوری کاکا ــــ کیوں کہ میں ہوں ــــ اور مَیں نے اس کھیت کی حفاظت کی ہے؟"

"لیکن مَیں نے تو تمہیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا۔ اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ــــ یہ تمہارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی؟"

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔ خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔ ــــ اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو؟"

"لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی ــــ؟ مَیں نے تو نہیں دی تھی!"

"یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی ــــ جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں، انگریز شکاری کے پھٹے پُرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منہ بنایا تھا ــــ اسی دن اُن سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں آہستہ آہستہ نکلتی رہی ــــ اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن مَیں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی ــــ مَیں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو ــــ"۔ بجوکا نے آہستہ آہستہ سب کہا ــــ تاکہ اُن سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

"نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ سب سازش ہے۔ مَیں تمہیں زندہ نہیں مانتا، یہ سب چھلاوا ہے۔ مَیں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔ تم درانتی پھینک دو۔ مَیں تمہیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا ـــ،، ہوری چیخا، اور بجوکا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی ـــ پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور بجوکا، کا انتظار تھا۔ آج پنچایت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ مقدمہ کے دونوں فریق اپنا اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا ـــ سب کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشا دیکھ کر تڑپ اُٹھا اُسے لگا جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے۔ پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگے۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اُس نے پنچایت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوتے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کر لیا۔ اور پھر کھڑا ہو کر اپنے پوتوں سے کہنے لگا۔

"سنو ـــ یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تقل کھیت سے کچھ دُوری پر ہے ـــ مَیں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اپنی فصل کی حفاظت کے لیے کبھی بجوکا نہ بنانا ـــ اگلے برس جب ہل چلیں گے ـــ بیج بویا جاتے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا ـــ تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا ـــ بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا، جب تک تقل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا۔ اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہو جائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں ـــ وہیں رہنے دینا ـــ تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انہیں یاد آتے کہ بجوکا نہیں بنانا ـــ کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا ـــ آپ سے آپ اُسے زندگی مل جاتی ہے اور اس کا وجود اُسے درانتی تھما دیتا ہے۔ اور اُس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہوتا ہے ـــ،،

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اُس کے پوتے اور پوتیاں اُس کے پیچھے تھے۔ اور پھر اس کی بہوئیں۔ اور اُن کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکاتے ہوتے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہو گیا۔ اُس کے پوتے، پوتیوں نے اُسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا ـــ اور باقی سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے ـــ بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اُتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

اجیت کور
ترجمہ:۔ شازیہ سکندر

دھوپ کا شہر

"نہیں نہیں تمہیں ضرور آنا پڑے گا یہ بھی کوئی بات ہے؟ اس طرح اپنے دروازے بند کرکے تم کتنی دیر جی لوگی؟ جیتے جی تو کسی نہ کسی سے ملنا پڑتا ہے پھر..... تمہیں پتہ ہے نہ ...... میں تو کل صبح فلائی کر رہا ہوں ——— نیروبی"

یہ آخری بات بڑی مدھم آواز میں کہی گئی تھی پل کے پل گیتا فیصلہ نہ کر سکی کہ گوتم اسے خود ملنے کے لیے بلا رہا یا اس پردیسی .... کیا نام تھا اس کا؟ ———

"کیا نام بتایا ہے تم نے اس آدمی کا؟"

"ڈان ڈی کارل"

ڈان .... ڈان .... بڑا پیچا را ہوا لگا۔

——— لیکن میں تو کسی سے ملتی ہی نہیں گھر ہی ۔ سے بہت کم نکلتی ہوں اسے کہاں ملنا تھا؟ اس کے علاوہ گوتم کہہ رہا تھا یہ تو پہلی بار ہندوستان آیا ہے وہ بھی دس دن کے لیے جس میں سے صرف چار دن دہلی میں رہیگا اور دہلی میں آج اس کا پہلا دن ہے۔

——— ڈان ....

——— شاید یہ کسی دریا کا نام ہے۔

"بہت بڑھیا آدمی ہے تم ملوگی تو جانوگی۔ اس کا عمر تو اڑسٹھ سال ہے لیکن اس کا سارا جسم، ساری روح زندگی کے تیکھے پن سے مچل مچل اٹھتی ہے بیٹھا بیٹھا گانے لگتا ہے۔ بلند آواز میں لطیفے سناتا ہے چلتے چلتے ناچنا شروع کر دیتا ہے عجیب آدمی ہے،" گوتم کی آواز ٹیلی فون پر بھی دہکی ہوئی لگ رہی تھی۔

"تم اسے کب سے جانتے ہو گوتم؟"

"میں اس وقت شکاگو میں تھا دو دن کے بعد مجھے وہاں سے چل پڑنا تھا ایک رات میں اکیلا ہی کھانا کھا رہا تھا میرا خیال تھا جلد کچھ کھا پی کے سو جاؤں گا کیوں کہ دوسری صبح مجھے بہت سے کام کرنے تھے یہ میری میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں؟ پھر تو میں اس رات ساڑھے تین بجے تک نہیں سو پایا۔ ہم گھومتے رہے سڑکوں پر ہوٹلوں میں، پبز میں، اور ہاں اب دیکھو نا، بالکل اکیلا ہے بے چارا۔ میں نے سوچا تھا اگر تم آجاتیں ......"

"اچھا آجاؤں گی لیکن کہاں آؤں؟"

"تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں تمہارے دفتر سے پک اپ کرلوں گا پھر ڈان کو اس کے ہوٹل سے ساتھ لے لیں گے اور پھر لنچ ساتھ ہی کریں گے۔

"اچھا پھر ——— ایک بجے"

"——— ٹھیک ایک بجے"

ریسیور رکھنے کے بعد گیتا کو اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا...... میں کس لیے گوتم کی باتوں میں آگئی؟ کوئی آئے کوئی جائے مجھے کیا۔؟

لیکن کہیں بہت اندر سے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس پردیسی کی تنہائی کے ساتھ اس کا ضرور کوئی تعلق

ہے ورنہ وہ اس طرح کہیں آنے جانے سے رہی زندگی نے مجھے اتنی تنہائی دی ہے...... چاروں پلو سمیٹ کر......... جیسے........ خود اپنی گپھا میں بند ہو کر بیٹھ گئی ہوں نہ سانس کی آواز باہر نکلے۔ نہ باہر سے کوئی آواز یہاں پہنچے۔

——— کبھی کبھی......... کوئی آدمی...... ہاں اچھا لگتا ہے جیسے صدیوں پرانے ریگستان میں میلوں کے فاصلے پر کوئی پاؤں کا نشان...... لیکن ادھر سے ہوا ادھر سے ریت اڑی اور پاؤں کا نشان مٹ جاتا ہے۔

ایک آہ۔ آہ کا رنگ قرمزی ہے

۔ گیتا اپنی حماقت پر کڑھتی ہے کیوں گوتم کی بات مان لی ہے؟

—— گوتم کے سامنے میں اتنی کمزور کیوں ہو جاتی ہوں۔

ایک بجے گیتا اپنے دفتر سے باہر نکلی گوتم کی موٹر اس کے پاس آکر رکی راستے میں گوتم اسے بتاتا رہا۔ "جس دن مجھے شکاگو سے چلنا تھا یہ مجھ سے کہنے لگا میں تجھے چھوڑنے آؤں گا میں نے کہا نہیں میرے پاس وقت ہی نہیں ہوگا اصل میں میں نے یہ سوچا تھا کہ بیچارے کو کیوں تکلیف دوں سو میں نے اپنی طرف سے اس کے ساتھ الوداعی سلام دعا کر لیا۔ ڈان چپ رہا لیکن چلتے وقت جب میرا سامان جارہا تھا میں نے دیکھا ڈان چپ چاپ ایک بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا کھڑا تھا میں حیران ہوا، اس کے پاس گیا یہ چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا پھر میں نے بے ساختہ اسے گلے لگا لیا یہ کہنے لگا بھئی وقت تیرے پاس نہیں تھا لیکن میرے پاس تو تھا نا سو میں تجھے چھوڑنے آگیا تو جا کر اپنا کام کر اور پھر ہم بچوں کی طرح ہنستے رہے گیتا گوتم کی باتیں سنتی رہی اتنے میں ڈان کا ہوٹل آگیا وہ باہر پورچ میں کھڑا تھا گوتم کو دیکھتے ہی اس نے ہوا میں اپنے ہاتھ ہلائے ایڑیاں زمین سے اٹھیں ... . اونچی آواز......... گاتی ہوئی ٹون ....

"آئی ہیڈاٹ مائی بوائے آئی ہیو کم ٹو یور کنٹری"

گوتم نے بھی اسی طرح گا کر جواب دیا" یو بلانگ ٹو دس بلیس جم! ویل کم ہوم بولئے!"

گیتا ڈان کی طرف دیکھ رہی تھی بچوں جیسی حیرانی کے ساتھ ——— اس کے من میں ایک امریکی بزرگ کی جو

تصویر بھی ڈان اس سے بالکل مختلف تھا گوتم کی صبح والی ٹیلیفون کال کے بعد وہ جس شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی اس کے خیال میں وہ لمبا تڑنگا انسان تھا پیٹ قدرے بڑھا ہوا پیٹ کے اوپر کھینچ کر چڑھی ہوئی پتلون منہ میں سگار کی خرخراتی آواز، چہرہ زندگی کی مکمل سیری سے پھولا ہوا چمکدار بڑھیا کپڑے۔ گیتا اس آدمی کو ملنے سے جھجک رہی تھی لیکن ڈان تو اس سے بالکل مختلف تھا ذرا سا آدمی قد بمشکل ساڑھے پانچ فٹ چہرے پر بھید کو ملتا لباس انتہائی موزوں سگار تو کیا سگریٹ بھی نہیں اور اس کی نیلی آنکھوں میں کسی پہاڑی جھیل جیسی گہرائی اور کو ملتا اور نیلا پن . . . .

ڈان نے گیتا کی طرف غور سے دیکھا اس اثنا میں گیتا بھی اور گوتم بھی موٹر سے اتر چکے تھے گوتم نے انٹروڈیوس کرایا یہ گیتا ہے کہانیاں لکھتی ہے۔ یہ ڈان دی کارل نہایت بڑھیا . . . ."

ڈان نے بات درمیان ہی سے کاٹ دی اور گیتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے موٹر میں بٹھا دیا گوتم کی ساتھ والی اگلی سیٹ پر گیتا کہتی رہی "نہیں آپ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھیں میں پیچھے بیٹھ جاؤں گی لیکن ڈان نے اس کی بات نہ سنی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اور دونوں باہیں اگلی سیٹ پر ٹکا کر وہ باتیں کرتا رہا" گوتم تیری بات کتنی سچ نکلی میں نے اس دن شکاگو میں تجھ سے کہا تھا نا کیا پتہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو کہا تھا نہ گوتم لیکن تو نے کہا تھا ڈان ہم پھر ضرور ملیں گے تیری وہ بات سچ نکلی لوگ سچ کہتے ہیں ہندوستانیوں کو جوتش آتا ہے ــــ"

اور پھر اس نے پیچھے سے بازو بڑھا کر گیتا کا ہاتھ پکڑا اور اس کی ہتھیلی دیکھ کر کہنے لگا "تجھے بھی جوتش آتا ہے؟"

گیتا نے اس کے ہاتھ کی لکیروں پر اپنی پہلی انگلی کی پور گھماتے ہوئے کہا، ہاں آتا ہے یہ تیری لکیریں کہتی ہیں کہ اس ہاتھ کا مالک بڑا پیارا انسان ہے اور اسے دنیا سے بڑا عشق ہے اور وہ ساری دنیا میں گھومتا پھرتا ہے اور ابھی کئی برسوں تک اس نے دنیا سے پیار کرنا ہے اور پھر دوبارہ ہندوستان آنا ہے اور گوتم اور گیتا سے ملنا ہے گیتا نے اپنی انگلی کی پور اس کی لکیروں پر گھماتے گھماتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ــــ اس کے ہونٹوں پر آدھی مسکراہٹ تھی اس کی آنکھوں میں پوری مسکراہٹ تھی آدھی ہنسی تھی اور ایک معصوم بچے جیسی حیرت تھی۔

"اور؟ ــــ"

"اور یہ لکھا ہے کہ آدمی کو بہت سا پیار ملا ہے"

گیتا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر آدھی ہنسی اسی طرح موجود تھی لیکن لگتا تھا جیسے اس ہنسی کا وجود ڈگمگا گیا ہو۔

گیتا نے اس کی آنکھوں کے گہرے پانیوں پر سے ایک چھاؤں چپ چاپ گزرتی دیکھی۔

"اور ابھی بہت سا پیار اور بھی ملنا ہے"، گیتا نے اس کی آنکھوں میں اتری چھاؤں کی طرف دیکھ کر کہا۔

ڈان مسکرا دیا اور اس نے گیتا کا ہاتھ دبایا۔ پھر گوتم سے کہنے لگا "سن رہا ہے گوتم، یہ لڑکی کیا کہتی ہے؟ کہتی ہے مجھے ابھی بہت سا پیار اور ملنا ہے پگلی ہے نا؟ میں تو . . . . نہ جانے واپس گھر بھی پہنچ پاتا ہوں کہ نہیں!"

گوتم مسکرا رہا تھا سامنے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے اسٹیرنگ گھما رہا تھا موٹر تیز بھاگی جا رہی تھی۔

"ڈان میرے دوست، تجھے گھر بھی ضرور پہنچنا ہے اور پھر اگلے برس دوبارہ ہمارے پاس بھی ضرور آنا ہے اور ابھی تو بہت سے خط تو نے مجھے لکھنے ہیں...... اور......"

ڈان پھر اپنی رَو میں آگیا تھا گوتم یاد ہے جو خط تو نے مجھے روم سے لکھا تھا؟ اتنا لمبا خط......

اتنا پیارا خط آج تک مجھے کسی اور نے نہیں لکھا میں اسے کتنے ہی دن جیب میں لیے گھومتا رہا۔ اپنے گھر میں ایک کمرے میں سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے میں تیرے خط کی دو سطریں پڑھتا تھا اور اکیلا ناچتا رہتا تھا۔ اگر میری بیوی زندہ ہوتی اور مجھے یوں پگلوں کی طرح خط پڑھتے ہوئے دیکھتی تو کچھ پوچھے اور جانے بغیر طلاق دے دیتی" ڈان دیواریں اور چھتیں ہلانے والی ہنسی ہنسا گوتم بھی ہنستا رہا۔

گیتا نے وہ خط اگرچہ دیکھا نہیں تھا — مگر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ —— گوتم نے کتنا پیارا خط لکھا ہوگا اس نے لاڈ بھری نظروں سے گوتم کی طرف دیکھا۔

وہ اشوکا پہنچ گئے ڈان ناچے جا رہا تھا باتیں کیے جا رہا تھا۔ ڈائننگ ہال سے پہلے ہی ایک پھولوں کی دکان تھی پھول جیسی ایک کومل لڑکی اس دکان میں کھڑی تھی ڈان اس سے کئی پھولوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ تمہارے ملک میں ٹیولپس TULIPS ہوتے ہیں؟ ہائی ڈرینجرز کس موسم میں ہوتے ہیں ڈیلیا کی کونسی قسم ہوتی ہے کس موسم میں ہوتی ہے ——"

اس لڑکی کو صرف پھول بیچنے آتے ہیں پھولوں کے بارے میں اسے زیادہ معلومات نہیں تھیں وہ گھبرا رہی تھی اور گیتا کو شرم محسوس ہو رہی تھی کیونکہ اس معاملے میں وہ بھی ڈان کی زیادہ مدد نہیں کر سکتی تھی پھولوں کا گیتا کو بہت نشہ چڑھتا ہے لیکن ان کے نام وہ کبھی یاد نہیں رکھ سکتی یوں بھی اسے نام نمبر تاریخیں — سب بھول جاتی ہیں

ڈائننگ ہال بھی آرکسٹرا بج رہا تھا سازندے سیاہ اور سفید لباس پہن کر بڑی پیاری دھن بجا رہے تھے، لیکن جانے کیوں گیتا کو لگا کہ وہ دھن جذبوں سے خالی تھی اور اس کا جی چاہا آج سازندے کوئی خاص دھن بجائیں؛ گہری دھن بجائیں۔

گوتم نے ڈان سے پوچھا "ڈان تو پہلے سنگترے کا رس پیئے گا یا کچھ اور ——"

نہ سنگترے سے میرا جی پک گیا ہے میں پائن ایپل پیوں گا —— اور تم —— "

"میں بھی پائن ایپل جوس پیوں گی" گوتم نے آرڈر دے دیا۔

"گوتم یہ ہندوستانی راگ تو نہیں لگتا" ڈان نے اس دھن کو کچھ دیر سے سننے کے بعد کہا۔

ہاں یہ خالص ہندوستانی راگ نہیں ہے اصل میں ہمارے راگوں میں بھی مغربی اثرات در آئے ہیں"

"تجھے سنگیت اچھا لگتا ہے"؟ ڈان نے مجھ سے پوچھا۔

بے حد اچھا لگتا ہے جب میں بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں یا بے حد پریشان ہوتی ہوں تو سنگیت جیسا (soothing) سیڈ ٹیف اور کوئی نہیں ہے...... جیسے کوئی بہت پیار کرنے والا آدمی میرا سر اپنی گود میں رکھ کر میرے بالوں کو...... میری آنکھوں کی پلکوں کو سہلا رہا ہو......"

"گوتم یہ تیری دوست تو میرے جیسی ہی پگلی ہے" ڈان کا چہرہ اور بھی کومل بن گیا تھا۔

گوتم گیتا کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا گیتا کو لگا اس کے گال دہک اٹھے تھے۔

"لیکن مجھے پھولوں کی طرح راگوں کے نام بھی نہیں آتے نہ مجھے کسی دھن کو سُن کر یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ خالص ہندوستانی دھن ہے کہ مغربی اثرات والی" گیتا نے جلدی سے کہا۔

پائین ایپل جوس آگیا۔

"ڈان! تو انگریزی کھانا کھائے گا کہ ہندوستانی" گوتم نے پوچھا۔

"ہندوستانی، خالص ہندوستانی" ڈان نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔ گوتم آرڈر دے چکا اور جب ویٹر چلا گیا تو ڈان مینو کو ہاتھ میں لے کر ہندوستانی کھانوں کے نام پڑھنے لگا پھر ادھر ادھر دیکھ کر اور قدرے آگے کی طرف جھک کر آہستہ آواز میں گوتم سے کہنے لگا۔

گوتم! میں یہ مینو چرا لوں؟"

گوتم ہنس پڑا۔ ضرور چرا لے

ڈان نے اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ٹھونس لیا یہاں ایسے کوئی دیکھے گا تو نہیں نا؟ ڈان بسچ مچ چوروں والا چہرہ بنا کر، بڑے ایماندارانہ طریقے سے چوری کر رہا تھا۔

"نہیں بالکل نہیں" گوتم جیسے ایک بچے کو تسلّی دے رہا تھا۔

گوتم! تو کیا جانے؟ میں واپس جا کر ان ہندوستانی ڈشیز کے نام اپنے دوستوں کو سناؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ ایک بڑے پیارے دوست اور ایک بے حد اچھی دوست نے یہ سب کچھ مجھے کھلایا تھا۔"

جتنی دیر وہ کھانا کھاتے رہے ڈان باتیں کرتا رہا زیادہ باتیں شکاگو کے بارے میں تھی ان گھڑیوں کی تھی جو انہوں نے مل کر گزاری تھیں ڈان کے گھر کی باتیں جہاں وہ گوتم کو لے گیا تھا "گوتم تو جب چلا آیا تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تجھے وہ قالین تو دکھایا ہی نہیں جو میری بیوی نے اپنے ہاتھوں سے بنا تھا پتہ ہے وہ ایرانی طرز کا قالین ہے ایک ایک اسکوائر انچ میں ڈھائی ڈھائی سو گانٹھیں ڈال کر میری بیوی نے اسے بُنا ہے پتہ نہیں اسے دس برس لگے تھے کہ گیارہ برس۔ اُسے میں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

آپ کی بیوی قالین خود بُن لیتی تھی۔ گیتا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہمارا کوئی بچہ نہیں تھا اس لیے اُسے فرصت رہتی تھی اور بہت کچھ کرتی تھی سارا دن بھاگ دوڑ میں مصروف رہا کرتی۔ کئی کمیٹیوں کی ممبر تھی فرصت کے وقت اور سینکڑوں کام کرتی رہتی ——

ڈشیز سینٹ کرتی تھی قالین بنتی تھی بالشت بالشت چوڑی لیس بُن کر اس نے پلنگ پوشوں کو لگائی ہوئی تھیں۔

گوتم میں نے تجھے دکھایا تھا وہ لیس والا بیڈ کور ——؟ ڈان کی آنکھیں نم تھی نمی کے باعث اس کی آنکھیں اور بھی کول ہو گئیں تھیں۔

گیتا! ڈان اپنی بیوی سے دیوانوں جیسا عشق کرتا تھا شکاگو میں بھی وہ میرے ساتھ اسی کی باتیں کرتا رہا میں سوچتا رہا وہ عورت کتنی پیاری ہو گی جسے ڈان جیسا بڑھیا انسان اتنے برس میں اپنی مکمل devotion کے ساتھ پیار کرتا رہا۔ اور جو اپنی موت کے بعد ڈان کی سانسوں میں جیتی ہے۔" ڈان چپ چاپ گوتم کی باتیں سن رہا تھا۔ جو نظریں جھکا کے کھانے کھانے میں مصروف تھا کچھ دیر خاموشی رہی وہ آرکسٹرا کی دھن سنتے ہوئے کھانا کھاتے

رہے۔

اشوکا سے لوٹتے ہوئے ڈان نے اچانک گوتم سے کہا "ایک منٹ رکنا"

گوتم نے گاڑی روکی ڈان کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا انگلی کے اشارے سے پوچھنے لگا — گوتم یہ کونسا درخت ہے؟" سڑک کے کنارے ایک درخت کھڑا تھا۔ ٹھگنا سا، ابھرا ہوا اس کی ٹہنیوں کے کنارے پر کچے پیلے رنگ کے شگوفے لٹک رہے تھے! انگور کے گچھے جیسے، گوتم اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔

"تم جانتی ہو گیتا؟"

"میں نے تو پہلے ہی بتایا ہے کہ مجھے ناموں اور جگہوں کا پتہ نہیں ہوتا ہے" گیتا نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا اسے اپنی ناسمجھی پر جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔

"اچھا چلو، ڈان نے مایوس ہو کر کہا۔

ڈان کے ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی گوتم نے فیصلہ کر لیا کہ پرسوں کا ڈنر گیتا ڈان کے ساتھ کھائے گی گیتا انکار نہ کر سکی۔ دوسرے دن گوتم نیز دہلی چلا گیا۔ شام کے وقت گیتا نے ہوٹل ٹیلیفون کر کے ڈان کے بارے میں پوچھا وہ آگرے گیا ہوا تھا۔

اس کے اگلے دن کی دوپہر.........

گیتا بازار گئی ڈان کے لیے وہ کوئی پیارا سا تحفہ خریدنا چاہتی تھی اسے معلوم تھا کہ ڈان نے یہاں سے ابھی تک کچھ نہ خریدا ہوگا وقت ہی کہاں ملا تھا ابھی اُسے؟ گیتا اُسے کوئی چھوٹی موٹی چیز دینا چاہتی تھی جو اُسے ہندوستان آنے کی یاد دلاتی رہے۔ گیتا نے اس کے لیے ایک کتاب خریدی جس میں ہندوستانی پھولوں کی بڑی رنگین، تصویریں تھیں صندل کی لکڑی کے دو ہاتھی اور ہاتھی دانت کی بنی سر پر گھڑا اٹھائے ایک عورت۔

اور شام.............،

گیتا ہمیشہ کی طرح عام کپڑے پہننے لگی خاص قسم کی ساریاں اس کے پاس صرف دو چار تھیں وہ بھی پڑی پڑی سڑ رہی تھیں گیتا پہنتی ہی نہیں تھی لیکن اس دن اچانک اسے خیال آیا کہ اسے بڑھیا کپڑے پہننے چاہئیں خاص قسم کے کپڑے اس نے ایک پیاری سی ساری باندھی ساتھ ایک چاندی کی چین میں پرویا ہوا چھن چھن کرتا بھاری چاندی کا پینڈولم۔ گیتا ڈان کے ہوٹل پہنچی تو وہ سامنے ہی ویٹنگ روم میں بیٹھا چار پانچ آدمیوں کے ساتھ گپیں لگا رہا تھا۔ گیتا نے دیکھا وہ سب پچیس تیس برس کی عمروں کے نوجوان تھے تین ہندوستانی ایک غیر ملکی —

ڈان ان سے کہہ رہا تھا — "تم شکاگو آؤ جب تک تمہیں کام کاج نہیں ملے گا میرے مہمان بن کر رہنا بس ہوائی اڈے سے میرے گھر تک پہنچنے کے لیے صرف پانچ ڈالر تمہیں کیب والے کو دینے ہوں گے اس کے بعد میری ذمہ داری —"

گیتا ڈان کے بالکل پیچھے کھڑے ہو کر اس کی باتیں سننے لگی لیکن جب ڈان نے دیکھا کہ دوسروں کی توجہ اس کی پشت کی طرف ہو رہی ہے تو اس نے بڑھ کر دیکھا، گیتا تھی، وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ گیتا کا بازو پکڑ کر وہ باقی لوگوں سے اس کا تعارف کرانے لگا۔

ڈان نے بھی کپڑوں کے سلسلے میں آج خاصہ اہتمام کیا تھا چکیدار سوٹ میں اس نے اپنے جسم سے کم از کم دس پندرہ سال جھاڑ کر اتار دیے تھے۔ انٹروڈیوس کرانے کے بعد وہ گیتا کو بیرونی دروازے کی طرف لے کر چلا گیا گیتا نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پیکٹ اسے دیتے ہوئے کہا "پہلے یہ پیکٹ تو ریسپشنسٹ کے پاس رکھوا دے ڈان، واپسی پر لے لینا" پل کے پل ڈان کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی چپ چاپ آنکھوں میں سوال بھر کر وہ گیتا کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ایک دو چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں ڈان تیرے لیے"۔ گیتا نے مسکرا کر جھجکتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے"؟ ڈان جیسے مکئی کے دانے کی طرح چٹخ کر کھل اٹھا پارسل ہاتھ میں پکڑ کر اُسے جلدی جلدی کھولتے ہوئے وہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ جن کے ساتھ وہ پہلے گپیں لگا رہا تھا، کاغذ کھول کر اس نے پہلے کتاب دیکھی دوسرا لفافہ اس نے درمیانی چھوٹی میز پر رکھ دیا جس پر رنگین تصویروں والے کچھ میگزین پڑے ہوتے تھے کتاب کے پہلے صفحہ پر گیتا نے لکھا تھا:-

"اسے ٹری بیوٹ ٹو دا سمفنی آف پرنسلی"

ڈان نے یہ لفظ پڑھے تو پگھل کر پھر گیتا کی طرف دیکھا آنکھیں نم، چہرہ بالکل پگھلا ہوا، ہونٹ ذرا سے ہل کر چپ سے، ہاتھ میں کھلی کتاب کا پہلا ورق، نظریں جیسے نہایت معصومانہ انداز میں گیتا سے پوچھ رہی تھیں۔ "میں تیرے ' ان لفظوں پر اعتبار کر لوں؟"

گیتا مسکرائی ——— سیدھا اس کی طرف دیکھ کر

اس نے ایک بار پھر کتاب کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھر گیتا کے لکھے ہوئے لفظ پڑھے اور پھر کتاب کو پاس بیٹھے اپنے ہندوستانی ساتھی کی طرف بڑھا دیا ——— "یہ دیکھو، یہ لڑکی میرے لیے یہ تحفہ لائی ہے"! اس کے لفظوں میں اس تحفے کے لیے اور تحفہ لانے والی لڑکی کے لیے گہری عقیدت تھی۔

پھر دوسرا لفافہ کھول کر اور چیزوں کو دیکھنے لگا۔ ایک ایک چیز نکالتا جاتا تھا اور بچوں کی طرح ناچتا جاتا تھا اور پھر اپنے ساتھیوں کو دکھاتا تھا۔ "دیکھو! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ جتنا میں ڈیزرو کرتا تھا۔ زندگی نے مجھے اُس سے کہیں زیادہ دیا ہے۔ زندگی نے ہمیشہ میرے ساتھ رعایت کی ہے "سب چیزیں لفافے سے نکال کر، اور وہاں بیٹھے لوگوں کو دکھا کر، جیسے وہ فارغ ہو گیا۔ اپنے دونوں بازو اس نے اپنی چھاتی پر لپیٹ لیے اور بڑی گمبھیر آواز میں ان سے پوچھنے لگا۔ "مجھے سچ بتانا! کیا کسی بھی آدمی کے ساتھ ایسا پیار اور عجیب واقعہ پیش آسکتا ہے؟"

"نہیں پیش آسکتا" وہ سب پتہ نہیں سچ بول رہے تھے کہ جھوٹ البتہ پاس کھڑی گیتا شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ ڈان نے اچانک گیتا کا ہاتھ پکڑا اس کی ہتھیلی سیدھی کر کے اپنے ہونٹ اس پر رکھ دیئے۔ گیتا کی ٹانگیں جیسے بے جان ہو گئیں۔

اس نے چپ چاپ چیزیں سمیٹیں اور ریسپشنسٹ کے پاس جا کر کہنے لگا ——— "انہیں اُوپر میرے کمرے میں پہنچا دو"۔ گیتا کی طرف آ کر اس نے اپنے بازو میں گیتا کا بازو لپیٹ لیا اور دروازے کی طرف

چل پڑا۔

باہر کھلا لان تھا اندھیرا تھا اس نے گیتا کی طرف دیکھا اور اس کی گردن کو چومنے لگا نم آنکھیں پگھلا ہوا احساس. بے بول بوسے، بے آواز شکرانہ! گیتا کو اچانک احساس ہوا کہ یہ آدمی اپنی ساری گرم جوشی اور سنگیت اور ہنسی کے باوجود اندر سے کہیں بہت دکھا ہوا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈان کہنے لگا "کہیں ایسی جگہ لے چل جہاں سنگیت ہو" گیتا ہنسنے لگی اشو کا تو ڈان نے دیکھ لیا تھا وہاں اُسے دوبارہ لے جانا فضول تھا پھر کہاں؟ ابھی تو صرف سوا آٹھ بجے تھے موسیقی تو شاید نو بجے سے پہلے کہیں شروع نہیں ہوتی۔ پہلے وہ اُسے "دو نگا" لے گئی مینجر نے کہا، آج میوزک نہیں ہو گی آرکسٹرا کہیں باہر گیا ہوا ہے، پھر وہ اُسے گیلارڈ لے گئی یہاں بھی موسیقی ابھی شروع نہیں ہوتی تھی، خیر انہوں نے ایک ٹیبل لے لی —— آرکسٹرا کے پلیٹ فارم کے بالکل قریب وہ بیٹھ گئے، تو ڈان نے کہا۔

"تجھے پتہ ہے گیتا اس ساری میں تو بالکل شہزادی لگتی ہے"

"سچ" گیتا نے مسکرا کر الٹ سوال کیا۔

"کیا عام طور پر عورتیں یہاں ایسی ہی ساریاں باندھتی ہیں" وہ پوچھ رہا تھا،

"نہیں کسی خاص موقعہ پر"

ڈان چُپ چاپ گیتا کی طرف دیکھتا رہا۔

"آج تجھ سے جو ملنا تھا خاص بات تھی نا یہ، اس لیے تو یہ ساری باندھی"

ڈان بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑا —— "سچ"؟

پھر اس نے گیتا کا گلے میں پڑا ہوا چاندی کا پینڈولم ہاتھ میں لے کر کہا۔

"یہ چاندی کا ہے؟"

"ہوں"

"امریکہ میں عام طور پر عورتیں موتیوں کی مالا پہنتی ہیں" پھر وہ دیواروں پر بنی ہوئی نقاشی اور خوبصورت ہال کی تعریف کرتا رہا، کھانا آ گیا، گیتا نے اپنی عادت کے مطابق دو تین چیزوں کا ایک ایک چمچہ اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

"بس؟" ڈان نے گیتا کی پلیٹ کی طرف دیکھ کر یوں کہا جیسے ایک ماں بچے کو کم کھاتے دیکھ کر کہتی ہے۔ پھر اس نے قریب پڑی ہوئی پلیٹ اس پلیٹ میں الٹا دی ساتھ ہی بہت سارا مکھن بھی —— "تو تو چڑیوں کی طرح کھاتی ہے اگر تو اس عمر میں ایسے دانہ اٹھا اٹھا کر کھائے گی تو میں بوڑھا آدمی بھلا کیا کھاؤں گا؟ بلکہ تجھے سیر ہو کر کھاتے دیکھ کر ہی تو مجھے بھوک لگے گی"۔

"تو بوڑھا کب ہے ڈان تو تو، مجھ سے بھی زیادہ جوان ہے دیکھ کس طرح تو ناچ ناچ کر چلتا ہے کس طرح تجھے پھولوں کے ساتھ، درختوں کے ساتھ عشق ہے اوہ سچ، وہ تو میں تجھے بتانا بھول ہی گئی پرسوں تو نے جس درخت کا نام پوچھا تھا نا گوتم سے، اسے لیبرنم کہتے ہیں"۔

ڈان جیسے نشے میں مخمور ہو گیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ پھولوں کی اور درختوں کی باتیں کرتا رہا —— لیڈ سویٹ،

وائٹ واٹرلِلی، ہین بیری، برڈز نیسٹ اور آرچڈ کی باتیں! ہنیسکل کی نشہ آور خوشبو کی باتیں! کارن فلاور اور سپرنگ جینشین کی باتیں! پرامِڈ آرچڈ کے جامنی حسن کی باتیں!

پھر وہ کہنے لگا "پتہ ہے، دھوپ پھولوں کا سانس ہوتی ہے۔ تیرے ملک میں کتنی پیاری دھوپ ہے۔"

گیتا نے ہنس کر کہا "انہیں دِنوں پیاری لگ رہی ہے نا تجھے، اگر تو کبھی مئی یا جون میں یہاں آتا، تو پتہ لگتا۔"

اس نے اپنی جھیلوں کی گہرائی میں سے "پل کے پل" خاموش گیتا کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے کہنے لگا، تو ساتھ ہوتی تو میں نے دھوپ کو بھی ملائم بنا لینا تھا۔ پھر وہ گیتا کو بتا رہا تھا کہ جب سے وہ اپنے کام سے ریٹائرڈ ہوا ہے وہ کئی ملکوں میں گھوم چکا ہے چار مہینے نہیں ہوتے کہ میرا جی اوبنے لگتا ہے اکتا نے لگتا ہے اور پھر میں گھر سے نکل پڑتا ہوں "پھر وہ گیتا سے پوچھنے لگا۔" تو کبھی ہندوستان سے باہر گئی ہے"؟

گیتا نے کہا "گئی تو نہیں لیکن دِل بہت کرتا ہے۔"

گیتا نے لمحہ بھر توقف کے بعد اس کی طرف دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ اگلی بات جو اس کے گلے تک آگئی تھی وہ اِس آدمی کے ساتھ — اِس امریکن کے ساتھ — کرنی چاہیئے کہ نہیں۔

"ایک بات بتاؤں؛ تو مائینڈ تو نہیں کرے گا" گیتا جھجکتے ہوئے پوچھتی ہے۔

"نہیں بالکل نہیں" وہ اپنا چھری کانٹا پلیٹ میں رکھ کر گیتا کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔

"پتہ ہے میرا کہاں جانے کو جی چاہتا ہے؟ ایک تو جاپان اور دوسرے اٹلی پھر کہیں اور امریکہ بھی بعد میں"۔

ڈان جیسے ناچ اٹھا — "تجھے پتہ ہے — میرا بھی اصلی وطن اٹلی ہے!"

"اٹلی؟ لیکن گوتم تو کہتا تھا ....."

وہ شریر ہنسی ہنسنے لگا "گوتم کو کیا خبر! اصلی بات تو میں تجھے بتانے لگا ہوں۔ اور تو اور، جب کچھ دِن پہلے میں کلکتہ میں تھا وہاں کچھ طالب علموں نے مل کر اینٹی امریکہ جلسہ کیا۔ میرے ہوٹل کے سامنے چوراہے میں، انہوں نے اخباری کاغذوں کا، ایک امریکی کا پتلا بنایا اور پھر اُسے آگ لگا دی۔ اب میرا قد ہے چھوٹا" — وہ پھر ہنسا: "میں نے بھیڑ کو دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی — میں نے سوچا، تماشہ دیکھوں۔ تبھی دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ کہنے لگا، تم کون ہو، اوئے! امریکی ہو؟ میں نے سوچا کچھ نہیں۔ اچانک ہی میرے منہ سے نکلا "نہیں، میں تو اٹیلین ہوں" ڈان زور سے ہنسا۔

"سچی؟" گیتا نے بات جاری رکھنے کی خاطر کہا۔

"دراصل میری ماں اطالوی تھی۔ سُن، آج میں تجھے یہ بات بھی بتا دوں۔ میں نے یہ بات، سوائے ایک دو دوستوں کے، کسی اور سے یہ بات نہیں کہی"۔ پھر اس نے اپنی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیوں میں سے گیتا کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اپنی بیوی سے بھی نہیں، اگرچہ اس نے زندگی کے چھتیس برس میرے ساتھ گذارے ہیں۔ میں تیس سال کا تھا جب میں نے شادی کی۔ دو برس گزارے ہیں اسے مرے ہوئے، ہوتے نا چھتیس برس؟"

"ہاں پورے چھتیس"

"اور تجھ سے ملے چھتیس گھنٹے بھی نہیں ہوتے" اس کی آواز بہت گہری ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں کی عمر جتنی۔

وقت کا ایک ٹکڑا خاموش، ایک ابابیل کی طرح اڑتا ہوا آیا اور جیسے ڈان کے اور گیتا کے درمیان پنکھ سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے پروں میں اب بھی اڑان کی تھرتھراہٹ تھی۔

"میری ماں اطالوی تھی۔ بے حد خوبصورت۔ وہ ایک لڑکے سے پیار کرتی تھی لیکن لڑکے کی ماں کا کہنا تھا کہ جہیز آئے گا تو بیاہ کروں گی اپنے بیٹے کا۔"

"جہیز؟" گیتا حیران ہو کر پوچھتی ہے۔

"ہاں" اس زمانے میں یہی رواج تھا لڑکے والے یہ امید کرتے تھے کہ لڑکی بہت سا جہیز لائے گی۔ تیرے ملک میں نہیں ہوتا اس طرح؟"

"ڈان! ہمارے ملک میں اب بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔" گیتا نے آہ بھر کر کہا۔

ایک خاموش پل.......

"میرا نانا موچی تھا۔ بے حد غریب۔ گھر میں دو وقت روٹی بھی نہیں پکتی تھی۔ وہ جہیز نہیں دے سکتا تھا۔ میری ماں بہت دکھی تھی۔ اس نے اپنے محبوب سے کہا کہ اگر وہ اس کے ساتھ شادی نہ کر سکی تو خودکشی کر لے گی۔ اس کا محبوب، اپنی محبوبہ اور ماں میں انتخاب نہ کر سکا اور ایک دن وہ اپنا ملک چھوڑ کر، پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔

خاموشی......

ڈان اپنی جوان ماں کے درد میں جیسے ڈوب گیا تھا گیتا ڈان کے درد کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے بڑا تیکھا احساس ہو رہا تھا کہ انسان اپنے اپنے درد کے تیکھے پن میں اکیلا ہے۔ اس تیکھے پن کا مداوا اسے کہیں بھی نہیں مل سکتا۔

"پھر میری ماں کی ایک سہیلی نے اسے امریکہ سے لکھا کہ اس نے میری ماں کے محبوب کو وہاں دیکھا تھا۔ بس میری ماں اٹلی سے چل پڑی۔ ایک جہاز میں اس نے کھانا پکانے اور پلیٹیں صاف کرنے کی نوکری کر لی۔ ان پیسوں کے ساتھ اس نے اپنے سفر کا کرایہ چکا دیا لیکن جب میری ماں، اپنی سہیلی کے پاس امریکہ پہنچی تو اسے پتہ لگا کہ اس کی سہیلی نے جھوٹ بولا تھا۔ اصل میں اس سہیلی کا ایک خالہ زاد بھائی تھا بے حد امیر ماں باپ کا بگڑا ہوا آوارہ بیٹا تھا۔ اس نے کہیں میری ماں کی تصویر دیکھ لی تھی۔ اور اپنی خالہ زاد بہن کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ وہ اسے کسی بھی صورت اٹلی سے بلائے۔ بدلے میں اس نے اپنی خالہ زاد بہن کو ایک کاٹیج دینا تھا۔ سو یہ ایک سودا تھا جس میں میری ماں پھنس گئی" ـــــ ڈان نے ایک آہ بھری۔

"میری ماں کو جب اس چال کا پتہ چلا تو وہ اپنی سہیلی سے لڑ کر اس کے گھر سے بھاگ گئی اور جا کر ایک دھوبن کے پاس کپڑے استری کرنے کی نوکری کر لی لیکن اس سہیلی کا وہ بھائی بھی بے حد اکھڑ تھا۔ اس نے پولس کو رشوت دے کر میری ماں کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو میری ماں واپس اٹلی چلی جاتی یا پھر اس سے شادی کرنا منظور کر لیتی۔ واپس اٹلی جا کر، میری ماں اپنے بوڑھے ماں باپ کو اور

دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ سو آخر اس نے اسی شخص سے شادی کرنا منظور کر لیا۔"

اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ڈان اپنے باپ کی بات سنا رہا ہے! گیتا کو اچانک دھچکا سا لگا کہ اس آدمی کا بچپن ایک ٹوٹے ہوتے گھر کی دیواروں کے درمیان گزرا تھا۔ شاید اس کے اندر ــــ کہیں بہت اندر ــــ رستا ہوا درد اسی بے چھت بچپن کے باعث تھا جہاں شاید بہت سی ٹوٹی ہوئی نوکیلی اینٹیں اس کے بچپن کے نرم بدن میں چبھ گئی تھیں۔

گیتا نے ڈان کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اس نے جھک کر گیتا کی ہتھیلی کو چوم لیا۔

خاموشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میری ماں نے کبھی میرے باپ سے پیار نہ کیا۔"

"مجھے پتہ ہے" گیتا نے آہستہ سے کہا۔

"اور مجھے اپنے باپ سے اور کچھ نہیں ملا۔ صرف ایک محل جیسا گھر ملا۔ اس میں سینتیس کمرے ہیں۔ دنیا بھر کی چیزیں ہیں۔ بڑھیا سے بڑھیا فرنیچر ہے لیکن مجھے بھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ وہ گھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک عجائب گھر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک کپکپی سی لہراتی ہوئی گیتا کے بدن سے گزرتی ہے ــــ تو کیا اس آدمی کو اس کے باپ نے جو عجائب گھر جیسا گھر دیا تھا۔ اسے اس کی بیوی نے بھی چھتیس برسوں میں گھر نہ بنایا؟ عجائب گھر ہی رہنے دیا؟

چپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جمی ہوئی بھاری چپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اچانک آرکسٹرا بجنے لگا۔ آرکسٹرا والوں کو ان لوگوں نے اوپر چڑھتے اور سارے سازوں کو ٹھیک ٹھاک کرتے نہیں دیکھا تھا وہ ایک دم ہال کے فرش میں سے اُگ آتے تھے۔

ڈان توجہ سے آرکسٹرا سننے لگا ساتھ ہی پیروں سے تھاپ دینے لگا گیتا کو لگا جیسے زندگی کی ایک لہر اس کے بدن میں سے گذرتی تھی جھنجھناتی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ایک اور لہر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ایک لہر ۔ ۔ ۔ ۔

ڈان اپنی کرسی پر تھوڑا تھوڑا اچھل رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کچھ کچھ تھرک رہا تھا۔ پھر لمحے بھر کو دُھن توجہ سے سننے کے بعد کہنے لگا "پتہ ہے یہ رشین ٹیون ہے اس گیت کے بول ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ اُس دُھن میں اُس گیت کے بول بھر کے آہستہ آہستہ گا کر گیتا کو سنانے لگا۔

دھن ختم ہوئی ڈان نے زور سے تالی بجائی ایک ہلکی سی تالی گیتا نے بھی اس میں شامل کر دی سارے ہال میں تالی کی آواز صرف ان کی ٹیبل سے آئی تھی۔

ڈان نے جیسے شرمندہ ہو کر اپنے آس پاس دیکھا سب چپ چاپ کھا رہے تھے یا بیٹھے تھے یا آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے "یہاں کوئی آرکسٹرا کی داد نہیں دیتا"؟ ڈان بالکل بدھو بچے جیسا منہ بنا کر گیتا سے پوچھ رہا تھا گیتا چپ تھی۔

"اگر تو غصہ نہ کرے تو ایک بات کہوں۔"

گیتا جانتی تھی کہ ڈان ہندوستانیوں کے متعلق کوئی بات کرے گا۔ اور کوئی وقت ہوتا اور کوئی آدمی ہوتا تو

گیتا فوراً مورچہ بناکر تیار ہوجاتی اگر غیر ملکی ہندوستان کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالتا تو وہ دس گنا ناراض ہوتی لیکن یہ تو ڈان تھا۔

گیتا تو اس کی باتوں کے بوجھ کو سہارا دے کر ہلکا کرنا چاہتی ہے۔

"نہیں مجھے کس بات کا غصہ کرنا ہے، ویسے میں بھی تجھے ایک بات کہوں اور کسی سے مت کہنا؟" اس نے بڑے رازدارانہ لہجے میں اس سے کہا "مجھے کئی بار لگتا ہے کہ یہ ملک میرا گھر نہیں ——

I DON'T BELONG TO THIS PLACE مجھے لگتا ہے کہ میں کوئی پر-دیسی ہوں فارنر بغیر کسی پاسپورٹ اور ویزے کے یہاں آگئی تھی"۔ گیتا ہنس کر بات کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ڈان اس کی طرف دیکھتا ہے آنکھیں بھی نہیں جھپکتا۔

"لیکن ڈان تو میرے مقابلے میں ہلکی قسم کا پردیسی ہے تیرا کوئی ہوم کنٹری تو ہے میرا تو کوئی ہوم کنٹری بھی نہیں اسی لیے میں بہت پختہ بہت زبردست پردیسی ہوں، گیتا پھر ہنستی ہے پہلے سے بھی زیادہ چھنکتی ہنسی

ڈان اپنی جھیلوں کی گہرائیوں میں سے بالکل خاموش اس کی طرف دیکھتا ہے۔

"تو بتا نا کیا کہنے لگا تھا اِس ملک کے بارے میں —" گیتا اس سے پوچھتی ہے۔

"نہیں کچھ نہیں" ڈان بہت مدھم آواز میں جواب دیتا ہے۔

"بتانا"

گیتا بچوں جیسی ضد کرتی ہے۔

"کچھ نہیں یہی کہنے والا تھا شاید...... کہ...... ہندوستانی مجھے کچھ اس طرح کے لگتے ہیں جیسے پانی کے نیچے اگے ہوئے ویڈیز ہوتے ہیں نہ پانی کے پودے......! خیر رہنے دے"۔

آرکسٹرا پر نئی دھن بجنا شروع ہوئی۔

ڈان تھوڑی دیر سنتا رہا بڑے غور سے —— پھر ایک دم جیسے اچھل پڑا "پتہ ہے گیتا یہ اٹیلین ٹیون ہے" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ آرکسٹرا والوں کے پاس جاکر کہنے لگا میں تمہارے ساتھ گاؤں گا، وہ پیانو کے پاس کھڑے ہوکر گانے لگا، گاتے ہوتے وہ صرف گیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آس پاس کے لوگوں، کی نظروں کا گیتا کو احساس تھا وہ کبھی ڈان کی طرف اور کبھی گیتا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

ڈان تو جیسے صرف گیتا کے لیے گارہا تھا۔ دُھن ختم ہوئی، ڈان کا گیت پورا ہوا، گیتا نے زور سے تالی بجائی اس دفعہ سارے ہال میں تالیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ ڈان جیسے زمین سے بالشت بالشت اونچا چلتا ہوا گیتا کے پاس آیا گیتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرح بٹھایا جیسے گھر کا کوئی آدمی برسوں بعد گھر لوٹا ہو —— ڈان خوش تھا، بہت ہی خوش۔ اس نے جھٹ گیتا کی گردن کا بوسہ لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی "فکر نہ کر کسی نے نہیں دیکھا" گیتا مسکرادی۔ ڈان کا چہرہ شرارتی بچے جیسا لگ رہا تھا۔

گیتا سوچ رہی تھی —— یہ کیسا انسان ہے۔ اپنی عمر کو ایک لبادے کی طرح کبھی اپنے بدن پر پہن لیتا ہے کبھی اتار کر پرے رکھ دیتا ہے۔

گیتا ڈان کے گیت کی تعریف کر رہی تھی۔ وہ مچل مچل کر خوش ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں پھر کیسے پھولوں کی باتیں شروع ہو گئیں ڈان کہنے لگا "پتہ ہے؟ — اٹھائیس سال تک میں نے پھولوں کی دکان چلائی تھی۔ میری پھولوں کی دکان فسکاگو تو کیا، قرب و جوار کے تمام علاقے میں سب سے بڑی تھی"۔

"سچی!" گیتا سچ مچ حیران ہو گئی۔ یہ لکھ پتی باپ کا بیٹا کوئی کارخانہ کھولتا، کوئی بیوپار کرتا، اسے دکانیں کھولنے کی کیا ضرورت تھی بھلا!

لیکن پھولوں کی دکان! یہ بات گیتا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ ڈان کی شخصیت کو دیکھ کر پھولوں کی دکان والی بات بیحد نامعقول لگ رہی تھی۔

"اصل میں گیتا، میں بہت اکیلا تھا۔ مَیں نے تجھے بتایا ہے نا؟ ہمارا کوئی بچہ نہیں تھا"

"ہاں بتایا تھا یہ تو"

"میری بیوی بھی بہت اکیلی تھی۔ ہم دونوں ہی اکیلے تھے، اچانک وہ گیتا کی طرف مڑا "تو میری بات سمجھ رہی ہے نا؟"

"ہاں — ڈان!" گیتا نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آہستہ سے دبایا۔ ڈان نے اپنا دوسرا ہاتھ گیتا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"وہ اپنی تنہائی کو بھرنے کے لیے جیسے اپنے گھر سے نکل گئی۔ بے حد سوشل ہو گئی۔ کسی کا بچہ پیدا ہو۔ کسی کی بیٹی کا بیاہ ہو کسی کے گھر کوئی بھی چھوٹا موٹا واقعہ ہو۔ کسی کے بیٹے کو پردیس سے واپس آنا ہو۔ میری بیوی کے لیے فوراً فون آجاتا اور وہ لوگوں کے کام کرنے چل پڑتی۔ سارا دن میری بیوی ٹیلیفون پر باتیں کرتی رہتی یا اپنی موٹر لے کر گھومتی رہتی۔ امریکہ میں تجھے معلوم ہے نا کہ گھر کا کام کرنے کے لیے، شاذ ہی کوئی نوکر رکھ سکتا ہے۔ ہمارے گھر میں دو نوکر تھے اور ایک نوکرانی۔ نوکرانی صرف میری بیوی کے بالوں اس کے کپڑوں اس کے جوتوں اور اس کی اپائنٹ منٹس کا خیال رکھتی تھی۔ مَیں نے یہ سب کچھ اُسے دیا لیکن شاید اُس کی تنہائی کو نہ بھر سکا۔ اس کے بدلے اس نے مجھے تنہائی دی۔ اور ساتھ ہی میرے گھر کو گھر کی جگہ عجائب گھر دیا" گیتا کو لگا ڈان اُس کے پاس بیٹھا بیٹھا کہیں دور کھسک گیا تھا۔

"بس، اور مَیں نے پھولوں کی دکان کھول لی۔ اس کی موت سے دو تین برس پہلے ہی میں نے دکان بند کر دی، پھر مَیں نے سوچا، اب مجھے ریٹائرڈ ہو جانا چاہیئے اور آرام کرنا چاہیئے۔ دکان بند کرنے کے بعد یا تو فلوریڈا چلا جاتا تھا یا کچھ دیر کے لیے یورپ۔ کبھی اٹلی، کبھی فرانس کبھی سوئٹزرلینڈ۔ ایک بار میں آئرلینڈ بھی گیا۔ وہاں بھی ہندوستان کی طرح بہت غربت ہے"۔

"ہاں میں نے بھی سنا ہے"۔

"لیکن جب میری بیوی گزر گئی تو اکیلا گھر دیکھ دیکھ کر مَیں بہت رویا۔ پتہ نہیں کیا ہوتا ہے۔ خواہ دو اجنبی آدمی ہی گھر میں رہتے ہوں، انہیں ایک دوسرے کی عادت ہو جاتی ہے ...." گیتا کو لگا وہ ڈان کی تنہائی کو ہاتھ لگا کر، چھو کر دیکھ سکتی تھی۔ اُسے محسوس ہوا وہ اس تنہائی کا رنگ بھی دیکھ سکتی تھی۔ گہرا اسلیٹی راکھ جیسا رنگ —

"اوہ ڈان" اس نے جیسے بھیگ کر کہا۔

"تجھے ایک بات بتاؤں؟ مجھے ہمدردی سے ترس سے سخت نفرت ہے۔ اسی لیے میں کبھی کسی سے اپنے بارے میں باتیں نہیں کرتا لیکن تیری اس ہمدردی سے مجھے عجیب سکون مل رہا ہے۔ تیری ہمدردی ننگی ہمدردی نہیں دکھاوے والی۔ اس میں تازہ اگنے والی گھاس کی مہک ہے یا شاید بھیگی ہوتی مٹی کی خوشبو ہے"۔ آرکسٹرا پر کوئی نئی دُھن بج رہی تھی ۔۔ "تجھے ناچنا آتا ہے؟" ڈان ایک دم پوچھتا ہے۔

"نہیں"۔

"تھوڑا سا تو؟"

"بالکل نہیں ۔۔ مَیں تو کبھی ایک پیر بھی نہیں ناچی۔ بلکہ مَیں نے تو لوگوں کو مغربی ناچ ناچتے ہوتے بہت کم دیکھا ہے۔ مَیں زیادہ کہیں آتی جاتی نہیں ہوں ۔۔"

"اگر ناچنا نہیں آتا تو سیکھ لے"۔

"اچھا ڈان! تو۔ جب اگلی بار ہندوستان آتے گا۔ اس وقت تک، مَیں تیری خاطر ناچنا ضرور سیکھ لوں گی۔ تو آتے گا تو مَیں تجھے یہی تحفہ دوں گی"۔

"کل کس نے دیکھا ہے؟ تو ابھی سیکھ لے نا" اور وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ گیتا کی سمجھ میں پوری بات آتی اور وہ انکار کر سکتی، ڈان نے اس کا بازو کھینچ کر اُسے اٹھا لیا۔ اور تقریباً گھسیٹتا ہوا ڈانس فلور کی طرف لے چلا۔

"ڈان ..... میں ......" لیکن وہ تو اس کی بات ہی نہیں سُن رہا تھا۔

"مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا گیتا کہ اتنی خوبصورت موسیقی بیکار جانے دی جاتے اگر امریکہ میں کہیں کوئی اس طرح کی ٹیون بج رہی ہوتی تو اب تک سارے جوڑے فلور پر ہوتے"۔

فلور پر صرف وہ دونوں ہی تھے ۔۔ اور گیتا پانی پانی ہو رہی تھی اُسے نہ تو ایک پاؤں اٹھانا ہی آتا تھا۔ نہ دوسرا پاؤں رکھنا ہی،

"ڈان! میں سچ کہتی ہوں مجھے ناچنا بالکل نہیں آتا"۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"تو فکر نہ کر۔ مَیں جو تیرے ساتھ ہوں"۔ اور ڈان نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو لپیٹ لیا" تو کچھ مت کر، کچھ مت سوچ۔ صرف میرا ہاتھ پکڑ لے اور اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لے۔ باقی میرا ذمہ ۔۔" جو ڈان نے کہا ۔۔ گیتا کرتی گئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا نہ ہی اس کا دماغ کچھ اور سوچ سکنے کے قابل تھا۔ بعد کی اسے کچھ خبر نہیں ۔۔ ڈان پتہ نہیں اس کے کان میں کیا کیا کہتا رہا۔ پتہ نہیں آس پاس کے لوگ پگھل کر کیسے لاوجود میں بدل گتے! ۔۔ گیتا کو کچھ خبر نہیں۔

ایک تال ۔۔ اٹھتے پڑتے قدم ...... ڈان کے ہلکے ہلکے بول اور بس، جیسے دو کھوتے ہوتے بچے کسی بھرے میلے میں روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھیں۔ محسوس کریں کہ وہ دونوں ہی کھو گتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ لیں اور پھر لوگوں کی بھیڑ سے اور اِدھر سے اُدھر بھاگتے پیروں سے الگ تھلگ، ایک طرف بیٹھے، ریت کے گھر بنا کر ہنسنے لگیں۔

اچانک جیسے گیتا کے تلوے میں کانٹا چبھا۔ ڈان کہہ رہا تھا "گیتا! خدا کرے، جب تیری شادی ہو، تجھے بڑا ہی اچھا جیون ساتھی ملے۔ بہت سا پیار تجھے وہ دے ——" گیتا کی پسلیوں کے بالکل اندر سے کچھ اُبلتا ہوا نکلا اور اس کے گلے تک آیا۔ اس نے خالی گھونٹ بھر کر اسے گلے سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کی "چپ، کچھ مت کہہ، اس بیچارے پردیسی کو کل چلے جانا ہے —— اس کا بوجھ بانٹتے بانٹتے، اپنا بوجھ اُسے دے کر کہیں حساب برابر نہ کرلینا۔ اپنا بوجھ اپنے پاس ہی رہنے دے۔ اپنی صلیب اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے رکھ۔ خاموش! گیتا اپنے آپ کو سمجھاتی ہے۔

"لیکن بات سن۔ تو ایک بار میرے گھر آ —— شکاگو۔ تیرے لیے میں سارا گھر خالی کردوں گا۔ پہلے ہی سے سب کمرے صاف کر کے رکھوں گا۔ اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں اپنے دوست کے گھر جا کر سو جایا کروں گا۔"

"کیوں، ڈان؟"

"اس لیے کہ لوگ باتیں نہ بنائیں۔ تیرے جیسی پیاری اور اچھی لڑکی کے بارے میں کوئی بری بات اپنے منہ سے نکالے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا" گیتا کو لگا۔ ایک آنسو تھا جو بہنے کے لیے کلبلا رہا تھا "تجھے بالکل کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ضرور آنا۔"

"اچھا ڈان!" گیتا نے آہستہ سے کہا۔

آرکسٹرا کی دُھن ختم ہوئی۔ ڈان نے الگ ہٹ کر ہلکی سی تالی بجائی۔ پھر وہ آرکسٹرا والوں کی طرف قدرے جُھکا۔ گیتا بھی جُھکی۔ پھر وہ جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ڈان نے پھر اس کی گردن چوم لی اور کہنے لگا "کسی نے نہیں دیکھا" گیتا نے گھڑی دیکھی۔ سوا دس بج رہے تھے۔

"اوہ ڈان! اب چلنا چاہیئے۔"

"کیوں، ابھی تو سوا دس بجے ہیں" ڈان نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ——

"ڈان! اس ملک میں اتنے بجے تک کوئی بھی عورت، اکیلی گھر سے باہر نہیں رہی۔ مَیں بھی کبھی نہیں رہی۔ صرف آج۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اُف تب تو اس ملک میں رہنا پاپ ہے۔ گناہ ہے" اس نے تلملا کر کہا۔

بل دے کر وہ اٹھ بیٹھے —— گیتا نے اُسے، اُس کے ہوٹل پہنچا دیا۔ راستے میں وہ اس سے اقرار لیتا رہا۔ مجھے خط ضرور لکھنا۔ شکاگو ضرور آنا، گیتا وعدے کرتی رہی۔ ویسے اپنے دل میں وہ جانتی تھی کہ ان وعدوں کی کیا اہمیت ہے۔ اپنے ہوٹل کے سامنے اُترتے وقت ڈان لمحے بھر کے لیے گیتا کی طرف دیکھتا رہا۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کی آنکھوں کی نمی کو، جیسے چھو سکتی تھی۔ اُترتے ہوئے اس نے گیتا کی گردن کو چوما، اُس کی ہتھیلی کو چوما، اور آہستہ سے کہا "گاڈ بلیس یو۔"

گیتا گھر پہنچی —— سونیا اُس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی —— آیا نے بتایا کہ اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ گیتا کے کلیجے پر جیسے کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہو اس نے سونیا کو لاڈ کر کر کے جگایا اور پچکار کر کھانا کھلایا۔

آیا نے کہا "صاحب کا ڈسپینسر آیا تھا۔ وہ آج گھر نہیں آئیں گے۔"

گیتا چپ رہی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ـــــ ویسے آج اچانک، گیتا کو یوں محسوس ہوا کہ سونیا کے پاپا گھر آئیں یا نہ آئیں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ـــــ اس بات میں سے جیسے ڈنک ختم ہو گیا تھا۔ اہمیت بھی ختم ہو گئی تھی ـــــ ایک عجیب بے نیازی ـــــ

گیتا نے کھانا کھاتی سونیا کا منہ چوم لیا۔ روٹی کے نوالے سے بھرے منہ کے ساتھ وہ مسکرائی۔ مسکراہٹ اتنی اس کے ہونٹوں پر نہیں تھی جتنی اس کی آنکھوں میں تھی۔

اگلی صبح . . . . . .

ڈان نے گیتا کو بتایا تھا کہ وہ ساڑھے پانچ بجے اپنے ہوٹل سے چل پڑے گا اور چھ بجے ایئر کمپنی کے دفتر پہنچے گا ـــــ کناٹ پلیس اور پھر ایروڈرام ـــــ پالم ـــــ گیتا کی آنکھ کھلی تو اجالا ہو رہا تھا اس نے اٹھ کر گھڑی دیکھی ـــــ پانچ بجے تھے ـــــ وہ واپس آ کر سونیا کی چارپائی پر لیٹ گئی اور سوئی ہوئی سونیا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔

وہ ڈان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک اکیلا انسان، ایک پوری عمر کی تنہائی، جس کے قدموں کے پیچھے تھی اور موت کی تنہائی، جس کے قدموں سے آگے تھی۔ تنہائی کے احساس کو دھوکہ دینے کے لیے وہ ملک ملک گھومتا . . . . . کسی ملک میں کوئی واقف نہیں کوئی دوست نہیں کوئی اپنا نہیں پردیس میں پردیسی اکیلا . . . . کوئی لینے کے لئے نہیں آتا، روانہ ہوتے وقت کوئی الوداع کہنے نہیں جاتا . . . . ہوائی جہاز نئی زمین کو چھوتا ہے تو دھرتی استقبال نہیں کرتی ہوائی جہاز کسی زمین کو چھوڑتا ہے تو ہاتھ نہیں ہلتے کوئی رومال نہیں لہراتا . . . . . وہ اٹھ کر فوراً تیار ہوئی۔

کناٹ پیلس ایئر انڈیا کے دفتر پہنچی تو چپراسی نے بتایا کہ بس تو مسافروں کو لے کر چلی گئی ہے ـــــ ڈیڑھ منٹ پہلے گیتا نے جھنجھلا کر گھڑی کی طرف دیکھا اس کی گھڑی میں تو ابھی چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

وہ پالم پہنچی ـــــ ڈان کہیں نظر نہ آیا، اس نے انکوائری کے افسر سے پوچھا، وہ مسافروں کی فہرست دیکھنے لگا ـــــ

"ڈان تو یہاں کوئی نہیں۔"

گیتا گھبرا گئی ـــــ "ایک بار پھر دیکھئے نا" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

اس نے فہرست پھر دیکھی "ایک ڈانفلڈ ڈی کارل ہے۔"

"وہی ہو گا" گیتا اپنی نظروں میں خود ہی بے وقوف دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ تو ابھی نہیں پہنچا ہماری بس پر نہیں آیا تھا کناٹ پلیس شاید خود پہنچے گا"

"فلائٹ کتنے بجے جاتی ہے۔"

"ساڑھے سات"

گیتا نے گھڑی دیکھی سات تو بج چکے تھے، وہ آس پاس دیکھنے لگی ـــــ بے مطلب

ڈان سات بج کر دس منٹ پر پہنچا جلدی میں ـــــ گیتا کو دیکھ کر وہ ایک پل کے لئے جیسے حیران ہو گیا گم سم جیسے اسے یقین ہی نہیں آ رہا ہو، پھر اچھل کر یوں گیتا کے گلے لگ گیا جیسے برسوں کا کوئی بچھڑا اپنی ماں سے لپٹ

جاتا ہے یا کوئی بچھڑا دوڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاتا ہو یا جیسے پردیس سے لوٹنے والا اپنی محبوب سے گلے ملتا ہے ___ گیتا کے گلے لگ گیا وہ بے تحاشا اس کی گردن کو اس کی ہتھیلیوں کو چومنے لگا ___ آنکھیں بھری ہوئی آنسو گلے تک آتے ہوئے چپ کا چپ۔

کسٹم والوں نے اُسے جلدی سے بلالیا کسٹم سے فارغ ہو کر وہ بھاگتا ہوا گیتا کے پاس آیا۔

"گیتا میں صبح سے فون پر کوشش کر رہا تھا کہ آج کی روانگی کینسل کر دوں پندرہ دن اور یہیں رہ جاؤں' رات میں نے بھی فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح کہیں بھی ٹھہرنے کو میرا جی کبھی بھی نہیں چاہا ___ تنگا گو میں نہیں، فلوریڈا میں بھی نہیں، اٹلی میں بھی نہیں، کہیں بھی نہیں صرف یہاں ....." پل کے پل چپ رہ کر وہ اپنی جھیلوں کی گہرائیوں میں سے خاموش گیتا کی طرف دیکھتا رہا۔

وقت کا ایک ٹکڑا، جیسے کوئی سہا ہوا دھک دھک کرتے کلیجے والا خرگوش ..... ہوا اس کے جسم کے رویں بھی کانپ رہے تھے۔

نہ جانے میں تجھے بھول بھی سکتا ہوں کہ نہیں، گو تم بھی یہاں نہیں تھا تیرا تو ٹھکانہ ہی مجھے معلوم نہیں لیکن پھر بھی ... ... یہ تسلی تو رہتی کہ میں تیرے شہر میں رہ رہا ہوں اسی شہر میں تو بھی کہیں ہے ..... اسی پیاری سی دھوپ والے شہر میں .....!"

ایک ایئر ہوسٹس بھاگی بھاگی آئی "مسٹر ڈی کارل پلیز!" وہ اُسے جلدی چلنے کے لئے کہہ رہی تھی۔

اچانک ڈان نے گیتا کو اپنی باہوں میں لے لیا اس کے ماتھے کو چوما اور پھر ہوائی جہاز کی طرف دوڑ پڑا دو قدم دوڑتا پھر مڑ کر ہاتھ ہلاتا پھر دو قدم دوڑتا پھر مڑ کر ہاتھ ہلاتا۔

جہاز کے انجن میں شور شروع ہو گیا پہیے چل پڑے گیتا جہاز کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی رہی، لہروں کی ایک دیوار اور اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک گیتا کو احساس ہوا کہ یہ تو اس کی اپنے آنسوؤں کی دیوار تھی۔

اس نے خود کو سنبھالا ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ وہ مڑی اور بیرونی گیٹ کی طرف چل پڑی دو آدمی بڑے رازدارانہ طریقے سے مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ باتوں کے کچھ ٹکڑے اُڑتے ہوئے آئے ___ SPHINTER کی طرح!

"اس طرح کے امیر بوڑھے جب باہر سے آتے ہیں تو اسی طرح ہوتا ہے بھئی"

"پیسہ بڑی چیز ہے دوست"

"اس جال میں تو جس کا جی چاہے کسی بلبل کو پھنسالے"

"بلبل نہیں مچھلی یار مچھلی"

"آ میری مینا ایک نظر ادھر بھی ....."

"ہم بھی کھڑے ہیں راہوں میں ..... گانے کی آواز"

"ہائے"

ایک بدصورت آدمی کی آواز

ایک قہقہہ .....

گوربچن سنگھ بھلر
ترجمہ - شریف کنجاہی

خون

کرتارے نے تلوار کھونٹی سے اتاری۔ میان میں سے نکالی اور اس کی دھار پر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا آزمایا پھر آنگن میں اُگی ہوئی ٹاہلی کے پاس آیا۔ کلائی جتنی موٹی ایک ڈال تنے سے پھوٹ کر ذرا دائیں جانب بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے تلوار کا بھرپور وار کیا اور وہ ڈال مولی کی طرح کٹ کر گر پڑی۔ پھر تلوار کو چوم کر میان میں ڈالا اور گھر سے باہر چل دیا۔

چوپال سے گھر کو آتے ہوئے اس نے چوکیدار کو اعلان کرتے سُنا تھا کہ مربع بندی والے پٹواری گاؤں میں آگئے ہیں۔ یہ سناؤنی جیسے وہ پھونک تھی جو عرصہ سے سلگتے گھاس پھوس کے ابھی جلے کہ جلے ڈھیر میں شعلہ پیدا کر دیتی ہے۔ برسوں سے اس کے دل ایک گوشہ میں ایک خلش سی ہلتی آرہی تھی لیکن اس کو کوئی پھل نہیں لگ رہا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ وہ وقت آگیا ہے اور اگر اسے کچھ کرنا ہی ہے تو اب ہی کیوں نہ کرے جب ساتھ ہی زمین والی بات کا ٹانکہ بھی مربع بندی میں لگ جائے۔

گھر سے نکل کر کرتارا دو میل ہٹ کر گزرتی ہوئی پکی سڑک کو جاتی راہ کو نہ گیا۔ وہ اگلے گاؤں کے اڈے کو جاتی ہوئی سنسان سی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ پندرہ گھماؤں کا معاملہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں تھی لیکن وہ تو اپنے ایک آئندہ کے دشمن کا کانٹا نکلنے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے جلتے آتے کوئی واقف نہ ملے۔ اپنے منصوبے کی گمبھیرتا کا خیال کرتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ پہلے اس نے رات کی بس میں سفر کا سوچا تھا۔ لیکن اس طرح وہاں جا کر تڑکا ہو جاتا اور ایسے کاموں پہ جانے والوں کو وہاں رات ہی موزوں ہوتی ہے۔

کئی بار کرتارا اپنے ہم مشربوں میں جب پی رہا ہوتا تو لاف بازیاں کرتا کہ "اپنے سامنے تو یارو ایسا وقت بھی آتا ہے کہ دریا رک جاتا ہے۔" کبھی کبھی منڈلی میں سے کوئی بچر بھی لگا دیتا ہے کہ "جس کی ماں کو گھر سے نکالا ہے۔ وہ ہی تجھے پوچھے گا کہ دریاؤں کے پانی کیسے رک جایا کرتے ہیں۔ وہ بھی ابھی تو دہی کے ساتھ روٹی کھا رہا ہوگا۔" اور کرتارا خفیف سا ہو جاتا اور کہتا۔۔۔ "وہ تو کیڑے پتنگے جتنا چھوکرا ہے میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ پھر سالو اس کی ماں کو میں نے گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔"

جب کبھی ایسی بات چھڑتی اکثر آئی گئی ہو جاتی۔ لیکن کرتارے پر ایک اثر سا ضرور چھوڑ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ ٹھیک ہی اس کا کل کا دشمن دور بیٹھا دہی کے ساتھ روٹی کھا رہا ہے۔ اور لاکھ وہ آج کیڑا پتنگا سہی وہ بڑا ہو کر

سانپ بھی بن سکتا ہے۔

نرم سی دوپہر ہونے لگی تھی۔ بس آئی۔ کرتارے نے شکر کیا کہ بس میں اس کے گاؤں کا کوئی آدمی نہیں تھا وہ درمیان میں جا کر کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور سوچ رہا تھا کہ جگہ کے قتل والے معاملے میں وہ لوگوں کی نگاہوں میں بالکل صاف نہیں تھا۔ گاؤں میں اس وقت لوگ اس کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کا اس معاملہ میں سیدھا صاف ہاتھ ہے۔ کوئی کہتا کہ اسے پتہ ضرور تھا۔ عام چرچا یہی تھا کہ پولیس پہلے اسے بھی شامل کر رہی تھی لیکن راتو رات اس نے تھانے دار کو رقم جھونک دی تھی۔ اور کلونت آپ بھی شک کرتی تھی کہ قتل میں کرتارے کا ہاتھ ہے۔

بھاگتی جا رہی بس میں سے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر پھسلتی ہوئی نگاہ ڈالتے اس نے سوچا کہ اسی لئے تو اس کے گھر آباد ہونا۔ اس نے قبول نہیں کیا تھا۔

جب گاؤں کے دو اور آدمیوں پر جگہ کے قتل کا مقدمہ بن گیا تو کرتارے نے کلونت کو گھر آباد کرنے کی بات چلائی تھی کہ جگہ کے قتل کے بعد وہ بالکل بے آسرا ہو گئی تھی۔ ساس سسر پہلے ہی مر چکے تھے اور بس دو سال کا ایک بیٹا ہی اس کا پریوار تھا۔ کرتارا سمجھتا تھا کہ ایک تو کلونت بے سہارا ہونے کے باعث شاید اس کی بات کو نہ ٹالے۔ دوسرے رشتہ داری کے لحاظ سے بھی وہ اپنا حق سمجھتا تھا کہ جگر کا دادا پوتے ناتے کا وہ ایک ہی تو بھائی تھا اور اگر کلونت اس کے گھر نہ بسے گی تو کیا کرے گی۔

پہلے کرتارے نے شاموں نائن کے ذریعے پیغام بھیجا۔ پھر اس نے آپ سیدھم سیدھی کلونت کے ساتھ بات کی۔ کلونت کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے —— کرتارے تو نے یہ بات کرنے کی جرأت کیسے کی۔ ابھی تو مرنے والے کی راکھ بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اور میرے لئے تو وہ عمر بھر گرم رہے گی۔"

کرتارے نے لکڑی کے ایک ٹکڑے سے زمین کریدتے ہوئے کہا۔ کلونت کور شاموں نائن نے بھی مجھے ہی جا کر کہا تھا۔ پر مجھے گائے والی قسم ہے کہ جگہ سنگھ کے قتل کا مجھے ذرا بھی پتہ نہیں تھا۔ لوگ سالے یونہی بے پر کی اڑاتے رہتے ہیں۔

"لوگ تو بے پر کی اڑاتے ہیں۔ لیکن بنئیے سے پیسے بیاج پر لے کر تھانے دار کی جیب بھرنے کی تجھے کیا مجبوری تھی۔" کلونت نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی سالے سے پیسے لے کر نہیں دیئے تھے۔ اور پھر اب تو مارنے والے بھی پکڑے گئے ہیں۔ دودھ پانی الگ ہو گئے ہیں۔"

"کرتار دودھ پانی تو خدا اتارتا ہے۔ لیکن تو اس قسم کی بات کو پھر نہ چھیڑنا۔ خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دے مجھے یہ بال پال لینے دے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" کلونت نے سماجی انداز میں کہا۔

"کلونت کور — بھائی کا مجھے کیا دکھ نہیں ہے۔ بھائی تو دایاں بازو ہوتے ہیں۔ . . . ." کرتار مسکین بنا کھڑا تھا۔

"اگر اب بھی تو مجھے . . . . اس میں بھی تیرا ہی خون ہے۔ . . . . بڑا ہو گا تو تیرا مان بنے گا۔"

"میں اسی لئے تو تجھے کہتا ہوں۔ لیکن تو کان ہی نہ دھرتی۔"

"نہیں کرتارے۔ تو اپنے گھر رس بس۔ مجھے اپنے دکھ بھوگنے دے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ خدا کے لئے مجھے اس بال کو پالنے دے۔ میں اس پہ ان باتوں کا سایہ نہیں پڑنے دینا چاہتی۔"

کرتارے کا خیال تھا کہ لالٹین جیسی کلونت گھر کا اجالا بن جائے گی۔ بالک اس کا کل کا دشمن بننے کی جگہ اسے باپ سمجھنے لگے گا۔ اور پندرہ گھماؤں زمین مزید اس کے قبضہ میں آجائے گی۔ لیکن وہ عورت بڑی چالاک نکلی۔

بس پھر کسی اڈے پر رکی۔ کرتارے کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ باہر ایک آٹھ نو سال کا لڑکا میٹھی گولیاں بیچ رہا تھا۔ کرتارہ نے سوچا کہ اب تو وہ بھی اتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔ اور اگر کلونت اسے آب دینے لگی ہو تو پانچ سات سال بعد وہ اس کی گردن کاٹ سکے گا۔ کرتارے کے ساتھ والے گاؤں میں ایک چودہ سال کے لڑکے نے اکیلے ہی چالیس سال کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔

باہر قدرے اندھیرا سا ہونے لگا تھا۔ کرتار نے دیکھا کہ ایک بادل کا ٹکڑا سورج پر چھا گیا ہے۔ اس نے نگاہ پھر بس کے اندر کر لی۔ اس کے جی میں آیا کہ لوگ جگر کے متعلق پہلے ہی اس کو ابھی تک مشکوک سمجھتے ہیں اور بات تو دیر سویر کھل ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کا اندیشہ پھر جاگا کہ اگر اس نے سستی سے کام لیا تو لڑکا جوان ہو کر پہل کر جائیگا۔ جاٹوں کی خصومت تو پشتوں تک جاتی ہے۔

پھر اگر اس کا اپنا منصوبہ ٹھیک رہے تو دس اس کی اپنی اور پندرہ جگر والی مل کر پچیس گھماؤں کا پورا مربع بن سکتا ہے۔ اور وہ سردار کہلوا سکتا ہے۔ اب جن کے پاس وہ زمین حصے یا ٹھیکے پہ ہوتی ہے وہ موجیں کر رہے ہیں۔ کلونت جب سے اپنے باپ کے ساتھ چلی گئی ہے بس دو تین بار خاموشی سے شہر آئی اور بنیئے کے ذریعے زمین حصے یا ٹھیکے پر دے گئی۔

کرتار کو کلونت کا گاؤں میں نہ آنا چبھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کلونت کے دل میں کھوٹ ہے۔ کلونت کے ساتھ کی کہائی باتوں میں سے اسے صرف اسی قدر یاد تھا کہ وہ بھی لوگوں کی طرح جگر کے قتل میں اسے ملوث سمجھتی تھی۔ اور اس کی باقی باتوں کو وہ چکنی چپڑی سمجھتا تھا۔

لیکن کرتارے کے ہونٹوں پر ایک دم پھر خشکی سی آگئی۔ اگر کوئی الجھاؤ پڑ گیا تو؟ جگر کے قتل میں اس کا براہِ راست کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پھر بھی تھانے دار نے اسے بلوا کر کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہتھکڑی دکھا دی تھی۔ کرتارے نے سوچا کہ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ چاہتا تو جگر کو گزرنے والے حادثے کے متعلق پہلے بتا سکتا تھا۔ لیکن اسے تو یہی خیال تھا کہ وہ جگر کی صرف ٹانگ ہی کاٹیں گے۔ اور شریک کی ٹانگ کٹ جائے تو اس میں ایک داخلی سکون ملتا ہے۔

گیلے اور دیپے نے ایک زمین رہن لینے کا سودا کرنا چاہا تھا۔ جگر نے بھاؤ بڑھا کر وہ زمین خود لے لی۔ انہوں نے جگر سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ وقوعہ کے روز جگر اگلے کھیت گیا ہوا تھا اور گیلا اور دیپا اپنے کھیت میں بھٹی لگائے بیٹھے تھے۔ کرتارا اپنے کھیت میں سے سانڈ بھگاتا ہوا اچانک ان کے پاس آنکلا۔ گرم گرم دارو کے نشہ میں انہوں نے اسے بتا دیا کہ وہ آج جگر کی ٹانگ کاٹ دینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ کرتارے کے ساتھ بھی جگر کی گاڑھی نہیں چھنتی۔

"کرتارا تو وہاں سے چلا آیا۔ دن ڈھلے جب جگر اگلے کھیت سے لوٹا تو گیلے اور دیپے دونوں نے اسے گھیر لیا۔ گیلے

نے گنڈاسہ اس کی ٹانگ کی طرف چلایا لیکن وار خالی گیا۔ جگر بھاگ کر نکلنے لگا تو کیلے نے للکارا کہ دیپے جاٹ ہاتھ سے گیا۔ مار میرے سالے کو" اور دیپے نے برچھا اس کے پہلو کی طرف پھینکا۔ ضرب سے جگر اکھڑ کر یوں گرا کہ اس کا اپنا بوجھ ہی برچھے کو اور گہرا گڑو گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پولیس کو بتہ چل گیا تھا کہ کرتارا اس دن کیلے اور دیپے کے پاس گیا تھا۔ اور بڑی مشکل سے اس نے سودی پیسوں سے تھانے دار کو گانٹھ کے اپنی گلو خلاصی کروائی تھی۔ اور اب جب وہ اپنے ہاتھوں ایسا کام کرتے جا رہا تھا تو کیا بنے گا۔ بات تو چھپی نہیں رہ سکتی۔ بھتیجے ہی کا خون کرنے والی بات سے اسے کراہت سی آئی اور اس کا جی چاہا کہ اگلے اڈے پر اتر کر واپس چلا جائے۔

لیکن وہ اس کا بھتیجا کہاں کا تھا، وہ تو اس کا کل کا دشمن تھا۔ پھر اسے اس گاؤں میں کون جانتا ہے۔ اور اب وہ وہاں پہنچے گا اندھیرا ہو گیا ہوگا۔ رب خیر کرے تو سویرے واپس اپنے گاؤں میں ہوگی۔ اگر کوئی اڑچن پیدا ہو گئی تو دو گھماؤں زمین رکھ دوں گا۔ جگر والی پندرہ گھماؤں تو مل ہی جائے گی۔ اور قتل میں تو آج کل کون سزا پاتا ہے۔ اس نے سوچا کہ کسی کا ہاتھ پاؤں توڑ دو تو چار سال جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ لیکن قتل کرو تو بری کہ کبھی موقعہ کا گواہ نہیں ملتا کبھی کوئی اور قانونی گرفت ڈھیلی پڑھ جاتی ہے۔۔۔۔۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ وہ نیچے اترا تو سورج بالکل نیچے جا چکا تھا۔ اور ابھی اسے تین کوس مسافت کرنی تھی۔ اس وقت تک تو خاصی تاریکی چھا چکی ہوگی۔ وہ من میں تدبیریں کرتا ہوا جا رہا تھا کہ معاملہ ڈھب سے کیسے نپٹے۔

تھوڑا تھوڑا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے۔ وہ پگڈنڈی کے قریب ہی ایک کنوئیں کے پاس بیٹھ گیا۔

بگانی بستی تھی۔ نہ کسی سے جان تھی نہ پہچان۔ اور ایسے منصوبے پر آئے وہ کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کرتار کے من میں پھر خوف جاگا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چپکے سے لڑکے کا اور اگر داؤ چل جائے تو کلونت کا بھی ٹنٹا چکا کر اپنے گاؤں لوٹ جائے اور کسی کو بھنک تک نہ پڑے۔

وہ پھر دلیر ہو گیا۔ کس سے سراغ نشانی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جگر کی شادی سمے برات کا اتارا جس دھرم شالا میں ہوا تھا اس کے قریب ہی تو جگر کے سسرال والوں کا بیرونی گھر تھا اور اندر والا گھر روٹی کھاتے وقت اس نے اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔ کیا عجب رب مہر کرے اور دونوں ماں بیٹا اکیلے باہر والے مکان کسی کام کاج کو آتے ہوئے مل جائیں۔۔۔۔۔

کھیت میں سے کوئی پگڈنڈی کی طرف آرہا تھا۔ کرتار نے اپنے من میں کہا۔۔۔ "چلو جیسے موقعہ بنے گا دیکھا جائیگا پہلے منصوبہ بنانے کی کیا ضرورت۔" تلوار اس نے کنوئیں کی منڈیر پر رکھ دی اور کھڑا ہو گیا۔ آنے والا کوئی لڑکا سا تھا جس کے پاس خالی برتن تھے۔ شاید کھیت پر روٹی دے کر آیا تھا۔

"کاکا۔۔۔ یہ گاؤں سون پورا ہی ہے نا؟" کرتارے نے لڑکے کے ساتھ بات چلائی۔ "مربع بندی نے راستے ہی بدل دیئے ہیں۔"

"ہاں سون پور ہی ہے۔ پہلے راستہ اُدھر سے ہوتا تھا۔" لڑکے نے دور کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تیرے باپ کا نام کیا ہے؟"

"سُچا سنگھ"

کرتارے نے ذہن پر زور ڈالا۔ جگر کے سسر کا نام بھی سُچا سنگھ تھا۔ لیکن اس کی گھر والی کو مرے برسوں ہو گئے تھے۔ یہ کسی اور سچا سنگھ کا بیٹا ہوگا۔ اس نے سوچا کہ اگر بالک کو باتوں میں لگائے تو شاید کوئی بھید مل جائے چنانچہ مذاق کے طور پر اس نے لڑکے سے کہا۔ "تجھے اس وقت اکیلے آتے ڈر نہیں لگتا۔ ہم تو تیری عمر میں شام سمے گھر سے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔"

"ڈر کس کا؟" لڑکے نے بے جھجک جواب دیا۔

"ہمارے گاؤں میں تو چور تیری عمر کے لڑکوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔" کرتارے نے ہنس کر کہا۔

"مجھے کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ مالوے میں میرا شیر جیسا چاچا ہے کرتارا۔ وہ اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔۔۔" لڑکے نے بے ارادہ ہی کنویں پر پڑی تلوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کرتار کو زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے دوڑ کر اسے آغوش میں لے لیا۔ اور خوب بھینچا۔

تلوار کنویں کی منڈیر پر ہی پڑی رہ گئی۔ سون پور سے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اس کی دونوں آنکھیں ٹپ ٹپ برس رہی تھیں۔



فلسطین

"ہمارے حاکمو!
تم نے ہماری سرزمین کو قبرستان میں بدل دیا ہے
تم نے ہمارے سروں میں گولیاں بوئی ہیں
اور خون ریزی کو روش بنایا ہے
ہمارے حاکمو!
کوئی عمل، اپنے احتساب کے بغیر مکمل نہیں
تم نے جو کچھ ہمارے لوگوں کے ساتھ کیا ہے
وہ تاریخ کے ماتھے پہ رقم ہے۔"

(محمود درویش)

شعر: عوبی سُبیت

ترجمہ: سجاد رضوی

وطنِ عزیز

(اقرت کے لوگوں کے ترکِ وطن کی پچیسویں سالگرہ پر)

اس کا نام اقرت ہے
میرا دل اس میں چھپا ہے، میری پیشانی اس کے پاؤں پر ہے
اس کا ہر ٹیلہ مقدس ہے
اس کی ہر وادی رشکِ جنت ہے
اگر وہ تمام دنیا مجھے دے دیں
تو بھی اپنے اقرت کی محبت انہیں نہ دوں گا
اس کی انگور کی بیلوں، اس کی انجیروں،
اس کے خوش گلو پرندوں کے گھونسلوں
اس کے انار، اس کے زیتون
ان کے سوا مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی
اس کے پہاڑوں کے غار میرے دل کے دروازے کھول دیتے ہیں
انہوں نے مجھے یہاں سے نکال باہر کیا، انہیں حق نہ تھا
عزت والے گھر میں انہوں نے میری خود اعتمادی کو منہدم کر دیا
اور ذلت کی گاڑی میں زبردستی سوار کرا دیا
میری اپنی سرزمین میں خوشیوں کے دروازے بند کر دیئے
میں چیختا رہا پکارتا رہا کہ وہ میری آواز سنیں
لیکن میں گونگی اور بہری ہوا کو آوازیں دے رہا تھا
وہ غرور و تکبر سے میری پکار سنتے رہے
اور میں اپنے حق کے لئے مصروفِ جہاد رہا

او مجھ سے میری زمین چھیننے والو، مجھے خود اپنے سے الگ کرنے والو!

مجھے سمجھو

میں اپنی زمین کی محبت کبھی نہیں بھول سکتا
یہی میرا ایمان ہے، یہی میرا عقیدہ ہے

مجھے اپنے وطن واپس آنے سے منع کرنے والو!
تم نے میرے منہ سے لقمہ چھینا، میری اولاد کو اس سے محروم کر دیا
لیکن ہوش کرو، کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ تم مجھے مایوسیوں کے اندھے کنوئیں میں دھکیل سکو گے
میرے وطن سے میری دوری کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو
جس قدر تم مجھ پر ظلم ڈھاؤ گے
جس قدر تم میرے منہ آؤ گے
اسی قدر اپنا حق حاصل کرنے کے لئے میری ضد بڑھے گی
اپنے مرجانے والے ہم وطنوں کی شرافت کی قسم!
انہوں نے مجھے ایک ہی سبق دیا ہے، وہ سبق مجھے یاد ہے
میں کبھی نہیں جھکوں گا، کسی کے ہاتھ نہیں چوموں گا
میں اپنا حق مانگتا رہوں گا چاہے تم مجھے صلیب پر چڑھا دو
عزت کی موت میرے ضمیر کو تسکین دے گی
اور میری موت بہترین شہادت ہو گی

(۲)

میرے وطن کا حسن، ہر دیکھنے والے کو اپنا شیدا بنا لیتا ہے
اگر میں مرجاؤں تو مجھے اس کے پھولوں سے کفن دینا
اس کے فراق میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے
اس کی مٹی کے سوا میرے دل کا مسکن کوئی نہیں
اگر میں اس مٹی میں مل جاؤں تو میرا جسم پاک و صاف رہے گا، اس میں تعفن کا مسکن نہ بن سکے گا
اگر مجھے ساری دنیا کے ملک دے دیں
تو بھی اس کے عوض میں خاکِ وطن کا ایک ذرہ بھی ان کے حوالے نہیں کروں گا

شعر:- توفیق زیّاد (فلسطین)

ترجمہ:- سجاد رضوی

زیتون کے تنے پر

چونکہ میں اُون نہیں بنتی
چونکہ ہر روز گرفتاری کے وارنٹ مجھے شکار کرتے ہیں
اور پولیس کی نگاہیں میرے گھر پر لگی رہتی ہیں
کبھی تلاشی کے لئے، کبھی صفائی کے لئے
چونکہ کاغذ خریدنا میرے بس میں نہیں
اس لئے جو کچھ مجھ پر بیتی ہے
وہ سب اور اپنے سارے راز
اپنے گھر کے صحن میں تنہا کھڑے زیتون کے تنے پر کھود دوں گی

میں اس پر اپنی داستان نقش کر دوں گی
اپنے المیے کے تمام مراحل، اپنی حسرتیں اور ان کے نوحے
اپنی مصیبتیں اور زندگی کی تلخیاں جو مجھے چکھنا پڑی ہیں
اور جنہیں مستقبل کی اُمیدوں کی مٹھاس کا دسواں حصہ
مجھ ان کو بھول جانے میں مدد دیتا ہے
اپنے آباؤ اجداد کی ویران قبریں
اپنے اجڑے ہوئے خاک بسر باغ کو دیکھ کر کھنچی ہوئی آہیں
یہ سب کچھ میں اس زیتون پر نقش کر دوں گی

مجھ سے چھن جانے والی زمین کے ہر ٹکڑے کا نمبر
اپنے گاؤں کا حدود اربعہ، اس کا محلِ وقوع
اس کے باشندوں کے گھروں کے نمبر جنہیں ڈائنامیٹ نے خاک میں ملا دیا ہے،
وہ تمام درخت جنہیں بلڈوزروں نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے

وہ تمام جنگلی معصوم پھول جنہیں مسکرانے پر روند ڈالا گیا
ان تمام لوگوں کے نام، جو مری سانسوں میں، مری آہوں، میرے اعصاب میں
مضطرب رہتے ہیں
ان قید خانوں کے نام جہاں مری زندگی کے دنوں کو راتوں میں بدل دیا گیا
ان ہتھکڑیوں کے نام جن سے مجھ دلہن بنایا گیا
ان فائلوں کا تذکرہ جو میرے محافظوں نے تیار کیں
ان تمام گالیوں کی فہرست جن سے مجھے نوازا
یہ سب کچھ میں زیتون کے تنے پر کھود ڈالوں گی
میں اس پر یہ نقش کر دوں گی
"اے کفر قاسم! میں تجھے بھول نہیں سکتی"
میں اس پر کندہ کروں گی
"دیر یاسین کی یاد میرے دل میں درخت کی جڑوں کے مانند پھیل رہی ہے"
میں اس پر ثبت کر دوں گی
"ہم اپنے المیے کے نقطۂ عروج پر آ پہنچے ہیں
وہ ہمیں چاٹتا رہا ہے، ہم اسے چاٹتے رہے ہیں
لیکن آخرکار ہم نقطۂ عروج پر آ پہنچتے ہیں
میں اس زیتون کی بوڑھی جلد میں چھپا دوں گی
ہر وہ بات جو سورج نے مجھے بتائی
اور چاند نے سرگوشی میں کہی
اور وہ داستاں جو لاشوں سے پٹے ہوئے کنوئیں کے قریب لیٹی ہوئی بے بس قبر نے مجھے بتائی
جس کے چاہنے والے اسے تنہا چھوڑ گئے
میں نقش کرتی رہوں گی، کھودتی رہوں گی
تاکہ یہ سب کچھ مجھے یاد رہے
اپنے المیے کے سب مراحل، اس ڈرامے کے سب ابواب
ایک دانے سے ایک گنبد تک ہر بات
اپنے گھر کے صحن میں تنہا کھڑے زیتون کے تنے پر کھودتی رہوں گی، کھودتی رہوں گی

محمود درویش
ترجمہ: منو بھائی

اُداس لہجے میں سنائی جانے والی ایک کہانی

ہمارے ملک میں
وہ نہایت اُداس لہجے میں کہانی سناتے ہیں
میرے اس دوست کی جو گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا
اس کا نام ——
اس کا نام نہ لو
لفظوں کو سینے میں سلامت رہنے دو
ورنہ ہوا انہیں راکھ کی طرح اُڑا کر لے جائے گی
اسے دلوں ہی میں رہنے دو
وہ ایک ایسا زخم ہے جو شفا کی دسترس سے باہر ہے
میرے عزیزو! میرے یتیمو! میں بے قرار ہوں
کہیں ہم اس کا نام بھول ہی نہ جائیں
ناموں کی اس تنگنائے میں ہم اسے بھول ہی نہ جائیں
سردیوں کی بارش اور طوفان میں کہیں ہمارے دلوں کے زخم
سو ہی نہ جائیں، مجھے خطرہ ہے

اس کی عمر ——
وہ ایک ایسی کلی تھی جسے بارش بھی یاد نہیں
اس نے کبھی چاندنی رات میں کسی محبوبہ کی دیوار کے قریب
کھڑے ہو کر گیت بھی نہیں گایا تھا
دیوار تک اس کے ہاتھ پہنچ ہی نہیں پاتے تھے
اس کی نگاہوں نے کبھی کسی گزرتی ہوئی خواہش کا
تعاقب بھی نہیں کیا تھا

کبھی کسی لڑکی کو چوما یا اس سے تفریحاً اظہارِ محبت بھی نہیں کیا تھا
زندگی میں صرف دو مرتبہ ایک لڑکی کو دیکھ کر آہ بھری تھی،
مگر اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا

وہ بہت چھوٹا تھا
وہ لڑکی، اور وہ اُمید اس کی پہنچ سے باہر تھی
ہمارے ملک میں وہ اس کی کہانی سناتے ہیں
جب وہ چلا گیا تو اپنی ماں کو الوداع بھی نہیں کہا
دوستوں کو بھی نہیں بتایا، کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا
خدشات کو کم کرنے والی کوئی بات بھی نہیں کہہ گیا
اپنی ماں کے لئے لمبی راتوں کو روشن کر گیا
جواب آسمان سے، اس کی چیزوں سے، اس کے سرہانے سے،
اس کے سوٹ کیس سے باتیں کرنے کو رہ گئی ہے، کہ ـــــ

اے رات، اے ستارو، اے خدا، اے بادل! کیا تم نے میرا
وہ اڑتا ہوا پرندہ دیکھا ہے
اُس کی آنکھیں دو چمکتے ہوئے ستارے تھے
اُس کے ہاتھ دو گلدستے تھے
اُس کا سینہ چاند اور ستاروں کا تکیہ تھا
اُس کے بال ہوا اور پھولوں کی طرح لہراتے تھے
تم نے کوئی ایسا مسافر دیکھا جو ابھی سفر کے قابل بھی نہیں ہوا تھا
اور جو اپنے ساتھ کھانا بھی نہیں لے گیا
اُس کی بھوک پر کون فکر مند ہو گا
اس سے ہمدردی کون کرے گا۔ وہ اجنبی ہے۔ سڑک ہے،
حادثے ہیں۔ میرا بیٹا، میرا بیٹا
اے رات، ستارو، راستو اور بادلو! اس ماں کو بتاؤ کہ ہمارے پاس
کوئی جواب نہیں ہے
زخم آنسوؤں سے بڑا ہے۔ افسوس اور تکلیف سے بھی بڑا ہے

تم حقیقت برداشت نہیں کر سکو گی کیونکہ تمہارا بیٹا مر چکا ہے

ماں !

اپنے آنسوؤں کو نہ اکھاڑو

آنسوؤں کی بھی جڑیں ہوتی ہیں

ان آنسوؤں کو ہر شام کے لئے بچا کر رکھو

جب سڑکیں لاشوں سے پٹ جائیں اور تمہارے بیٹے کی طرح

مسافروں کو راستہ نہ ملے

تم اپنے آنسو پونچھ ڈالو

اور اُن پیاروں اور مہاجروں کی یادگار کے طور پر، کچھ آنسو محفوظ کر لو،

جو اس سے پہلے مر چکے ہیں

اپنے آنسو نہ اکھاڑو

ان آنسوؤں کو بچا کر رکھ لو

شاید کل اس کے باپ کے لئے، اس کے بھائی کے لئے، اس کے دوستوں کے لئے ان

کی ضرورت پڑے

ہمارے کل کے لئے بھی کچھ آنسو بچا لو

ہمارے ملک میں وہ میرے دوست کی کہانی سناتے ہیں جو گیا اور پھر کبھی نہ آیا

کس طرح اس نے جان دے دی

کس طرح گولیاں اس کے چہرے اور سینے میں کھب گئیں

مہربانی کر کے وضاحت نہ کرو

میں نے اس کے زخم دیکھے ہیں۔ زخموں کی گہرائی بھی ناپی ہے

مگر میں دوسرے بچوں کا سوچ رہا ہوں

اور اُن عورتوں کا جن کے ہاتھوں میں بچہ گاڑیاں ہیں

پیارے دوستو! یہ نہ پوچھو کہ وہ کب لوٹے گا

صرف یہ پوچھو کہ

لوگ اس کی تلاش میں کب جائیں گے؟

کب اٹھیں گے؟

محمود درویش
ترجمہ :- منو بھائی

سپاہی ــــ جس نے سفید پھولوں کا خواب دیکھا

وہ خواب دیکھتا ہے، سفید پھولوں کے
درخت کی شاخوں کے
شام کے وقت پتے نکالنے والی شاخوں میں
پھیلنے والے زیتون کے درخت کے
اس نے بتایا کہ وہ ایک پرندے کا اور
لیموں کے درخت پر پھولوں کی بہار کا
خواب دیکھتا ہے

اِن سب چیزوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے
اس نے اپنے آپ سے یہ کبھی نہیں پوچھا
وہ صرف ایسی چیزیں جانتا ہے جنہیں وہ سونگھ سکے
وہ صرف ایسی چیزوں کو سمجھتا ہے جنہیں وہ تھام سکے

"گھر" ـــــ اس نے کہا
"اپنی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پینے کا نام ہے
شام کو خیریت سے واپس آنے کا نام ہے"
"اور یہ ملک؟" میں نے پوچھا
"میں اس ملک کو نہیں جانتا" وہ بولا
"یہ مجھے میری جلد کی طرح نہیں ڈھانپتا
نہ ہی میرے خون میں دھڑکتا ہے
جیسے کہ شاعر لوگ کہتے ہیں
میں نے اِسے ایسے ہی دیکھا جیسے کسی گلی،

کسی دکان کسی اخبار کو دیکھا جاتا ہے"

میں نے پوچھا "کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟"
بولا "میری محبت تو کوئی واقعہ ہے
شراب کا گلاس یا تفریحی سفر"
"کیا تم اس کے لئے جان دے سکتے ہو؟"
"نہیں نہیں
اس جگہ کے ساتھ میرا رشتہ، جذبات بھڑکانے والی تقریریں
ایک خیال ایک لیکچر ہے
میں نے خیال کے ساتھ پیار کرنا سیکھا ہے
محبت کرنا سیکھا ہے
مگر کبھی گھاس کو نہیں سونگھا
جڑیں نہیں سونگھیں
شاخیں نہیں سونگھیں"

"تو پھر یہ کس قسم کی ہے تمہاری محبت؟
کیا یہ تمہیں دھوپ کی طرح چبھتی ہے
خواہشوں کی طرح سینکتی ہے"
اُس نے چہرہ میری طرف موڑا اور کہا
"میں بندوق کے ذریعے محبت کرتا ہوں
پرانے کھنڈروں میں جشن کا شور اور اس قدیم بوڑھے بت کی خاموشی
دجو اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ اُس کا مقام، عہد اور بنانے والے کا نام بھی کسی کو یاد نہیں رہا
میری محبت کی صدائے بازگشت ہے"
اور پھر اس نے اپنی روانگی کے لمحات کے بارے میں بتایا
کہ جب وہ اُسے کسی جگہ لے جا رہے تھے اس کی ماں
خاموشی کے آنسوؤں میں کیسے روئی تھی

اور کس طرح اس کی ماں کا دکھ جل کر اس کی جلد کے اندر
ایک ایسی خواہش بن گیا تھا جو اس سے پہلے وہاں نہیں تھی
اور یہ بھی بتایا کہ
وزارتِ جنگ کے صدر دروازے کے اوپر شاید کبوتر بھی رہتے ہیں
اور شاید ان کے بچے بڑے بھی ہوتے ہیں
اُس نے ایک سگرٹ سلگایا اور پھر بتایا کہ
اس شخص کی طرح جو خون کی ندیوں میں اپنا راستہ بناتا ہے
میں سفید پھولوں کے خواب دیکھتا ہوں
زیتون کی شاخوں کے خواب
اس پرندے کے خواب جو
لیموں کے درخت کی شاخ پر سوگ اپنے دل میں اُتار لیتا ہے

"لیکن اِن آنکھوں سے تم نے اس سے پہلے کیا کچھ دیکھا؟"
"وہی کچھ جو میں نے کیا
میں نے سفید پھولوں کو سرخ رنگ میں دیکھا
ان پھولوں کی تباہی کے لئے دھماکے کئے
ریت میں، چھاتیوں میں، شکموں میں"
"تم نے کتنے لوگ قتل کئے؟"
"تم جانتے ہو۔ میں یوں گن کر نہیں بتا سکتا
مگر میں نے ایک تمغہ حاصل کیا تھا"

میں نے اپنے زخم میں دوبارہ چاقو گھمانے کے لئے پوچھا
"ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بتاؤ"
وہ کاغذوں کا پلندہ جھولی میں دبا کر اُٹھ کر بیٹھ گیا
اور یوں گویا ہوا جیسے گانا سنا رہا ہو
"وہ کھلے ہاتھ پاؤں کے ساتھ چٹان پر گرا

اس خیمے کی طرح جو بم کے ٹکڑوں کی زد میں آ کر
ڈھیلا ہوتا ہے اور پھر پھیل کر لیٹ جاتا ہے
اس کی پیشانی بہت کشادہ
اور خون نے اسے تاج پہنا دیا تھا
اس کی چھاتی پر کوئی تمغہ نہیں تھا
وہ کوئی ماہر لڑاکا بھی نہیں تھا
مزدور یا کسان کچھ ایسا ہی ہوگا
وہ کھلے ہاتھ پاؤں کے ساتھ چٹان پر گرا
اس خیمے کی طرح جو بم کے ٹکڑوں کی زد میں آکر
ڈھیلا ہوتا ہے اور پھر پھیل کر لیٹ جاتا ہے
اور وہ مر گیا
اس کے بازو
دو خشک ندیوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے
اور جب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کون تھا
اس کی جیب اُلٹائی
تو مجھے دو تصویریں ملیں
ایک اس کی بیوی کی
اور ایک اس کی چھوٹی بچی کی جو ــــ"
"اور کیا تمہیں افسوس نہیں ــــ"
اس نے میری بات کاٹ "محمود میرے دوست!
افسوس ایک پیلا پرندہ ہے
جو تمہیں محاذِ جنگ پر دکھائی نہیں دے گا
سپاہی کے لئے افسوس جرم ہے
میں لڑائی کے میدان میں ایک انجن تھا
آگ اور تباہی پھیلانے والی مشین
وہاں ایک ہی پرندہ تھا
جو میں نے فضا میں دھوئیں سے بنایا تھا"

اُس کے بعد
اُس کے بعد اُس نے ایک لڑکی کے بارے میں باتیں کیں
اپنی زندگی کی پہلی لڑکی کے بارے میں
اُن گلیوں کے بارے میں جو وہاں سے بہت دور تھیں
ریڈیو اور اخباروں میں بہادری کی کہانیوں کے بارے

میں نے دیکھا کہ وہ
اپنی کھانسی کو رومال میں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے
میں نے پوچھا "پھر کبھی ملاقات ہو سکتی ہے؟"
اس نے کہا "کسی شہر میں جو یہاں سے بہت دور ہو"
اور پھر میں نے اس کا گلاس بھرا ـــــ چوتھا گلاس
اور از راہِ مذاق پوچھا
تم جا تو نہیں رہے؟ وطن کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
"مجھے تنہا چھوڑ دو" اس نے کہا
میں سفید پھولوں کے خواب دیکھ رہا ہوں
گاتی ہوئی گلیوں کے خواب
اس گھر کے جس میں روشنی ہی روشنی ہے
مجھے ایک بہت اچھا دل چاہیئے
وہ بھاری دل نہیں جو رائفل کے سینے میں ہوتا ہے
میں دھوپ سے بھرا ہوا دن چاہتا ہوں
ظالموں کی فتح کے نشہ میں مدہوشی نہیں
مجھے سورج کی پہلی کرن پر ہنستا ہوا بچہ چاہیئے
جنگی ہتھیاروں کی مہارت نہیں
میں تو یہاں ان سورجوں اور ستاروں کی روشنی محسوس
کرنے آیا تھا جو ابھرتے ہیں تو پھر ڈوبتے نہیں
میں مرنے سے انکار کرتا ہوں ـــــ
سرمایہ داروں اور ظالموں کے انگور کے باغوں

تیل کمپنیوں کے کنوؤں اور ہتھیاروں کے کارخانوں کی حفاظت کے لئے
بے گناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو ہلاک کرنے سے انکار کرتا ہوں"

اور پھر
اور پھر اس نے مجھے خدا حافظ کہا کیونکہ
وہ سفید پھولوں کی تلاش میں تھا
ایسا پرندہ ڈھونڈ رہا تھا جو
زیتون کی شاخ پر بیٹھ کر سوگ اپنے دل میں اتار لیتا ہے
کیونکہ وہ ان چیزوں کو ہی جانتا تھا۔ جنہیں وہ سونگھ یا چھو سکے
اس نے مجھے بتایا کہ وہ جانتا ہے کہ
گھر، ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پینے کا نام ہے
شام کو بخیریت لوٹنے کا نام ہے
اور وہ سفید پھولوں کے خواب دیکھتا تھا
زیتون کے درخت کے خواب جو شام کو پتے نکالنے والی
شاخوں میں سینہ پھیلاتا ہے
اس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے ایک پرندے کا خواب دیکھا ہے
لیموں کے درخت پر مسکرانے والی بہار کا خواب
ان چیزوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے
اس نے اپنے آپ سے یہ کبھی نہیں پوچھا تھا
وہ صرف اُن چیزوں کو سمجھ سکتا تھا جنہیں وہ تھام سکے
"گھر" اس نے کہا تھا "ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پینے کا نام ہے
شام کو خیریت سے واپس آنے کا نام ہے

"اور یہ ملک؟" میں نے پوچھا تھا
"میں اس ملک کو نہیں جانتا" اس نے بتایا تھا
"یہ مجھے میری جلد کی طرح نہیں ڈھانپتا"

محمود درویش

ترجمہ: شوکت عابد

تفتیش

لکھو ــــ
میں ایک عرب ہوں
کارڈ نمبر ۵۰۰۰
اس راستے پر نواں سپاہی
تمہیں غصہ آرہا ہے؟

لکھو ــــ
میں ایک عرب ہوں
میرا کام؟
پتھر اور چٹانیں کاٹنا
روٹی کے لئے
کتابوں کے لئے
اپنے بچوں کے لئے
نہ میں خیرات مانگتا ہوں
نہ تمہاری حکمرانی سے ڈرتا ہوں

لکھو ــــ
میں ایک عرب ہوں
ایک نام جس کا کوئی لقب نہیں
اپنے سرمست عالم میں ثابت قدم
مری جڑیں بہت گہری ہیں
ان زمانوں سے آگے

اس وقت سے بھی آگے

میں زمین کا بیٹا ہوں
ایک حقیر ذخیرے کا کسان
میں ایک جھونپڑی میں رہتا ہوں
بانسری کی لے کے ساتھ
مرے بال؟
ابھی سیاہ ہیں
اور آنکھیں بھوری

مرے سر کا لباس
دشمن کی آنکھوں کے لئے
ایک دل خراش نظارہ
مری پسندیدہ خوراک؟
تیل اور صعتر

اور لکھو ـــــ
صفحے کے سب سے اوپر
کہ میں کسی سے نفرت نہیں کرتا
لیکن اگر فاقہ زدگی اسی طرح جاری رہی
ـــــ زیادہ اور زیادہ
تو پھر خبردار رہو
مری بھوک سے
خبردار رہو
مرے قہر سے!

"انسان کی عزیز ترین شے اس کی زندگی
ہے لیکن اسے یہ زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی
ہے۔ اس لئے اُسے یہ زندگی ایک بے مقصد،
بزدلانہ طریقے سے یا اس طرح بسر نہیں کرنا
چاہیئے کہ بعد میں اپنے ماضی پر شرمندگی ہو۔ اس
طرح زندہ رہو کہ مرتے وقت کہہ سکو۔ میری تمام
زندگی اور قوت دنیا میں صرف ایک ہی مقصد
کے لئے وقف رہی اور وہ ہے بنی نوعِ انسان
کی آزادی۔"

(لینن)

افغانستان



”اگر انسان کو پتہ ہو کہ وہ ہر اس قطرۂ خون کا ذمہ دار ہے کہ جو زمین پر گرتا ہے۔ وہ پھر خون ریزی سے گریز کرے گا۔ اگر اُسے پتہ ہو کہ محض جبر، سچ چھپا نہ سکے گا۔ تو وہ طاقت استعمال نہ کرے، اگر اُسے پتہ کہ وہ جو کچھ غصب کرے گا۔ وہ سب کچھ اُسے حرف بحرف اور لمحہ بہ لمحہ واپس بھی کرنا پڑے۔ تو وہ کبھی کچھ غصب نہ کرے۔“

مائیخل نیمی ——— لبنان

حفیظ اللہ امین

خلق پارٹی کے انقلابی نظریات

عوامی جمہوریہ افغانستان کے نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ جناب حفیظ اللہ امین نے عوامی جمہوری پارٹی (خلق) کی چودھویں سالگرہ اور پہلی کانگریس کے سلسلہ میں یکم جنوری ۱۹۷۹ء کو کابل فندری آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والی سنٹرل کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کی جس کا مکمل متن درج ذیل ہے۔

مسلح کامریڈو، بہادر دوستو! پیارے وطن پرستو! اور مہمان ہائے گرامی قدر!

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کی اس عظیم الشان تقریب میں شریک ہوں جو محنت کش طبقے کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تقریب میری قابل فخر پارٹی کی چودھویں سالگرہ منانے کے سلسلہ میں منعقد کی گئی ہے، میں بین الاقوامی انقلابی پرولتاری تحریک میں اس تاریخی دن کے موقع پر افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے بانی جناب نور محمد ترہ کئی کو خلقی مبارک باد پیش کرتا ہوں جو سنٹرل کمیٹی کے سیکرٹری جنرل، انقلابی کونسل کے صدر اور عوامی جمہوریہ افغانستان کے صدر ہیں۔ ہماری پارٹی روز اول سے ہی ان پر فخر کرتی رہی ہے۔ انہوں نے پارٹی کے قیام سے لے کر پہلی کانگریس کے بعد آج تک پارٹی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کی پولٹ بیورو اور سنٹرل کمیٹی کے ارکان مخلص اور بہادر کارکنوں اور دیگر تمام تر محنت کش عوام کی راہنمائی کی ہے افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی دنیا کی پہلی پرولتاری پارٹی ہے جس نے اپنی زندگی کی انتہائی قلیل مدت میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پارٹی کی چودہ سالہ جدوجہد اس عظیم قائد کی تخلیقی قیادت میں جاری رہی اور خلقی تدابیر سے آراستہ سنٹرل کمیٹی کے ارکان نے محنت کشوں کی آئیڈیالوجی اور سائنسی تدابیر کو جو دنیا بھر کے مزدوروں اور عظیم انقلاب اکتوبر کے بعد تمام ترقی پذیر ممالک کے بہادر عوام کے جوش کو مہمیز دیتی ہیں، مالا مال کر دیا ان حقائق کی معروضی اور سائنسی تفصیلات پیش کرنے کی خاطر ہم محنت کش طبقہ کی سائنٹیفک تھیوری کی روشنی میں ان کا الگ الگ جائزہ اپنی اولین فرصت میں پیش کریں گے۔ فی الحال طبقاتی جدوجہد کے فلسفیانہ اصول و نظریات اور افغانستان میں طبقاتی جدوجہد کے چیدہ چیدہ مرحلوں اور خصوصیات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے میں افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے رول اور ثور انقلاب کی فتح کے ضمن میں جناب نور محمد ترہ کئی کے تجزیے کی اثر آفرینی پر کچھ کہنا چاہوں گا۔ میں افغانستان اور بیرونی دنیا کے ماہرین سکالروں اور پولیٹیکل سائنس کے طالب علموں کی توجہ ان مذکورہ بالا امور کی طرف دلاؤں گا تاکہ وہ اسے موضوع بحث بنائیں۔ اس کی قدر و قیمت کو جانچیں اور یوں محنت کش طبقہ کی سائنٹیفک تھیوری کے

ارتقا میں مناسب طور پر شریک ہوں۔ یہاں میں مندرجہ ذیل امور پر بحث کروں گا۔

سیاست
ریاست
پارٹی
انقلاب

سیاست

سیاست طبقاتی جدوجہد کی آئینہ دار ہوتی ہے اور سوسائٹی کو دشمن طبقات میں تقسیم کر کے اسی طرح نمودار ہوتی ہے جس طرح دشمن طبقات پر مبنی سوسائٹی میں مختلف طبقات کے مفادات باہر آجاتے ہیں اور سیاست ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے سیاست مختلف طبقات کے درمیان رابطے کا نام ہے اور اتنی دیر تک اس کا وجود برقرار رہتا جتنی دیر تک طبقات موجود ہوتے ہیں، لیکن مختلف طبقات سے منسلک عناصر کے درمیان تعلقات یا مختلف طبقات کے درمیان باہمی تعلقات کبھی سیاست قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ مثال کے طور پر، ایک کسان اور جاگیردار کے درمیان تعلقات جس کے لئے وہ کام کرنے میں مصروف ہے، قطعی طور پر سیاست نہیں کہلائیں گے کیونکہ یہ استحصالی تعلقات ہیں۔ اسی طرح ایک مزدور کی سرمایہ دار کے ہاں ملازمت جس میں وہ پرولتاری کی محنت سے حاصل ہونے والی پیداوار کو سمیٹنے میں مصروف ہے اور اس کا استحصال کرتا ہے، قطعی طور پر سیاست نہیں کہلائے گی۔ استحصالی تعلقات اقتصادی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ایک طبقاتی سوسائٹی کے پیداواری تعلقات ـــــ اقتصادی تعلقات صرف اسی وقت سیاسی تعلقات میں تبدیل ہوتے ہیں جب ایک کسان یا کسانوں کا ایک گروہ جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ صرف اپنے مالک کے خلاف نہیں بلکہ جاگیرداری کے خلاف ـــ جاگیردارانہ نظام کے خلاف اور تمام جاگیرداری طبقے اور جاگیرشاہی کے خلاف ـــ اسی طرح ایک مزدور یا سرمایہ دار دشمن مزدوروں کے ایک گروہ یا سرمایہ داروں کے ایک گروہ کی تنخواہوں میں اضافے کی جدوجہد سیاست قرار نہیں دی جا سکتی، لیکن سرمایہ داری اور سیاست میں سرمایہ دار طبقے کے غلبہ و تسلط کے خلاف جدوجہد کا نام سیاست ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل دو مختصر مختلف طبقات کے درمیان تعلقات میں سیاسی تشخص کو اجاگر کرنے میں اہم ترین رول ادا کرتے ہیں۔ اوّل کسی طبقے کا بنیادی مفاد پوری طرح سے اور زیادہ گہرائی کے ساتھ صرف سیاست میں ہی واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مزدوروں کے لئے کام کرنے کی صلاحیت زیادہ منافع بخش طور پر فروخت کرنے میں کوئی اہمیت نہیں بلکہ مزدوروں کے لئے بنیادی مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اجرت کے غلامانہ نظام کو تہس نہس کر دیا جائے، جس کا اظہار سیاسی جدوجہد میں ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ہر طبقاتی جدوجہد کا کسی مخصوص طرز پیداوار میں ایک نمایاں پہلو ہوتا ہے جو اپنی ترقی پذیر شکل میں سیاسی جدوجہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے سیاسی

جد وجہد محنت کش عوام کی آزادی کی جد وجہد کی اعلیٰ ترین شکل ہوتی ہے، ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر طبقے کی سیاست اس کے طبقاتی نقطۂ نظریہ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جس میں اس کے بنیادی مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب محنت کش طبقہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے سلسلے میں اس کے داخلی اور خارجی امور کا تعین کرے گا۔ دوم ــــ سیاست عوام کے ذہنوں میں جنم لینے والے طبقات کے درمیان رابطے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر کسانوں کی بغاوتیں اور جنگیں، مظلوم عوام کی قومی آزادی کی تحریکیں اور پرولتاری انقلاب عوام کی ان آرزوؤں کا مظہر ہوتی ہیں کہ سماجی اور قومی جبر و تشدد کا خاتمہ کیا جائے، یہی وجہ ہے سیاست، معیشت کے برعکس سوسائٹی کے بالائی ڈھانچے کا ایک حصہ ہوتی ہے سیاست کسی طبقے یا کسی طبقے کے گروہ، سماجی گروہ۔ ریاست اور سماجی مظاہرات کے شعوری رویے کا نام ہوتی ہے جو بنیادی اور جاری شکل میں پیداواری تعلقات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست نہ صرف اقتصادیات کی آئینہ دار ہوتی ہے بلکہ اس کی فطرت کا بھی مظہر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں دنیا بھر کے محنت کشوں کے قائد نے بجا طور پر کہا تھا کہ سیاست معاشیات کی مرتکز اور مجتمع اظہار ہوتی ہے" لیکن سیاست اقتصادی مسائل سے بڑھ کر زیادہ اشیاء کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک طبقاتی معاشرے میں تمام سماجی تعلقات انقلاب اور اقتدار، جنگ اور امن، عوام اور قومیں، تعلقات۔ نظریاتی ٹکراؤ اور دیگر تمام مظاہر کسی نہ کسی طرح سیاست کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں، من حیثِ مجموعی، سیاست ایک فعال عنصر یا سماجی زندگی کا نام ہوتی ہے۔ طبقات اور مختلف سماجی گروپ مختلف اداروں اور تنظیموں یعنی سیاسی پارٹیوں، پریس، ریڈیو، ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہیں حکمران طبقے کی پالیسی سرِ دست ریاست کے ذریعے نافذ العمل ہوتی ہے اور مخالف طبقات کی مخالفت کی جاتی ہے اور ریاست اور سیاسی پارٹیاں سیاسی جد وجہد کے مرکز میں باہم شیر و شکر ہوتی ہیں چند ایک بورژوا نظریہ ساز انارکسٹ مفکرین اور پیٹی بورژوا انقلابی سیاست کو جبر و تشدد کی حد تک نیچے لے آتے ہیں۔ جو ایک سنگین غلطی ہے۔ غلبے اور تسلط کے لئے بے شمار سیاسی شکلیں اور طریقہ ہائے کار موجود ہیں بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی حکمران طبقہ اپنی آمریت کو برقرار رکھنے کے لئے مکمل طور پر جبر و تشدد سے دستبردار نہیں ہو سکتا لیکن جبر و تشدد ہی واحد شکل نہیں ہے۔ جس کے ذریعے اپنے نصب العین کو حاصل کیا جائے انقلابی طبقات کو نئی سوسائٹی کی تعمیر و تشکیل کے لئے جس قسم کی طاقت و قوت درکار ہوتی ہے وہ رجعت پسند طبقات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی جو ہر نئی شے کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے قوت و طاقت کا تعین اقتصادیات کرتی ہے۔ سیاست اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب اس کے سوتے اقتصادیات و معیشت کے بطن سے پھوٹیں۔ تاریخی اصولوں سے متصادم سیاست ناکامی سے ہمکنار ہو گی۔ آخر طاقت کا استعمال تو ریاست بھی کرتی ہے۔

ریاست

ریاست سوسائٹی کے اندرونی ارتقاء کی پیداوار ہوتی ہے اور مادی پیداوار میں رونما ہونے والی

تبدیلیوں سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ جب ایک قسم کا طرزِ پیداوار دوسرے قسم کے طرزِ پیداوار کی جگہ لیتا ہے تو ریاستی نظام تبدیل ہو جاتا ہے۔ ریاست ہمیشہ کے لئے قائم و دائم نہیں ہے۔ ابتدائی معاشرے میں جہاں ذاتی ملکیت اور طبقات کا وجود نہیں تھا۔ وہاں ریاست کا نام و نشان نہیں تھا۔ ریاست کی تشکیل اور اس کا مزید ارتقا شدید طبقاتی جدوجہد کے ساتھ مربوط ہے۔ غیر طبقاتی معاشرے کی حتمی شکل میں جب طبقات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ طبقاتی سوسائٹی کی پیداوار ریاست خود بخود دم توڑ جائے گی۔ ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں دشمنانہ طبقات موجود ہیں ریاست ایک سیاسی اوزار ہے جیسا کہ دنیا بھر کے مزدوروں کے قائد نے کہا تھا۔ "ریاست ایک طبقے کی دوسرے طبقے کی حاکمیت کا تحفظ کرنے کی ایک مشین کا نام ہے"۔ ریاست مظلوم اور جبر و تشدد کے شکار لوگوں کو کچلنے کے لئے ایک ذریعہ ہے جو ان طبقوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں حاکمیت کا شرف حاصل ہے اور تمام ذرائع پیداوار ان کی ملکیت میں ہیں۔ ریاست جو واضح طور پر طبقاتی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ بالائی ڈھانچے کا بنیادی حصہ ہوتی ہے۔ جس کی جڑیں اقتصادیات میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ بنیادوں کی حمایت اور استحکام کے لئے تمام ذرائع بروئے کار لاتی ہے، ریاست کی موجودگی میں پبلک پاور کا وجود انتہائی معقول بات ہے۔ یہ تمام تر آبادی کے مفادات کی نمائندگی نہیں کرتی لیکن اس طبقے کے مفادات کی نگہبان ہوتی ہے جو اقتصادی لحاظ سے غالب ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار مسلح افواج، آرمی سرانڈوے (پولیس) پر مبنی ہوتا ہے تاکہ یہ عوام کی طاقت (پبلک پاور) کے خلاف مزاحمت کر سکے۔ ریاست استحصال پر مبنی غلامانہ، جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں اندرون ملک اور بیرونِ ملک مخالف طبقات اور ملکوں کے مقابلے میں حکمران طبقے کے مفادات کا تحفظ کرنے کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ اس لئے ہر ریاست کے ذمے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک دو فریضے ہوتے ہیں۔ اندرونِ ملک فریضے ریاست کے فے سب فریضوں سے مقدم ہوتے ہیں۔ جن سے خارجہ پالیسی کے فریضوں کا تعین ہوتا ہے چنانچہ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک کی خارجہ پالیسی دراصل اس ملک کی داخلی پالیسی کی توسیع ہوتی ہے۔ ریاست اپنے طبقات کے مفاد میں ایک دوسرے سے اختلاف بھی کر سکتی ہے۔ جن کی وہ ملازم ہوتی ہے یا جن اقتصادی بنیادوں کے ساتھ وہ منسلک ہوتی ہے۔ آج تک تاریخ میں چار قسم کی ریاستیں ملتی ہیں مثال کے طور پر غلامانہ جاگیرداری، سرمایہ داری اور سوشلسٹ ریاستیں، پہلی تینوں قسم کی ریاستیں جو استحصال کرنے والوں کے مفادات کی نگہبان ہوتی ہیں کے مقابلے میں سوشلسٹ ریاست حقیقی خلق ریاست کی طرح کی ایک نئی ریاست ہوتی ہے۔ پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کی ریاست یا مزدوروں کی ریاست حقیقی معنوں میں ایک ایسی ریاست ہوتی ہے جو سرمایہ داری سے سوشلزم تک کے عبوری دور میں قائم ہوتی ہے۔ پرولتاری ریاست کی خاصیتوں میں سے ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایک سے زائد طرزِ پیداوار معیشت میں کارفرما ہوتے ہیں اور پرولتاری اور بورژوا یا استحصالی اور استحصال زدہ طبقات کے درمیان طبقاتی جنگ شدید ہوتی ہے۔ طبقاتی نظام کی طرف سماجی ارتقا کے بارے میں عظیم لینن نے کہا تھا:-

"پرولتاریہ ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے آگے بڑھتا ہے اور اس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتے

کیونکہ سرمایہ دارانہ استحصال کرنے والوں کی مزاحمت کا خاتمہ کسی اور ذریعے سے کوئی اور لوگ نہیں کر سکتے۔"

پارٹی

یہ بات بھی واضح ہے کہ پرولتاری ڈکٹیٹرشپ مزدور طبقے کی سائنٹفک تھیوری سے لیس ورکرز پارٹی کے بغیر ناممکن ہے۔ پارٹی سوسائٹی کے کسی مخصوص طبقے کا ایک ادارہ، عنصر یا حصہ ہوتی ہے جو تمام طبقے کو متحد کرتی ہے، لیکن یہ صرف اس طبقے کے سب سے زیادہ فعال عناصر کو متحد کرتی ہے جو ان کی طبقاتی جدوجہد میں راہنمائی کرتا ہے اور ان کے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ متعدد پارٹیاں ایک استحصالی طبقے کی ترجمانی کرتی ہیں تاکہ محنت کشوں کو یہ دھوکا دیا جائے کہ ان کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ استحصال پر مبنی سوسائٹی میں محنت کشوں کو دھوکا دینے کی خاطر بعض پارٹیاں یہ دعوے کرتی ہیں کہ وہ مزدوروں کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہیں لیکن درحقیقت وہ بورژوا کی خدمت کرتی ہیں۔ بعض غیر پرولتاری پارٹیاں یقینی طور پر رجعت پسند دشمن پالیسیوں کے تحت کام کر رہی ہیں اور عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن محنت کش طبقے اور دیگر محنت کش عوام کے مفادات کا تحفظ صرف ایک ہی پارٹی کر سکتی ہے جو مزدور طبقے کی اپنی پارٹی ہو اور تاریخ ساز آئیڈیالوجی سے بہرہ ور ہو۔ اس قسم کی پارٹی انتہائی مزدور طبقے کے منظم انتہائی اعلیٰ وارفع حصے پر مشتمل ہوتی ہے جو اس کے اہم ترین مفادات کی علمبردار ہوتی ہے اور سائنٹیفک انقلابی آئیڈیالوجی سے لیس ہوتی ہے، اس قسم کی پارٹی استحصالیوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے مقصد کے لئے محنت کش طبقے کی جدوجہد اور پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے استحکام اور ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے استحصال سے پاک غیر طبقاتی سماج کی تعمیر کے لئے راہنمائی کرتی ہے

انقلاب

انقلاب کسی سوسائٹی کی زندگی میں بنیادی اور غیر مقداری تبدیلی کا نام ہے۔ لینن کہتے ہیں:۔ "ہر انقلاب وسیع تر عوام کی زندگی میں بے پناہ اور فوری تبدیلی لاتا ہے۔ انقلاب کی فتح مندی کے لئے مروجہ معروضی حالات کا مساوی حالات کے باوجود ہونا ضروری ہے،، معروضی حالات کا مطلب بالائی طبقات میں شدید بحران اور مظلوم عوام کے غیر معمولی مطالبات اور ان کی محرومی میں مسلسل اضافہ جیسے حالات ہیں جو عوام کو ایک خودمختار تاریخی اقدام کی طرف آمادہ کرتے ہیں۔ عظیم لینن نے کہا تھا:۔ " ان تمام معروضی حالات کو انقلابی صورتحال کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سماجی انقلاب کے ساتھ ہی کسی معاشرے کی سماجی و اقتصادی ہیئت ترکیبی ایک اور سماجی و اقتصادی ہیئت ترکیبی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کسی معاشرے کی مخصوص سماجی، اقتصادی اور استحصالی ڈھانچے میں تبدیلی لامحالہ طور پر پیداواری صلاحیتوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن ایک سوشلسٹ انقلاب دراصل ایک سماجی اقتصادی اور استحصالی ڈھانچے سے ایک ایسے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے میں تبدیلی

ہوتا ہے جہاں انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا وجود نہ ہو۔ اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ سوشلسٹ انقلاب اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ انقلابی حالات نہ ہوں اور محنت کش طبقہ کی آئیڈیالوجی سے بہرہ ور پرولتاری پارٹی شعوری طور پر جدوجہد نہ کرے۔ اس لئے سوشلسٹ انقلاب اپنے انقلابی راہنما کی زیر قیادت مزدور طبقے کا تاریخی مشن ہوتا ہے۔"

ان مندرجہ بالا سائنٹیفک اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی میں اب ہم افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے تاریخی واقعات ماقبل از انقلاب شواہد کا جائزہ لیں گے اور سائنٹیفک سوشلزم کے اصول وضوابط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کو ممتاز سکالروں کے سامنے مطالعہ وتجزیہ کے لئے پیش کریں گے۔ افغانستان کی تاریخ میں یہ بات مرقوم ہے کہ ہمارے بہادر عوام نے امپیریلزم اور نوآبادیاتی نظام کے ظلم وتشدد کے خلاف قربانیوں سے بھرپور جدوجہد کی ہے جس پر ہمارے بہادر بچے فخر کر سکتے ہیں۔ افغانستان کے عوام نے بہ بہادرانہ جدوجہد چوری چھپے کی ہے اور بعض اوقات کھلے بندوں۔ بعض اوقات منظم حملے کئے ہیں۔ بعض اوقات اِکا دکا خودرو ہڑتالوں کی صورت میں بعض اوقات باقاعدہ شکل میں جدوجہد کی ہے اور بعض اوقات بے قاعدہ طور پر، لیکن قربانی کے جذبے سے سرشار ہمارے عوام کی جدوجہد کسی ایسی پارٹی کی مرہون منت نہیں رہی جو کسی مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتی ہو۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۰ء کے بعد بھی یہ حالت تھی کہ پارٹی کا لفظ ان کی جدوجہد کی تاریخ میں کبھی حقیقی معنوں میں استعمال نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے قائد جناب نور محمد ترہ کئی کا رول سب سے زیادہ تھا۔ اس کا بہترین ثبوت "انگار" نامی جریدہ تھا۔ جس کی اشاعت کا بیڑہ "ویش ظلمیان پارٹی WEESH ZALMAYAN PARTI" نے اٹھایا تھا اور جناب نور محمد ترہ کئی اس میں فعال کردار ادا کرتے تھے اور یونہی سیاست کا حقیقی مفہوم اجاگر ہوا کیونکہ ملک کے اندر حکمران ٹولوں اور حکمران طبقوں کی لیڈر شپ کے خلاف جدوجہد بڑھ رہی تھی اور ہمارے عوام جاگیردار حکمرانوں کے جبر وتشدد سے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر شعوری طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ان ہی دنوں سیاست نے رائے عامہ کو مختلف ملکی طبقات اور معیشت کے درمیان رابطے کے طور پر اپنی طرف متوجہ کیا جس کا سب سے زیادہ کریڈٹ ہمارے محبوب قائد کو جاتا ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے خاتمے اور ساتویں دہائی کے آغاز پر جناب نور محمد ترہ کئی نے افغان سوسائٹی کے مکمل ادراک اور محنت کش طبقہ کی آئیڈیالوجی پر گہرے عبور کے باعث کچھ اس طرح تخلیقی نظریے میں سماجی پہلوؤں کو متعارف کرایا کہ افغانستان میں جاگیرداری شاہی حکومت کر رہی ہے اور پیداواری قوتوں کے اضافے کے مقابلے میں محنت کش طبقے کی تعداد میں کمی کے پیش نظر ان خطوط پر سوچنا شروع کیا کہ محنت کش طبقے کی سائنٹیفک تھیوری کے عمومی اصولوں کا اطلاق ہماری سوسائٹی کے مخصوص حالات پر مناسب غور وفکر کے بعد کیا جائے۔ اس وقت جب کہ سرمایہ داری سے سوشلزم تک کے راستے میں محنت کش طبقے کا کردار موضوع بحث نہیں ہو سکتا تھا۔ کامریڈ نور محمد ترہ کئی مزدوروں کی پارٹی "پیپلز ڈیموکریٹ پارٹی آف افغانستان" کی بنیاد رکھی اور حقیقی معنوں میں سیاست کو پروان چڑھایا جس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے مختلف طبقات کے مفادات کا ٹکراؤ منظر عام پر آیا۔ اگر ہم حقیقت پسندانہ نقطۂ نگاہ سے سوچیں تو نور محمد ترہ کئی کا ادراک

دنیا بھر کے ان عوام کے لئے جذبۂ محرکہ کی حیثیت رکھتا ہے جہاں غالباً افغانستان سے ملتے جلتے حالات ہیں کیونکہ نور محمد ترہ کئی نے جان لیا تھا کہ جاگیردارانہ ماحول میں استحصالی حکومت کے خلاف جدوجہد ملک کی ورکرز پارٹی کے باعث ممکن ہے انہوں نے بادشاہت کے دوران جابرانہ حالات کے خلاف کچھ اس طرح ردِ عمل اختیار کیا کہ انہوں نے محنت کش طبقے کی نئی طرح کی پارٹی کی پہلی کانگرس کے انعقاد کو ممکن بنا دیا۔ چنانچہ افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کی پہلی کانگرس ان کی اپنی رہائش گاہ کرتہ چار پر جدی دوم ۱۳۴۳ بمطابق یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو منعقد ہوئی۔ اس کانگرس میں کامریڈ نور محمد ترہ کئی کو متفقہ طور پر سنٹرل کمیٹی کا رکن چن لیا گیا اور سنٹرل کمیٹی کے پہلے اعلیٰ اختیاراتی اجلاس میں افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا سیکرٹری جنرل چن لیا گیا۔ انہوں نے افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے تمام ارکان کو آج تک اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے متحرک رکھنا ہے۔

ہمارے اسی کامریڈ نے افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے نام کا تعین کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا جو پرولتاری نوعیت کی پارٹی ہے کانگرس کی میٹنگ کے بعد نور محمد ترہ کئی نے مندرجہ ذیل تین نکات پر بار بار زور دیا۔

طبقاتی جدوجہد میں مزید شدت پیدا کرنا، محنت کش طبقے کی سائنٹیفک تھیوری کو مزید استعمال کرنا۔ اور محنت کش طبقے کی سائنٹیفک تھیوری کے فلسفیانہ حصے کو مقبول بنانے پر زور دینا، ہماری پارٹی کے کامیاب تجربات نے ہمارے راہنما کی طرف سے مندرجہ بالا تینوں نکات پر زور دینے کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ اصول افغانستان سے ملتے جلتے تمام ممالک کے حالات پر قابل اطلاق ہیں۔ ہماری پارٹی کی جدوجہد کے دوران ہم سب، عوام کے رویے اور ہماری سوسائٹی کی تعمیر و تشکیل کا مطالبہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

نور محمد ترہ کئی ہمیشہ تمام مسائل کے میزانوں اور معیاروں کو پرکھا کرتے۔ وہ جب تک قائل نہ ہو جاتے کوئی حکم صادر نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں انہوں نے نادر خاندان ظالم بادشاہت کی سماجی نوعیت اور طبقے کی تشخیص پر بہت زیادہ توجہ دی اور اس کی فطرت کی پہچان کرنے پر مکمل طور پر عبور حاصل کیا۔ انہوں نے ریاست کے تمام کلاسیک تجزیوں پر غور و فکر کیا۔ انہوں نے خصوصی طور پر ریاستی قیادت کے امپیریلزم اور رجعت پسندی کے ساتھ رشتے پر توجہ دی۔

چونکہ وہ پورے افغانستان میں طبقاتی جدوجہد کو تیز کرنے پر پوری توجہ دے رہے تھے اس لئے انہوں نے پارٹی کے اندر طبقاتی نوعیت اور سماجی تعلقات کے اظہار پر نظر رکھی اور انہوں نے پارٹی کے لئے ایسے حالات پیدا نہ کئے کہ وہ حکمران ٹولوں کی مذمت کر سکے۔ اگرچہ ظالم ریاست نے ملک کی پرولتاری تحریک کی قیادت درباریوں کے چہیتے لوگوں کے ہاتھوں میں دینے کی ناکام کوشش کی، لیکن نور محمد ترہ کئی نے عوام پر مکمل اعتماد کیا اور محنت کشوں کے فرزندوں کی بے پناہ صلاحیتوں کے باعث جاگیر شاہی ریاست کی قیادت کو یہ موقع بہم نہ پہنچا کہ اس سلسلے میں ان کی کوششیں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حقیقی کامریڈوں کے ذہن میں ہمیشہ طبقاتی نظریات سموتے رہے اور

قابلِ فخر درکروں کے ذریعے طبقاتی جدوجہد کو مزید تیز کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے عظیم کامریڈ نے انقلابی طبقاتی جدوجہد میں پارٹی کے ہراول کی قدر وقیمت اور اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا۔ انہوں نے پارٹی کے ہراول کو عوام الناس کی خود رو تحریک تک محدود نہ کیا۔ انہیں یقین تھا کہ پارٹی کی مخصوص طبقاتی جدوجہد کی مدد سے افغانستان کے محنت کش عوام کی حمایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ ملک میں خود رو تحریک جنم لے رہی ہے۔ اس لئے اگر پارٹی قیادت کرنے کے لئے ارتقائی حالات کا انتظار کرتی رہی، تو انقلاب پیچھے چلا جائیگا وہ اکثر یہ تجویز کیا کرتے تھے کہ جب بھی کسی محنت کش کے ہاں بچے پیدا ہوں تو اس کے کانوں میں طبقاتی جدوجہد کی مدھم آواز سنائی جانی چاہیئے۔ ہمارے ممتاز کامریڈ نے قابلِ فخر پارٹی کی جدوجہد کے آغاز سے پارٹی کی قیادت کرتے ہوئے محنت کش طبقے کی پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کے لئے جدوجہد پر زور دیا۔ ہماری سوسائٹی کے موجودہ حالات پر مناسب توجہ دیتے ہوئے وہ جمہوری تحریک کی قیادت غیر پرولتاری طبقات یا حصوں کے ہاتھوں میں دے دینے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس کے برعکس انہیں محنت کش طبقہ کی لیڈر شپ میں دلچسپی تھی، جس کی نمائندگی افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کرتی تھی۔

وہ محنت کش طبقے کی پارٹی پر اعتماد پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے۔ میں آپ تمام کامریڈوں اور مجاہد دوستوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلاتا ہوں کہ محنت کش طبقے کی تمام تر جدوجہد میں مزدوروں کی پارٹی عوام کی انقلابی تحریک کی راہنمائی کرتی ہے۔ لیکن ہمارے عظیم انقلابی کامریڈ انقلابی اصولوں کی روشنی میں عوام کی خود رو تحریک کے اس ارتقائی مرحلے تک انتظار کرنے میں یقین نہیں رکھتے تھے کہ اس وقت پارٹی آگے بڑھ کر قیادت کرے، اس کے برعکس انہیں پختہ یقین تھا کہ پارٹی کو عوام کی عملی اور فعال حمایت حاصل کرنی چاہیئے۔ جب پارٹی انقلاب کا آغاز کرے تو عوام بھی اس پر اعتماد کریں گے اور اس صورت میں یہ انقلاب برپا کرے گی تو عوام اس کی حمایت اور دفاع میں حصہ لیں گے۔ ہمارے عظیم قائد کا یہ نظریہ ثور انقلاب میں بھی صحیح ثابت ہوا اور اس جدلیاتی اصول پہ چلنے سے دیگر تمام ملکوں کے عوام کی فتح کے لئے بھی ایک واضح ثبوت مل سکتا ہے۔ جہاں افغانستان سے ملتے جلتے حالات ہوں۔ امپریلزم اور رجعت پسندوں نے خلقی تحریک کو کچھ اس انداز سے مسموم کرنے کی کوششیں کیں کہ ایک طویل عرصے تک انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال سے پاک حکومت کا راستہ ناممکن بنا دیا جائے۔ لیکن پارٹی کے انقلابی نقطۂ نظر کی قوت نے جسے عوام کی بے پناہ حمایت حاصل تھی۔ اس اصول کو عملی جامہ پہنا دیا کہ پارٹی انقلاب کی کامیابی کے لئے وسیع تر عوام کی حمایت حاصل کر سکتی ہے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس نمونے کو اپنایا جائے گا۔ کیونکہ افغانستان جیسے حالات رکھنے والے ممالک میں اس کی صداقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ افغانستان کے عوام کی سماجی زندگی میں ہمارے رفقاء نے اقتدار کا بنیادی نکتہ پہچان لیا تھا۔ جو ایک جابر ریاست کا تختہ الٹ سکتا تھا۔ قبل ازیں تمام ممالک میں محنت کش طبقے کی انقلابی قوتیں پرولتاریہ ہوا کرتے تھے اور آج بھی یہی حالات ہیں۔ پرولتاری انقلابی جدوجہد کو اس طرح ہاتھ میں لیا جاتا تھا تاکہ پرولتاریہ کی توسیع کے لئے حالات سازگار بنائے جائیں۔ اس عمل کو اس انداز کے ساتھ آگے بڑھایا جاسکتا ہے کہ پرولتاری طبقاتی شعور کے ذریعے پرولتاری انقلاب کی فتح حاصل کی جائے۔ ریاست کا تختہ الٹا جائے اور

مسلح افواج کو ملیا میٹ کر کے از سرِ نو تعمیر کی جائے ۔۔۔ لیکن ہم نے یہ جان لیا تھا کہ افغانستان کی ترقی پذیر سوسائٹی میں پرولتاری انقلاب فوج کو محنت کش طبقے کی سائنٹیفک آئیڈیالوجی کے ذریعے ذہنی طور پر تیار کر کے اور محنت کش طبقہ کے ساتھ اس کی نئی طرح کی تنظیم کر کے بپا کیا جا سکتا ہے جس میں فوج جابر و ظالم ریاست کا تختہ الٹنے کا بنیادی رول ادا کرے اور پرولتاریہ اس کی امداد کریں۔

فوج کو شکست نہیں دینی چاہیئے۔ لیکن اس کو خلقی اور انقلابی بنانا چاہیئے ۔۔ ہم نے یہی کیا اور اسی طرح پارٹی کی راہنمائی کی، جس کی کہ ہمیں عظیم ثور انقلاب میں فتح ہوئی۔ ہم نے افغانستان سے ملتے جلتے حالات رکھنے والے معاشروں میں انقلابات بپا کرنے کے مروجہ حالات پر خصوصی توجہ دی، انہیں یہ معلوم ہوا کہ پرولتاری تحریک کو جلد از جلد طاقتور بنانے کے لئے سب سے زیادہ بنیادی عناصر میں ایک یہ تھا کہ پارٹی سیاسی اور سماجی معاملات میں ایمان داری سے کام لیتی تھی اور لیڈر شپ کے ارکان کی پاک بازی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔

ہمارے ممتاز رفقا ء کو افغانستان میں موجودہ سماجی حالات کا بھرپور ادراک تھا اور انہیں یقین تھا کہ ترقی پذیر ممالک کے مروجہ حالات میں عوام کا عدم اطمینان ان کے ناقابلِ چیلنج رویے میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ محنت کش طبقے کی نئی طرز کی پارٹی عوام کی جمہوری اقدار اور مثبت روایات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے عوام کی مکمل حمایت کر سکتی ہے۔ ہماری پارٹی نے مکمل طور پر یہ جان لیا تھا کہ افغانستان کی طرح ترقی پذیر ممالک میں جو ابھی تک سرمایہ دارانہ نظام کے امپیریلسٹ مرحلے میں داخل نہیں ہوئے۔ پرولتاری حکومت کے قیام کیلئے حالات خصوصی کردار کے حامل ہیں، بالخصوص اس حقیقت کو تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ ایک پرولتاری ریاست جو ایک جاگیردارانہ سوسائٹی میں نئی طرح کی مزدور پارٹی کے ذریعے قائم کی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی ریاست ہوتی ہے جو جاگیرداری سے سوشلزم کی طرف جانے کا عبوری درجہ رکھتی ہے نہ کہ سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف ۔۔۔ یوں مذکورہ سوسائٹی بیک وقت تاریخ کے دو مرحلوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے اور ہماری خلقی ریاست اس طرح پرولتاری حکومت کی بہترین اور اولین مثال ہے۔ کامریڈ نور محمد ترہ کئی کا ایک اور تخلیقی پہلو یہ تھا کہ وہ پارٹی کے مجاہد ارکان کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے اور ان کے کام کی رفتار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے بارے میں اچھا رویہ رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی تخریبی رویہ اختیار نہ کیا اور ہمیشہ تعمیری سرگرمیوں کے امکان کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ وہ ہمیشہ انقلابی سرگرمیوں پر پوری توجہ دیتے تھے اور نوجوانوں کی تربیت پر زور دیتے تھے۔ وہ ہر آدمی کی طبقاتی فطرت پر گہری نظر رکھتے تھے اور افغانستان جیسے ممالک میں ان کے سماجی تعلقات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ پارٹی کی کارروائیوں میں نظریہ پرست نہیں تھے۔ وہ پارٹی کی سرگرمیوں کا راستہ موجودہ حالات کی روشنی میں متعین کیا کرتے تھے۔ یوں پارٹی ثور انقلاب میں فتح مند ہوئی اسلئے آج ہماری پارٹی کو اپنے عظیم قائد کی لیڈر شپ کا اعزاز حاصل ہے۔

کامریڈ نور محمد ترہ کئی ہمیشہ جدوجہد کی مختلف شکلوں کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے پارٹی میں کبھی اطاعت پسندی کے روز افزوں رویے کے امکان کا راستہ کھلا نہ چھوڑا۔ وہ ہمیشہ پارٹی میں انتہا پسندی کی ہر شکل

کو کنٹرول کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مسائل کو جدلیاتی انداز میں دیکھا کرتے تھے۔ وہ انقلاب برپا کرنے کے لئے گوریلا طرزِ جنگ کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ بات افغانستان جیسے حالات رکھنے والے ممالک میں نئی طرز کی پارٹی کے نظریوں کے خلاف تھی۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سیاہ فام رجعت پسندوں کی امپریلزم کے ساتھ استحکام کی تاریخی مثال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گوریلا طرزِ جنگ میں (پولیٹیکل پاور) سیاسی قوت کہیں راستے میں ہی ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ صرف پُر امن جدوجہد میں ہی یقین رکھتے تھے۔ لیکن وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پارٹی کو اس انداز میں تیار ہو جانا چاہیئے کہ انقلاب دن دہاڑے برپا ہو اور فتح حاصل کرے۔ سیاسی اقتدار براہ راست طور پر پرولتاریہ کی نمائندہ افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے ہاتھوں میں منتقل ہو جو ملک میں مزدوروں کا ہراول دستہ ہے چنانچہ ثور انقلاب کے درمیان یہی واقعہ رونما ہوا۔

درباریوں اور امراء و شہر فاہ کے چہیتے لوگوں نے پارٹی کے اندر نور محمد ترکئی کی اس پالیسی کی مخالفت کی، بادشاہت کی مکمل حمایت کے بل بوتے پر وہ پارٹی سے الگ ہو گئے اور ہمارے عظیم قائد اور قابلِ فخر پارٹی کے خلاف سخت جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن چونکہ ان کا تجزیہ افغانستان جیسے حالات رکھنے والے ممالک کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ اسلئے نادر اور داؤد کے درباریوں کے بیٹوں کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ بادشاہت اور سامراجیت نے متحد ہو کر کئی ایک بار عوامی جمہوری پارٹی کو کمزور بنانے کی خاطر اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ معروف ترین عناصر کو ہمارے عظیم قائد کی طرف سے الگ کر دے تاہم ہر موقع پر جب کبھی ایسے لوگوں نے ہماری پارٹی چھوڑنے کا ارادہ کیا، تو افغانستان کے عوام میں ہمارے قائد کی مقبولیت اور بڑھ گئی اور اس کی صفوں میں توسیع ہوئی۔ ہمارے عظیم قائد نے اپنی سوسائٹی کے مکمل شعور سے بہرہ ور ہونے کے باعث تمام ارکان پارٹی اور تنظیموں کو ہر مرحلے پر کامیاب رہنمائی بہم پہنچائی۔ کئی ایک موقعوں پر انہوں نے ظاہر داؤد حکومتوں کے نشانوں سے پارٹی کو دشمنوں کی خواہشات کے برعکس بچایا اور ایک موقع ایسا آیا کہ ہماری پارٹی کا رول مسلح افواج میں اتنا مضبوط ہو گیا کہ وہ داؤد حکومت کا خاتمہ کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ ہمارے محبوب قائد ملک کے مزدور طبقے کی ہراول دستہ عوامی جمہوری پارٹی کے مستحکم ڈسپلن میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور جمہوری مرکزیت کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ ہمارے قابلِ احترام کامریڈ بذاتِ خود عوام میں مقبولیت اور کشش کا باعث بھی تھے اور پارٹی کے ارکان کے درمیان استحکام کی علامت تھے، جیسا کہ مایاکوسکی نے وی آئی لینن کے بارے میں کہا تھا، لینن اور پارٹی جسم اور روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا روح اور جسم کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم پارٹی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم لینن کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ جب ہم لینن کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم پارٹی کے بارے میں بات کرتے ہیں، یہ تعریفی جملہ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی انتہائی مرکزیت کو ثابت کرتی ہے جو اپنے عظیم قائد کی ذات میں مجتمع نظر آتی ہے۔ جس کے طاقتور ڈسپلن کے باعث انقلابِ اکتوبر کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اپنے ثمرات کا دفاع کیا۔ ہم بھی اپنے عظیم قائد کے سچے مقلد ہونے کی حیثیت سے ہمارے عظیم ثور انقلاب کی فتح اور اس کے ثمرات کا دفاع کرنے میں ہمیشہ متحد رہیں گے اور اپنے قابل احترام قائد کے گرد جمع رہیں گے اور پارٹی ڈسپلن

کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں :-

"پارٹی اور ترہ کئی جسم اور روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا جسم کو روح سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ جب ہم پارٹی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم ترہ کئی کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ جب ہم ترہ کئی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم پارٹی کے بارے میں بات کرتے ہیں ——————"

یہ کہ ایک دنیا بھر کے پرولتاریہ کا عظیم قائد ہے اور یہ افغانستان کے محنت کش عوام کا عظیم قائد ہے۔ دونوں قائدین نے دو عظیم پرولتاری انقلابات کی راہنمائی کی جو انسانیت کی تاریخ میں پہلے پرولتاری انقلاب تھے اور اپنی فتح کے بعد سیاسی اقتدار مزدوروں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا۔ ایک کا نام عظیم سوشلسٹ اکتوبر انقلاب تھا اور دوسرے کا نام عظیم خلقی ثور انقلاب تھا۔ عظیم اکتوبر انقلاب نے دنیا بھر میں ہلچل مچا دی لیکن عظیم ثور انقلاب نے ایشیا کے اس خطے میں ہنگامہ بپا کر دیا ہے، اکتوبر انقلاب کے بعد دنیا کی چودہ سامراجی اور رجعت پسند حکومتوں نے مل کر اکتوبر انقلاب کی سرزمین پر اپنی فوجیں اتار دی تھیں۔ لیکن آج بھی بڑی سامراجی طاقتیں، دائیں اور بائیں بازو کے انتہا پسندوں نے متحد ہو کر ثور انقلاب کے خلاف سازشیں شروع کر دی ہیں انہوں نے سوویت یونین میں انقلابِ اکتوبر کے خلاف مسلح مداخلت کی تھی، کیونکہ سوویت یونین کا اس وقت اپنی طرح کا کوئی دوست نہیں تھا اور اس کے ہمسائے میں کوئی سوشلسٹ حکومت نہیں تھی۔ لیکن آج

ثور ثور انقلاب کی سرزمین پر کسی جارح کی طرف سے اس قسم کی فوجی مداخلت ناممکن ہے۔ کیونکہ گذشتہ ساٹھ برس سے سوویتوں کے بڑے ملک سے اس کی دوستی قائم ہے اور اسے پرولتاری حکومتوں، تمام تر دنیا کے مزدوروں اور محنت کشوں کی حمایت حاصل ہے۔

عظیم اکتوبر انقلاب کو دنیا بھر کے مزدوروں کی حمایت حاصل ہے اور یہ بین الاقوامی پرولتاریہ اور عالمی محنت کش تحریک کے لئے کامیاب ترین جذبۂ محرکہ ہے۔ اس خطے کے محنت کش ثور انقلاب کو سرحدوں کے امتیاز کے بغیر حمایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے ممالک کے سماجی و اقتصادی نظام کو مدِنظر رکھتے ہوئے اور فتح یاب ثور انقلاب کے اصولوں کو درست سمجھتے ہوئے اور طبقاتی اخوت و بھائی چارے کے احساس سے سرشار ہو کر اس کا دفاع کرتے ہیں۔

سوشلسٹ ملک کے عظیم لیڈر نے جہاں اکتوبر انقلاب رونما ہوا تھا، پہلی دفعہ امن کا اعلان کیا اور داخلی و خارجی پالیسی کے درمیان منطقی رابطے کو اجاگر کیا۔ ثور انقلاب کے عظیم قائد نے بھی افغانستان اور سوویت یونین کے درمیان دوستی اور ہمسائیگی کے معاہدے پر دستخط کر کے سو سے زائد غیر ملکی سفارتی نمائندوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ آج ہم نے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کئے ہیں جس کا مقصد کسی اور ملک پر جارحیت کا مرتکب ہونا ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس کا واحد مقصد عالمی امن کا دفاع کرنا ہے۔ صرف امن کے دشمن ہی اس پر آنسو بہا رہے ہیں۔ یوں عوامی جمہوریہ افغانستان کی خارجہ پالیسی اس کی اندرون ملک داخلی پالیسی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی جارحیت یا مداخلت کی بھرپور مخالفت کرتی ہے۔ سوویت یونین کے ساتھ ہماری گہری دوستی اور ہمسائیگی ہے جو باہمی خودمختاری و آزادی

کے احترام اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کے اصولوں پر مبنی ہے اور ہمارا باہمی اعتماد ساٹھ برس کی رفاقت کا نتیجہ ہے۔ افغانستان کے محنت کش عوام بھارت کے عوام کے ساتھ مدت مدید سے دوستانہ وابستگی رکھتے ہیں اور ان کی ترقی کے لئے مخلصانہ تمنائیں رکھتے ہیں۔ ہم اس بات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ صرف پختونوں اور بلوچوں کے قومی مسئلے پر سیاسی اختلاف کو دوستانہ اور آبرومندانہ بات چیت کے ذریعے دونوں ممالک کے برادر عوام کے مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مثبت نتیجے کے ساتھ حل کیا جائے تاکہ علاقائی اور عالمی امن کو فائدہ پہنچے، ہمارے بہادر اور محنت کش ایرانی بھائیوں نے افغانستان کے تمام تر محنت کش عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے اور ہمیں بین الاقوامی سامراج اور رجعت پسندوں کی ایران کے محنت کش عوام کے اندرونی معاملات میں مداخلت پر گہری تشویش ہے۔ ہم ان نبرد آزما عوام کے اتحاد و استحکام اور فتح و کامرانی کے متمنی ہیں۔ کامیاب ثور انقلاب اور ہماری خلقی ریاست خود بخود اس خطے اور دنیا بھر کے مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کی حمایت وتعاون سے فیض یاب ہو رہے ہیں

ہم ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی تاریخی جدوجہد کو فراموش نہیں کر سکتے لیکن ہمارے خطے کی جدوجہد آزادی کو اور بھی تیز کرنے کا سبب سے زیادہ اعزاز خود ان کے لئے بھی باعثِ افتخار ہے۔ عظیم ثور انقلاب ان کے لئے ایک بہترین مثال ہے اور ان کے ساتھ ہم طبقاتی جذبات اور اخوت کا احساس رکھتے ہیں۔ اس خطے کے محنت کش عوام کے حکمرانوں اور استحصالی لوگوں کو یہ بات جاننی چاہیئے کہ ثور انقلاب کی فتح و کامرانی ہمارے لئے اور اس خطے کے محنت کش عوام کی مضبوطی خود ان کے لئے باعث صد افتخار ہے جس پر ہم بھی نازاں ہیں۔ یہ سب حقائق تمام تر عوام دشمنوں کے لئے گہری تشویش کا سبب ہیں۔ چاہے وہ نام نہاد مسلمان ہوں یا شرفاء کے فرزند ہوں۔ جرنیلوں اور درباریوں کے نورِ چشم ہوں، سامراج کے نوکر ہوں یا خواہشوں کے اسیر، بائیں بازو کے انتہا پسند ہوں ناعاقبت اندیش نیشنلسٹ ہوں یا فاشزم کی طرف مائل شاونسٹ ہوں۔ یہ تمام امپیریلیزم اور رجعت پسندی کے زیر سایہ بیٹھ کر ہماری خلقی ریاست کے خلاف پُرفریب پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ وہ متحد ہو کر یک طرفہ پروپیگنڈہ کرنے اور جھوٹے الزام لگانے میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ پھر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہماری خلقی ریاست افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کے مینی فیسٹو اور ثور انقلاب کے اعلیٰ مقاصد کے مطابق عوام کی خدمت کر رہی ہے اور اسے ان کی مکمل حمایت حاصل ہے اگر ہمارے دشمنوں میں حب الوطنی کا ذرا سا بھی شائبہ ہے یا پھر ان میں انسانی ضمیر کی کوئی معمولی سی رمق بھی ہے تو انہیں تنقید کرنی چاہیئے اور ہمارے کردار میں خامیوں کی نشاندہی کرنی چاہیئے چاہے وہ ہمارے اقوال پر ہوں یا ہمارے منصوبوں پر۔ اگر ان میں انسانی یا اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ کبھی عوام کو جعلسازی کے ذریعے ہمارے خلاف جدوجہد کی حکمت عملی کا منصوبہ تیار نہ کرتے، وہ عوام کے سامنے جھوٹ ہرگز نہ بولتے اور ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہراتے۔ ہم افغانستان میں موجود تمام عزیزوں، ثور انقلاب اور خلقی ریاست ریاست کے تمام دوستوں اور دشمنوں کو یہ اعلانیہ چیلنج پیش کرتے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر ہمارے اقوال و اعمال میں نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کریں۔ ہم عوام کی آگہی پر اعتماد کرتے ہیں، نہ کہ انہیں بے وقوف بنانے اور گمراہ کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ

ہمارے عوام اپنی منزل مقصود سے زیادہ آگاہ ہوں گے اور اپنے نصب العین کی طرف واضح اور درست رول جاری رکھیں گے۔ یہ صرف نام نہاد مسلمان ہی ہیں جو پاک اسلامی مذہب پر بھی ایمان نہیں رکھتے حالانکہ وہ اس کے دعویدار ہیں۔ وہ اس کے اعلیٰ و ارفع مقاصد کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے محنت کش عوام کے دشمنوں کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ہمارے عوام آجکل اپنے ملک، ماحول، زمین اور آسمان کے مالک ہیں۔ الغرض جو کچھ ہمارے افغانستان میں موجود ہے وہ ہمارے محنت کش عوام کا اپنا ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں:۔

افغانستان کے بہادر عوام زندہ باد!

افغانستان کے عظیم قائد زندہ باد!

افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی کی فتح ہو۔

دنیا بھر میں امن، جمہوریت اور سماجی ترقی کی فتح ہو۔

عبداللہ ملک

افغان انقلاب کی حقیقت

"علما" کے احتجاج کا تاریخی پس منظر

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت

افغانستان کے انقلاب کو ایک سال مکمل ہو رہا ہے۔ اس ایک سال میں افغانستان کے انقلاب کے خلاف مغربی دنیا کے ذرائع ابلاغ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن نے جی کھول کر پراپیگنڈہ کیا ہے اور یہ مہم ہنوز جاری ہے۔ اس پراپیگنڈہ مہم کا منبع پاکستان ہے اور اب چند ماہ سے افغانستان کے اندر نور محمد ترکی کی حکومت کے خلاف گوریلا سرگرمیوں کا بھی بڑے زور شور سے چرچا ہونے لگا ہے اور اس پراپیگنڈہ کی پوری تان اس امر پر ٹوٹ رہی ہے کہ نور محمد ترکی کی حکومت مسلمانوں کے مذہب کو ملیا میٹ کر رہی ہے، اس کے تمام اقدام اسلام کے منافی ہیں اور وہ علما اور مشائخ پر ظلم و تشدد روا رکھے ہوئے ہے۔ اس مہم میں پیش پیش "نوائے وقت" جماعت اسلامی اور مفتی محمود ہیں۔ اور افغانستان کی ایک مبینہ جماعت "حزب اسلامی" اور اس قسم کی دیگر جماعتوں نے بھی پاکستان کے مختلف شہروں میں پریس کانفرنسیں کر کے کھلم کھلا طور پر افغانستان میں موجودہ انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے عالم اسلام سے امداد کی اپیل کی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی ایک علاقوں میں حزب اسلامی کے گوریلوں نے سرکاری فوجوں کو پسپا کر کے کچھ علاقے آزاد کرا لئے ہیں۔ افغانستان کی موجودہ حکومت کے خلاف ایک الزام یہ بھی ہے کہ یہ ماسکو کی کٹھ پتلی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس پراپیگنڈہ میں ایک طرف اگر نوائے وقت، مفتی محمود اور جماعت اسلامی شامل ہیں تو اسی صف میں پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی بھی کھڑی ہے۔ جس نے جنوری ۹، ۷ کو ایک قرارداد کے ذریعے افغانستان اور سوویت روس کے معاہدے کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

صحیح صورت حال کا تجزیہ کرنے کے لئے سب سے پہلے افغانستان اور سوویت یونین کی دوستی، مذہب مخالف اقدام اور علما اور مشائخ کے خلاف جبر و تشدد کرنے کے الزامات پر ذرا نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ تمام الزامات ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔

افغانستان چکی دو پاٹوں میں

افغانستان کی تاریخ جدید کا ایک بنیادی نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ یہ پہلی صدی تک دو زبردست سامراجی طاقتوں کے درمیان گھرا رہا ہے۔ ایک طرف برطانوی سامراج تھا تو دوسری طرف روس کی زارشاہی تھی۔ اس لئے اس حکومت کو ہر وقت دونوں حکومتوں کی ریشہ دوانیوں کا تختۂ مشق بننا پڑتا تھا۔ چنانچہ جتنی بھی انگریز افغان جنگیں ہوئی ہیں ان کی پشت پر

برطانوی سامراج کی یہ خواہش کارفرما رہی کہ افغانستان میں روس کا اثر ورسوخ نہ پھیلنے پائے کیونکہ اس صورت میں برطانیہ کی سب سے اہم نوآبادی ہندوستان زارشاہی کی زد میں آنے کا ڈر تھا۔ اس لیے انیسویں صدی میں ہم زارشاہی اور برطانوی سامراج کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا دیکھتے ہیں، اور یہی وہ زمانہ تھا جب برطانیہ کی حکومت ہندوستان کے ایجنٹوں کو زار کے مقبوضہ علاقوں یعنی وسطی ایشیا میں روس کے خلاف مسلمانوں کو اکسانے اور وہاں کی صورت حال کے بارے میں جاسوسی کرنے کے لیے بھیجا کرتی تھی۔ انیسویں صدی کا یہی وہ زمانہ تھا جب برطانوی سامراجیوں نے ہندوستان کو اپنی نوآبادیاتی توسیع میں ایک اڈے کی طرح استعمال کیا۔ انھوں نے سوڈان، مصر، حبش، افغانستان، برما اور چین کے خلاف جارحانہ جنگیں کیں اور ہر جگہ ہندوستانی سپاہی استعمال کئے۔ اور بحیرہ احمر کی دوسری بندرگاہوں میں نوآبادیاتی اداروں، چین میں قونصل خانوں اور ایران میں سفارت خانوں کے اخراجات ہندوستان کے عوام کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔

برصغیر ہند کی جدید تاریخ کے بارے میں برطانوی مورخوں کی مسخ بیانی پر جواہر لال نہرو نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے محققین کو اس دور کا تنقیدی نظر سے ازسرنو جائزہ لینا چاہیئے ہیں۔ نہرو لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کی تاریخ کے متعلق خاص طور پر جسے برطانوی عہد کہا جاتا ہے، انگریزوں کے بیان تلخ خنکی پیدا کرتے ہیں صداقت سمندر کی گہرائیوں کی تہہ میں چھپی ہوئی ہے اور صریح اور بے حجاب دروغ گوئی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔

برطانیہ کی سامراجی سرگرمیاں ہندوستان کے تمام پڑوسی ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سنکیانگ، افغانستان، بالائی برما اور تبت برطانوی صنعتی اشیا کی منڈی اور خام مال کے ذرائع کے لحاظ سے یہ علاقے غیر اہم تھے۔ لیکن دنیا کی آخری تقسیم کے لیے سامراجی جدوجہد کے دور میں حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ چین اور وسطی ایشیا کے نزدیک تھے۔۔۔

برطانوی سامراج کی خارجہ پالیسی ہمیشہ جارحانہ رہی۔ اس کی بنیادی سمت سب سے پہلے برطانیہ کی بین الاقوامی حالت سے معین ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانوی نوآبادیاتی پالیسی کا محور "مشرقی سوال" تھا۔ یعنی روبہ زوال ترک سلطنت کو ورثے میں حاصل کرنے کی جدوجہد۔ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں خاص دشمن روس تھا۔ اس تاریخی حقیقت نے ہندوستان کی سرحدوں پر برطانوی توسیع کو ہوا دی، خاص طور پر شمال اور شمال مغرب میں کاشغر، افغانستان اور ترکمانیہ کے جنوبی علاقوں میں۔ برطانوی نوآبادکار ان علاقوں کو وسطی ایشیا میں روس کے خلاف جدوجہد کے لیے اپنی ہراول چوکیاں تصور کرتے تھے۔

ہندوستان کے اندر حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی سرحدی پالیسی کی جارحیت بھی بدلی۔ اس طرح دو مکاتب خیال پیدا ہوئے۔ ایک مکتب ہندوستان کی سرحدوں پر "پیش قدمی کی پالیسی" کا علمبردار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دفاعی نظام میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحدیں غیر محفوظ ہیں اس لیے ان سے باہر ہندوستانی دفاع کو مضبوط کرنا چاہیئے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وسطی ایشیا پر روس کا قبضہ برطانوی ہند کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ دوسرا مکتب اس خطرے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ "بند سرحد کی پالیسی" کا حامی تھا اور اس خیال کا مخالف کہ ہندوستان کی سرحدوں کے باہر پیش قدمی کی جائے۔ اس کا مقصد نوآبادی میں اندرونی حالت کو مستحکم کرنا تھا۔ تاریخی اسباب کی وجہ سے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۰ء تک کے دور میں "بند سرحد کی پالیسی" حاوی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان میں جو اندرونی سنجیدہ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ان کی وجہ سے سرگرم

پیشقدمی مشکل ہوگئی۔ لیکن وقتی طور پر "پیشقدمی کی پالیسی" کو ترک کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سرحد پار علاقوں میں دخیل ہونے کے خیال کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا گیا۔ سفارتی سرگرمیوں کو چالاکی سے اپنا کر برطانوی سامراج اپنا حلقۂ اثر وسیع کرتا رہا اور اصل یہ نئی سرگرم جارحیت کے لئے مناسب حالات پیدا کرنے کی تیاری تھی۔ کاشغر اور افغانستان میں برطانوی پالیسی سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ وائسرائے لارنس نے افغانستان کے متعلق جس "غیر جانبداری" اور "عام مداخلت" کی پالیسی کا اعلان کیا وہ اس کی آزادی اور علاقائی سالمیت کے پرخلوص پاس ولحاظ کی وجہ سے نہ تھا۔ قدامت پرست پارٹی کے وزیر خارجہ کرین بورن نے لارنس کو لکھا کہ "وائسرائے کا لڑنے والے فریقین کی جانب باریک بین رویہ صرف برطانیہ کے مفاد میں ہے۔ اس وقت ہندوستانی ذرائع علاقائی توسیع کے بجائے دوسرے کام کے لئے ضروری ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کرین بورن کو افغانستان کی بہ نسبت بالائی برما سے زیادہ دلچسپی تھی۔ لیکن لارنس افغان حکمرانوں کے ساتھ اچھے تعلقات کو نہ ضروری خیال کرتا تھا اور نہ مفید۔ اس نے لکھا: "ایک دن آئے گا جب ایسا کرنا دانشمندانہ ہوگا (جو بعد میں وائسرائے لٹن نے کیا) لیکن ابھی تک یہ دن نہیں آیا ہے۔"

کاشغر میں اس زمانے میں برطانوی سامراجی اپنی توسیع سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے تجارت کو استعمال کر رہے تھے برطانوی مصنف ایلڈر بلا تکلف یہ تسلیم کرتا ہے:۔

"مشرقی ترکستان میں برطانوی پالیسی ۱۹ ویں صدی کی ساتویں دہائی سے ہمیشہ تجارتی مقاصد اور سیاسی مقاصد کا امتزاج تھی۔۔۔۔ تجارت صرف ہتھیار تھی۔ اس زمانے میں سب وائسرائے بخوبی جانتے تھے کہ تجارت سیاسی اثر کے لئے ایک بڑا ہتھیار ہے۔ لارنس اور رپن ہندوستان کی سیاسی ذمے داریوں کو اس کی حدود کے اندر رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کاشغر سے تجارت بڑھانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں نے جو برطانوی اثر بڑھانا چاہتے تھے تجارت کو فروغ دیا۔"

برطانوی مصنف کی یہ رائے بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس جواز کا کہ کاشغر میں برطانوی سامراجی اپنا اثر اس لئے بڑھانا چاہتے تھے کہ وہ "تحفظ ہند کے لئے خاص اہمیت کا حامل تھا" صداقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان کو روس سے خطرے کا ہوا برطانوی سامراج نے اس لئے کھڑا کیا تھا کہ ہندوستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحدوں کے پار اپنی جارحیت پر پردہ ڈال سکے ایلڈر نے اپنی اس تصنیف میں یہ لکھ کر خود اپنی تردید کی ہے:۔

"کاؤفمان کی سنکیانگ کو روس میں ملحق کرنے کا منصوبہ ۱۸۸۰ء میں اس لئے مسترد کر دیا گیا کہ اس میں جو وقت اور اخراجات صرف ہوتے ان کا بدل نہیں ملتا۔۔۔۔ اس کی معقول سیاسی اور فوجی وجوہات تھیں کہ روس اچھی قدرتی سرحد کو چھوڑنا اور زیادہ پریشان کن ایشیائی مسلمان رعیت کی ذمے داری قبول کرنا کیوں نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔ ایک برطانوی فوجی رپورٹ نے مستند طور سے کاشغر پر روسی حملے کے امکان کو صحیح قرار نہیں دیا۔"

اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ کاشغر پر روسی حملے سے تحفظ ہند کے سلسلے میں پریشانی اور کشمیر جیسی تقریباً ناقابل رسا ناقابل اعتماد وفادار بادشاہت میں روس کی طرح طاقتور یورپی ریاست سے قربت کا خطرہ بالکل بہانہ تھا۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اس موضوع پر برطانوی علم تاریخ کے یہ روایتی مقاصد اب بھی بعض ممتاز ہندوستانی مورخ بھولے پن سے تسلیم کر لیتے ہیں۔ بشیشور پرساد لکھتے ہیں:۔

"لیکن اس پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اس دور میں سرحدی ریاستوں کی سالمیت اور آزادی اور خود تحفظ ہند کے درمیان

تعلق نہ کہ ان دونوں کی مطابقت، پوری طرح منظر عام پر آیا۔ عدن، خلیج ایران، تلات افغانستان، تبت اور برما یہ سب اس کی حفاظت کی چوکیاں تھیں۔ اور بیرونی مداخلت سے ان کی حفاظت تحفظ ہند کی بنیاد تھی .... تو ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد اس وقت پڑی اور اتحادوں اور مفادات کا ایک ایسا نظام تیار کیا گیا جس نے ہندوستان کو تحفظ بخشا۔"

اسی طرح سنگھل لکھتے ہیں :۔

"ہندوستانی مفاد برطانوی شاہی ملحوظات کا ایک اہم حصہ تھا۔ چنانچہ مغربی طاقتوں کے اثر کے خلاف ہندوستانی سرحدوں کو مضبوط کرنے کا فیصلہ ۱۹ویں صدی کے آخر میں شاہی پالیسی کا غالب عنصر بن گیا۔

روس دشمنی یہ تھی صورت حال اور اس کے تقاضے جس کے لئے برطانوی سامراج پہلے دن سے ہی روس کے خلاف اس برصغیر میں زبردست رائے عامہ منظم کئے رہا ہے۔ اور بالخصوص اس شمالی ہند کے مسلمانوں میں روس دشمن جذبہ کی نشوونما کو زبردست اہمیت دی جاتی رہی کیونکہ برطانیہ کو ہمیشہ یہ خوف بھی ستاتا رہا کہ روس جب بھی اپنی سلطنت کو مزید پھیلانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا تو وہ لازماً وسطی ایشیا سے ہندوستان کی شمال کی جانب بڑھے گا۔ اور اس کے لئے وہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی فوجی اور دوسری خدمات حاصل کرے گا۔ اس لئے شمالی ہند کے مسلمانوں میں روس کے خلاف اور وہاں کے مسلمانوں کے خلاف روس کے مظالم کا چرچا جاری رہنا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ تاریخ میں ایسی بہت سی شہادتیں ہیں جہاں اس برصغیر کے مختلف عناصر نے انیسویں اور بیسویں صدی میں انگریزوں کی غلامی کا جوا اتارنے کے لئے روس سے مدد چاہی۔ بہر حال یہ الگ اور دلچسپ موضوع ہے اور اس پر کام کر رہا ہوں، چنانچہ روس کے خلاف برطانوی سامراج نے ہمارے اندر ایک گونہ نفرت کا بیج اپنی ضرورتوں کے لئے بہت پہلے بویا تھا۔ اور اس وقت ابھی اشتراکی انقلاب ظہور پذیر بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم روس سے خوفزدہ تھے اور جب جاپان نے روس کو ۱۹۰۵ء کی جنگ میں شکست دی تو ہم نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اور مولانا ظفر علی خاں جاپان اور روس کی جنگ کے بارے میں انگریزی ڈرامے کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

روس میں اشتراکی انقلاب

یہ تھے ہمارے روس کے متعلق عام افکار کہ اس میں ۱۹۱۷ء نومبر میں ایک بھونچال آگیا، یہ بھی جان لینا چاہیئے: ۱۹۱۷ء کے چل چلاؤ میں جب انقلاب برپا ہوا تو اس وقت پورا مشرق انقلاب اور عوامی احتجاج کی تحریکوں کے دہانے پر کھڑا تھا اور ہندوستان کا برصغیر بھی برطانوی استبداد کے خلاف ایک آتش فشاں بن رہا تھا جو پھٹنے والا تھا کہ اتنے میں روس کے وسیع و عریض خطے سے انقلاب کے شعلے بلند ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے اس روئے زمین کے چھٹے حصے کو سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سے آزاد کرا کے مزدوروں اور کسانوں کا راج قائم کر دیا۔ اس انقلاب کی پوری ماہیت کو آج ساٹھ باسٹھ برس گذرنے کے بعد بھی ہمارے اہل علم سمجھنے اور تجزیہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ اس انقلاب سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو جانے اور سمجھے بغیر خارجہ پالیسی اور عالمی تحریکوں کے بارے میں کبھی بھی نہ تو صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی تجزیہ درست ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب سوویت انقلاب برپا ہوا تو سوویت اقتدار کے منبع یعنی سوویت کمیونسٹ پارٹی اور اس کے رہنما لینن نے جو پہلے احکام جاری کئے ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ

ایسی سوویت اشتراکی ریاست تعمیر کی جائے جو محروم کیے جانے والے استحصالی طبقوں کا زور توڑ سکے اور ان کے زہریلے ڈنگوں کو ناکارہ کیا جا سکے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان احکام اور فرامین کا مقصد غیر ملکی سامراجیوں کے حملوں کو پسپا کرنا، انقلاب کی حفاظت کرنا اور اشتراکی تعمیر کا ڈول ڈالنا بھی تھا تاکہ کم سے کم مدت میں سوویت روس کو ایک ترقی یافتہ اشتراکی ریاست بنایا جا سکے ۔ مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کی ایسی ریاست وجود میں لائی جا سکے جس کا تاریخ میں کہیں اس سے پہلے نام و نشان نہ تھا ۔ اس انقلابی حکومت نے جو مقدس فریضہ اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا اس میں اس کی مدد اور تائید کی بنیاد پنچائتوں یعنی سوویتوں پر تھی اور یہ پنچائتیں جنہوں نے تاریخ اور تجربے کی کوکھ سے جنم لیا تھا دراصل میں پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ کی سرکاری شکل تھیں

یہ سوویت جس کا مطلب پنچایت ہے اصل میں ۱۹۰۵ء میں روسی مزدوروں کی انقلابی تحریک کے دوران وجود میں آئی تھیں، اس انقلاب کے دوران مزدوروں نے کارخانوں کا نظم و نسق سنبھالنے اور روزمرہ کا کام چلانے کے لیے اپنے لیے یہ جمہوری ادارے خود تخلیق کیے تھے اور یہ ادارے ان کے خون میں رچ بس گئے تھے ۔ یہ ان کی انقلابی روایات کا ایک اہم ترین حصہ بن گئے تھے ۔ چنانچہ اشتراکی انقلاب کے بعد تمام طبقوں میں یہ سوویتیں قائم ہونے لگیں ۔ یہ فوجی انقلابی کمیٹیاں، مزدوروں کی انجمنیں، لال گارڈ کے دستے، یہ تمام ادارے دراصل مزدوروں، کسانوں، فوجیوں اور محنت کرنے والے اہل علم کی بے پناہ انقلابی تخلیقی قوت تھے، چنانچہ سوویت اقتدار کے سب سے اعلیٰ ادارہ جو مجلس وزارت کہلاتا تھا یا اسے عوامی کمیسار بھی کہتے تھے نے ایک کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا، یہ کمیشن "کل روس ہنگامی کمیشن" کے نام سے موسوم ہوا جس کو روسی "چے کا" کہتے تھے، اس کا کام یہ تھا کہ انقلاب کی مخالف اور دشمن طاقتوں کا پتہ چلائے اور ان کا قلع قمع کرے ۔

ابتدائی دو تین مہینوں میں سوویت حکومت نے جو فرامین اور احکام جاری کیے وہ بنیادی تھے ۔ اس نئے نظام کے اور یہ احکام سوویت حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے ارادوں کی نشاندہی کر رہے تھے اور یہ بھی ان سے پتہ چلتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے نزدیک پرولتاریہ کی آمریت کا کیا مطلب ہے ۔

- ۱۶ ردسمبر ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا گیا جس نے فوج کے پرانے ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور اس کو جمہوری بنیاد پر استوار کرنے کا فیصلہ کیا گیا، فوج کے اندر تمام اختیارات افسروں اور جرنیلوں سے لیکر فوجیوں کی خود چنی ہوئی کمیٹیوں یعنی پنچائتوں کے حوالے کر دیے گئے، اوپر کے تمام عہدے چناؤ پر چھوڑ دیے گئے پرانے تمام عہدے، خطابات اور تمغے سب یک قلم موقوف کر دیئے گئے ۔
- ۱۰ رجنوری ۱۹۱۸ء کو ایک فرمان جاری ہوا کہ مزدوروں اور کسانوں کی سرخ فوج بنائی جائے ۔
- یکم فروری ۱۹۱۸ء کو فرمان جاری ہوا کہ مزدوروں اور کسانوں کا سرخ بحری بیڑہ قائم کیا جائے چنانچہ ان دو فرامین کے تحت رضاکارانہ بنیادوں پر سرخ فوج وجود میں آنی شروع ہو گئی ۔
- سوویت اقتدار نے اولین فرمانوں کے تحت زمینداری اور جاگیرداری کا قلع قمع کر دیا تھا ۔
- ۱۰ رنومبر ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا گیا جس میں مرد اور عورت کی مساوات کو تسلیم کیا گیا اور سرکاری رجسٹر میں اندراج کے بغیر شادی ممنوع قرار دے دی گئی ۔

٭ ۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کے فرمان کے مطابق کلیسا یا مذہبی اداروں کو حکومت اور سرکار سے بالکل لاتعلق کر دیا گیا اور تعلیم اور مدارس کو مذہبی اداروں یا کلیساؤں سے الگ کر دیا گیا۔

٭ ۔ اقتصادی میدان میں سوویت اقتدار نے ایک اشتراکی قلبِ ماہیت شروع کر دی۔ زمین کو قومی ملکیت بنانے یعنی کسانوں کی ملکیت قرار دینے کے فوراً بعد۔

٭ ۔ ۱۴ نومبر ۱۹۱۷ء کو پیداوار اور اس کی تقسیم پر مزدوروں کے کنٹرول کا فرمان نافذ کر دیا گیا۔

٭ ۔ جہاں تک اسٹیٹ بنک کا تعلق تھا وہ انقلاب کے دن، ۷ نومبر ۱۹۱۷ء ہی کو قومی تصرف میں لے لیا گیا تھا۔

٭ ۔ اس کے بعد کارخانوں کو بھی بالخصوص ان کارخانوں کو جن کے مالکان نے انقلاب کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی تھیں سرکاری کنٹرول میں لے لیا گیا۔

اب اس انقلاب نے ہندوستان ہو یا افغانستان، ایران ہو یا مصر سبھی جگہ سامراج دشمن تحریکوں کو ہوا دی، عوام کو حوصلہ دیا کہ محنت کش انقلاب برپا کر سکتے ہیں، سامراج کا تختہ الٹا جا سکتا ہے۔ اور یہی شکتی، یہی ہمت تھی جس نے افغانستان کو اپنی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد پر ابھارا۔

۱۹۱۹ء تک کا افغانستان

امان اللہ خاں جو مارچ ۱۹۱۹ء میں اپنے باپ امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔ اس وقت تک افغانستان کی تمام حکومتیں اور تمام بادشاہ ایک نہ ایک انداز سے برطانیہ کے باجگذار بادشاہ تھے اور ان کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ امان اللہ کے دادا امیر عبدالرحمان کے متعلق معارف اسلامیہ کی پہلی جلد میں درج ہے۔

"ابھی عبدالرحمان کے بادشاہ بننے کا اعلان ہوا ہی تھا کہ شیر علی کا دوسرا بیٹا، محمد ایوب ہرات میں لشکر جمع کر کے قندھار کی طرف بڑھا، میوند کے مقام پر انگریزی افواج کو شکست فاش دی۔ (۱۷ شعبان ۱۲۹۷ھ/ ۲۵ جولائی ۱۸۸۰ء) اور قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ عبدالرحمان کابل میں امن قائم کرنے کے بعد عازم قندھار ہوا۔ جنرل رابرٹس دس ہزار فوج کے ساتھ اس کی حمایت پر تھا۔ چنانچہ سردار محمد ایوب کو ایران کی طرف بھگا دیا گیا اور قندھار بھی امیر عبدالرحمان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے بعد ساری برطانوی فوج افغانستان خالی کر کے واپس چلی آئی اور پورا ملک بشمول قندھار، عبدالرحمان کے سپرد کر دیا گیا۔ (۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) اس نے داخلی مشکلات اور خارجی مسائل کے باوجود اپنے ملک کی "آزادی" اور "وحدت" برقرار رکھی۔ (اس سلسلے میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے اسے بڑی تقویت پہنچائی۔ ۱۸۸۰ء میں اسے پانچ لاکھ روپے کئی سو توپیں اور کئی ہزار بندوقیں دی گئیں۔ اس کے علاوہ اسے اٹھارہ ہزار پونڈ کی سالانہ مالی امداد بھی ملنے لگی۔ اس نے خط ڈیورنڈ کو باہمی سرحد بنانے پر موافقت کر لی (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) اس کے دورِ حکومت میں تمام داخلی شورشوں کو انتہائی جبر و استبداد سے کچل کر رکھ دیا گیا۔ عبدالرحمان نے ہندوکش سے شمال کی ولایات پر قبضہ کیا اور کافرستان فتح کر کے اس کا نام نورستان رکھا۔ (۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء) ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء میں روس اور افغانستان کی سرحدات کا تعین ہوا۔ اور پنج دہ کا علاقہ افغانستان سے الگ ہو گیا۔ امیر عبدالرحمان نے اپنی وفات (۱۵ جمادی الآخرۃ ۱۳۱۹ھ/ یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء) پر ایک غیر متنازع فیہ حکومت اپنے بیٹے امیر حبیب اللہ کے لیے چھوڑی۔ افغانستان کے لوگوں کے لئے امیر ایک

مستبد حکمران تھا، لیکن انگریزوں کے ساتھ اس کی روش بہت نرم اور دوستانہ تھی۔ چنانچہ اس نے سوات، چترال، وزیرستان، خیبر، چاغی، چمن، پشین، پاراچنار اور کرم کے علاقے ایک معاہدہ طے کر کے برطانوی حکومت کے لیے چھوڑ دیے۔

امیر حبیب اللہ کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصے بعد روسی۔ برطانوی معاہدہ طے ہو گیا اور اس بات کا احتمال جاتا رہا کہ ان میں سے کوئی طاقت افغانستان کے کسی حصے کا الحاق کرے گی۔ یا اس کے معاملات میں مداخلت کرے گی۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں امیر حبیب اللہ نے اس معاہدے کی توثیق کر دی جو اس کے والد نے ہندوستان کی برطانوی حکومت سے کر رکھا تھا اور جس کی رو سے امیر نے اٹھارہ لاکھ روپیہ (ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ) کے عوض معاملاتِ خارجہ برطانوی حکومت کی تحویل میں دے دیے۔ امیر حبیب اللہ کے عہد میں ملک کے اندر امن و امان فی الجملہ قائم رہا اور تعلیم میں بھی کچھ ترقی ہوئی۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں افغانستان نے غیر جانبداری کی حکمتِ عملی اختیار کی۔ ۱۸ر جمادی الاول ۱۳۳۷ھ/۲۰ر فروری ۱۹۱۹ء کو امیر نے لغمان کے قلعہ گوش میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا کہ اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس کے بھائی نصر اللہ خان نے جلال آباد میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، لیکن امیر کے تیسرے بیٹے امان اللہ خان نے، جسے فوج کی امداد حاصل تھی مسندِ امارت حاصل کر لی اور نصر اللہ خان نے قید میں انتقال کیا۔

امان اللہ خان نے یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو تخت نشین ہوتے ہی افغانستان کے استقلال کا اعلان کر کے برطانوی حکومت سے جنگ شروع کر دی۔ انگریزی افواج نے درۂ خیبر کے شمالی دہانے کے پاس ڈکہ کے مقام پر اور چمن کے سامنے سپین بولدک کے افغانی قلعے پر قبضہ کر لیا اور کابل پر طیارے کے ذریعے سے بم باری کی، لیکن افغانستان کے عوام نے قندھار میں سردار عبدالقدوس، صدرِ اعظم، جنوبی سرحدات پر سپہ سالار محمد نادر خان اور سمت مشرقی میں اپنے قومی سرداروں کی راہبری میں اعلان جنگ کر دیا۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں سوویٹ روس نے افغانستان کا استقلال تسلیم کر لیا۔ بالآخر حکومت افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی اور معاہدۂ راولپنڈی (۱۲ر ذی قعدہ ۱۳۳۷ھ/۸ر اگست ۱۹۱۹ء) کی رو سے برطانوی حکومت نے افغانستان کی آزادی باضابطہ تسلیم کر لی۔ شاہ امان اللہ خان نے سفیروں کے ذریعے ساری دنیا سے روابط قائم کر لیے اور مملکت عصری ترقیات کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ ۱۹۲۱ء میں روس کی سوویٹ حکومت اور برطانیہ سے نئے معاہدے کیے گئے، گو کشیدگی شمالی سرحدوں پر ۱۹۲۲ء تک اور جنوبی و مشرقی سرحدوں پر ۱۹۲۴ء تک جاری رہی۔ ۱۹۲۲ء میں لوئی جرگے نے ایک دستورِ اساسی مرتب و نافذ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں انتظامی دستور العمل مرتب ہوا۔ عساکر کی تنظیم و اصلاح جدید ترین اصولوں پر ہوئی۔ اور دنیا بھر کے ممالک سے تجارتی تعلقات کا قیام عمل میں آیا۔ داخلی اصلاحات کا اجرا ہوا۔ مثلاً غلامی کی تنسیخ، مطابع کا قیام، اخبارات کا اجرا، بلدیات کا قیام، سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر، تار برقی اور ٹیلی فون کی توسیع، نہروں اور کاریزوں کی کھدائی، کابل میں مجلس شوریٰ اور صوبوں میں مجلسِ مشورہ کا قیام، سیاسی احزاب کی آزادی، جہالت اور تعصب کے خلاف جد و جہد، اعلیٰ تعلیم کے انتظامات، حمل و نقل کے جدید وسائل کی درآمد اور ان کا اجرا۔ ۱۹۲۴ء میں عورتوں کے لیے بھی اعلیٰ تعلیم کی تدابیر اختیار کی گئیں، جس پر انگریزوں کے اشارے سے ایک مفرور افغانی سردار عبدالکریم کے زیرِ سرکردگی خوست میں بغاوت ہو گئی۔ کابل کے عساکر نے باغیوں کو گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا اور عبدالکریم ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ یہ پہلی رجعت پسندانہ تحریک تھی جو انگریزوں کی انگیخت پر امان اللہ کے خلاف پیدا ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں دوسرے لوئی جرگے نے تعلیم نسواں سے متعلق قوانین منسوخ کر دیے۔ نیز جبری بھرتی

کے قوانین میں ترمیم کر دی۔ جب امن قائم ہو گیا تو امان اللہ خان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور ۱۹۲۸ء میں یورپی ملکوں کی سیاحت کی، ان سے سیاسی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی معاہدات طے کئے اور کاغذ سازی، شکر سازی، پشمینہ بافی اور نساجی (کپڑا بننے) کے کارخانے خرید کر ملک میں لایا۔ اس دورے سے واپس آکر بادشاہ نے نئے دستور اساسی کے نفاذ اور معاشرتی و تعلیمی اصلاحات کی ترتیب کے لئے تیسرا لوی جرگہ طلب کیا۔ چونکہ امان اللہ کا ماسکو جانا دولتِ انگلشیہ کے سیاسی مقاصد کے موافق نہ تھا۔ اور اسے ہندوستان کے لئے خطرے کی علامت سمجھا گیا، اس لئے انگریزی حکومت نے ہندوستان کے سرحدی قبائل میں شورش برپا کر دی۔ اس کے علاوہ اسی حکومت کی شہ پر ایک تاجیک ڈاکو بچہ سقّا نے کوہ دامن سے پیش قدمی کر کے کابل پر قبضہ کر لیا۔ (جنوری ۱۹۲۹ء) امان اللہ خاں قندھار کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے اس نے کابل کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جو کوشش کی اسے حبیب اللہ (بچہ سقا) کے حامیوں نے ناکام بنا دیا۔ (اپریل ۔ مئی ۱۹۲۹ء) اندریں اثنا ہرات پر ایک اور تاجیک عبدالرحیم کا قبضہ ہو گیا۔ امان اللہ چمن کے راستے افغانستان سے رخصت ہو گیا۔ اور اٹلی جا کر سکونت اختیار کر لی۔"

امان اللہ کے دورِ حکومت کے بارے میں غیر کمیونسٹ اور ہمارے ہاں کے عالموں کی مرتب کردہ انسائیکلو پیڈیا سے میں نے تمام صورت حال درج کی ہے لیکن اس بیان کو تقویت دینے کے لئے میں سوویت روس کے رویّے کا بھی یہاں ذرا تفصیل سے ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لئے کہ آج پھر افغانستان کی موجودہ حکومت پر تمام غیض و غضب کا اظہار سوویت روس کے حوالے سے ہی ہو رہا ہے اور چونکہ بعض تفصیلات ان عالموں نے بھی درج نہیں کیں اس لئے میں ان تفصیلات کے ذریعے سوویت روس کے رویّے کو واضح کر رہا ہوں۔

شاہ امان اللہ اور سوویت یونین

امان اللہ جیسے ہی مارچ ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے اپنے آزادی کے حصول کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے سوویت روس سے ہی امداد چاہی۔ چنانچہ اس نے مارچ ۱۹۱۹ء میں جو مراسلہ بھیجا تھا سوویت حکومت کے سربراہ لینن نے اس کا جواب اپریل ۱۹۱۹ء میں امان اللہ کو بھیج دیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا

"افغانستان نے ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے جو پہلا مراسلہ بھیجا ہے جس میں روسی قوم کو پیام تہنیت بھیجا گیا ہے اور عالی جاہ کی تخت نشینی کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس کے جواب میں ہم فوراً مزدوروں اور کسانوں کی حکومت اور پوری روسی قوم کی طرف سے آزاد اور خود مختار افغانی قوم کی خدمت میں پیام تہنیت بھیجتے ہیں جو اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے غیر ملکی ظلم و زبردستی کے خلاف اس قدر بے جگری سے لڑ رہی ہے۔ عالی جاہ ہم آپ کی تخت نشینی پر آپ کو مبارک باد پیش کرنا چاہتے ہیں جو ۲۱ فروری ۱۹۱۹ء کو عمل میں آئی۔

مزدوروں اور کسانوں کی حکومت نے روسی ری پبلک کی تمام قومیتوں کو سچی آزادی اور مساوات عطا کر دی ہے اور اپنے اعلانات سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہوئے، لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف تمام محنت کشوں کی ایکتا کے بین الاقوامی اصول پر مضبوطی سے کاربند ہو گئی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ افغانی قوم کی روس کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش افغانی ریاست کی مضبوطی اور خود مختاری کی بہترین

ضمانت ثابت ہو۔

یہ جواب روسی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار پراودا میں اس زمانے میں جیسے ہی شائع ہوا تو برطانوی سامراج کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے فی الفور افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امان اللہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے جس حکومت سے رابطہ قائم کیا وہ سوویت یونین کی حکومت ہی تھی۔ امان اللہ نے ۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو تاشقند کے ذریعے سوویت یونین کی مجلس عاملہ کے صدر کیلینن کو جو خط لکھا اس میں کہا گیا تھا۔

"آپ اور آپ کے رفقا انسانیت کے بہترین دوست ہیں، آپ نے امن عالم کی حفاظت کی عظیم اور قابل صد احترام ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے، آپ نے اس کرہ ارض پر بسنے والی تمام اقوام اور ممالک کی آزادی خود مختاری اور برابری کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ مجھے اس امر کی بے حد مسرت ہے کہ افغان عوام کی طرف سے میں پہلا شخص ہوں جو ترقی کے لئے کوشاں ہے اور میں افغانستان کے بہادر اور آزادی پسند عوام کی طرف سے آپ کو دوستی خیر سگالی کا پیغام بھیجتے ہوئے بے پناہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔"

یہ پیغام سوویت روس کو ۱۲ مئی ۱۹۱۹ء کو موصول ہوا اور اس کے ساتھ ہی افغانستان کی طرف سے خیر سگالی کا وفد بھی تاشقند پہنچا۔ اس وفد کی رہنمائی محمد ولی خاں کر رہے تھے اور اس کا مقصد سفارتی تعلقات قائم کرنا تھا۔

۲۷ مئی ۱۹۱۹ء کو لینن اور کیلینن کے دستخطوں سے امیر امان اللہ کو جواب بھیجا گیا جس میں کہا گیا تھا۔

"ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات کے قیام سے دونوں ملکوں کے عظیم عوام کے درمیان دوستانہ تعاون کی راہیں کھل جائیں گی۔ اور انسانیت کے ان دشمنوں کے ارادوں کو ناکام بنایا جا سکے گا۔ جو دوسری قوموں کی آزادی اور ان کی دولت لوٹنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔"

افغانستان کے سفارتی مشن کو تاشقند میں رکنا پڑا۔ کیونکہ اس دور میں تاشقند کا انقلاب دشمن طاقتوں کی وجہ سے ماسکو سے رابطہ ایک حد تک منقطع ہو گیا تھا۔ آخر اکتوبر کی ۱۵ تاریخ کو یہ وفد ماسکو پہنچا جہاں وزارت خارجہ کے سربراہوں نے اس وفد کا استقبال کیا۔ اور ۴ ار اکتوبر ۱۹۱۹ء کو لینن نے افغانستان کے اس سفارتی وفد کو اپنے دفتر میں مدعو کیا اور کہا کہ "انہیں افغان عوام کے اس عظیم وفد سے مل کر مسرت ہوئی جو عوام سامراج کے خلاف زبردست جدوجہد میں مصروف ہیں۔"

افغان سوویت معاہدہ

اس سفارتی مشن کا ایک مقصد سوویت یونین کے ساتھ دوستی کا معاہدہ بھی طے کرنا تھا لیکن اس معاہدے میں کافی تاخیر ہو گئی۔ کیونکہ افغانستان کے اندر برطانوی ایجنٹوں اور ان درباریوں نے جو برطانیہ کے خفیہ طور پر تنخواہ یافتہ تھے نے "سوویت یونین کی اسلام دشمنی" کا پراپیگنڈہ شروع کر کے امیر امان اللہ کو مرعوب کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس معاہدے کا ارادہ ترک کر دے۔

اس پوری مہم میں مولوی اور پیر و مشائخ بھی پیش پیش تھے اور انہوں نے اسی دوران امیر بخارا کو جو اپنے عوام اور سوویت یونین کے انقلاب کے خلاف لڑ رہا تھا کو فوجی امداد بھی پہنچانی شروع کر دی، مقصد یہ تھا کہ سوویت یونین مشتعل ہو کر افغان سفارتی وفد بغیر معاہدے کے واپس بھیج دے گی۔ لیکن سوویت یونین نے فقط افغان حکومت کو اس سازش سے آگاہ کیا۔ چنانچہ افغان حکومت نے فوراً معذرت کی اور اپنے سفیر متعینہ بخارا کو برخاست کر دیا۔

برطانوی ریشہ دوانیوں کو جب چاروں طرف سے ناکامی ہونے لگی تو امیر امان اللہ کو قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن جولائی ۱۹۲۰ء میں یہ سازش بھی ناکام بنا دی گئی اور ستمبر ۱۹۲۰ء میں سوویت یونین اور افغانستان کی حکومت میں دوستی کا ابتدائی معاہدہ طے پا گیا اس معاہدے کے طے پا جانے پر افغانستان کے وزیر خارجہ نے سوویت یونین کے وزیر خارجہ کو ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

- میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جمہوریہ سوویت یونین سے ہم نے جو دوستی کا معاہدہ کیا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ اس دنیا سے سامراجی تشدد اور بالادستی کے خاتمے کی ہماری خواہش ہے، بالخصوص مشرق کی تمام اقوام خواہ ان کا کوئی مذہب ہو اور کوئی اعتقاد ہو کو ان عالمی غاصبوں سے آزاد کرانے اور نجات دلانے کا جذبہ ہے جو ہمیں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کی حکومت کو بھی یہ مقاصد دل و جان سے عزیز ہیں اور وہ ان کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے

برطانیہ نے دوستی کے اس معاہدے کو رکوانے کی کوششیں جاری رکھیں اور لارڈ کرزن جو اس وقت حکومت برطانیہ کے محکمہ خارجہ کے سیکرٹری تھے نے سوویت حکومت کو یکے بعد دیگرے دو مکتوب روانہ کیے۔ ایک مکتوب یکم اکتوبر ۱۹۲۰ء اور دوسرا ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو روانہ کیا گیا جس میں سوویت حکومت پر الزام لگایا گیا کہ وہ افغانستان میں برطانیہ دشمن سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ دوسرے مکتوب میں تو یہ بھی الزام عائد کیا گیا تھا کہ سوویت حکومت افغان ہند سرحدوں پر قبائلیوں کو حکومت ہند کے خلاف بغاوت کے لیے اکسا رہی ہے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۲۱ء کو کابل میں برطانوی سفیر ہنری ڈاب نے حکومت افغانستان پر پھر دباؤ ڈالا کہ وہ سوویت حکومت سے اپنا دوستی کا معاہدہ ختم کر دے۔ لیکن افغانستان کی حکومت نے اس تمام دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا اور ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کو دوستی کے اس معاہدے کی تصدیق کر دی اور باقاعدہ ماسکو میں ایک تقریب کے دوران اس کا اعلان کر دیا گیا۔

اس معاہدے کے پہلے آرٹیکل میں کہا گیا تھا۔

آرٹیکل نمبر ۱۔

اس معاہدے میں شریک دونوں فریق تمام مشرقی اقوام کی آزادی کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قوم کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے۔

آرٹیکل نمبر ۲۔

اس معاہدے میں شریک دونوں فریق اس امر کا وعدہ کرتے ہیں کہ وہ کسی تیسری طاقت کے ساتھ نہ تو کسی ایسے فوجی اور نہ سیاسی معاہدے میں شریک ہوں گے جو کسی ایک فریق کے لیے نقصان دہ ہو۔ روس اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ افغانستان کو روس کے راستے روس کے اندر سے یا بیرونی ممالک سے مال لانے اور لے جانے کی اجازت ہو گی۔ اور کوئی راہداری وصول نہیں کی جائے گی۔ روس افغانستان کو مالی امداد دینے کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ خاص طور پر سوویت یونین افغانستان کو ہوائی جہاز مہیا کرے گا اور فضائیہ کے لیے ایک سکول بھی افغانستان میں قائم کرے گا۔ روس افغانستان کو پانچ ہزار بندوقیں بمعہ کارتوسوں کے بھی دے گا۔ سوویت یونین بغیر دھوئیں کے بارود تیار کرنے کا ایک کارخانہ بھی افغانستان میں قائم کرے گا۔ کوشکا سے ہرات، قندھار و کابل تک تار برقی کے لیے بھی سامان مہیا کرے گا اور فنی

ماہرین بھی بھیجے گا۔ اور دس لاکھ سونے کے روبل بھی اخراجات کے لیے دے گا۔"

افغانستان کے لیے یہ پہلا معاہدہ تھا جو اس نے کسی ہمسایہ بڑی طاقت کے ساتھ برابری کی سطح پر کیا تھا۔ وگرنہ آج تک افغانستان نے انگریزوں سے جتنے معاہدے کیے تھے ان میں ایک حاکم طاقت ہوتی تھی اور دوسری محکوم، اور افغانستان کی حیثیت ایک باجگذار ریاست سے زیادہ کبھی نہیں سمجھی گئی تھی۔ لیکن اس معاہدے نے افغانستان کو ہی نہیں بلکہ تمام مشرقی اقوام کو ایک نیا احساس عطا کیا۔ چنانچہ لینن اس معاہدے کو بہت اہمیت دیتا تھا اور اسی اہمیت کے اظہار کے لیے لینن نے امیر امان اللہ کو اس کے پیغام کے جواب میں ۲۷ مئی ۱۹۲۱ء کو جو مکتوب بھیجا۔ اس میں کہا گیا تھا:۔

روس کی سوویت حکومت اور افغانستان کی مملکت کے مشرق میں مفادات میں ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں مملکتیں اپنی آزادی کو عزیز جانتی ہیں اور وہ ایک کو ہی نہیں بلکہ مشرقی عوام اور قوم کو آزاد اور خودمختار دیکھنا چاہتی ہیں۔ دونوں مملکتیں دوستی کے رشتے میں صرف ان مشترکہ خواہشات اور عوامل کی بنیاد پر ہی منسلک نہیں بلکہ وہ اس لیے بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں کہ ان کے درمیان کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو ان کی دوستی میں کسی قسم کا رخنہ پیدا کرنے کا باعث ہو۔"

لینن نے اپنے اس پیغام میں اس امر پر بھی اصرار کیا تھا کہ زار کا سامراج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے اور اب افغانستان کے شمال میں سوویت یونین واقع ہے جس نے دوستی اور خیرسگالی کا ہاتھ تمام مشرقی اقوام کی طرف بڑھایا ہے اور خاص طور پر افغانستان کی طرف سب سے پہلے پیش قدمی ہوئی ہے۔ چنانچہ لینن نے اپنے اسی مکتوب میں آگے چل کر لکھا تھا:۔

"افغانستان ان ممالک میں ہے جس کے نمائندے کو ہم نے سب سے پہلے بعد مسرت ماسکو میں خوش آمدید کہا تھا۔ اور ہم اس لیے بھی مسرور و شادماں ہیں کہ دوستی کا سب سے پہلا معاہدہ جو افغانستان نے کسی ملک سے کیا ہے وہ سوویت روس ہی ہے۔"

سوویت روس نے ہی افغانستان میں سب سے پہلا ریڈیو اسٹیشن ۱۹۲۰ء میں تعمیر کیا اور ۱۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو اس ریڈیو نے جب نشریات شروع کیں تو امیر امان اللہ سب سے پہلے شکریے کا پیغام اس ریڈیو سے لینن کے نام نشر کیا تھا اور اس میں لینن کو محترم رفیق "کامریڈ" کے لقب سے امیر امان اللہ خاں نے مخاطب کیا تھا۔ دوستی کے معاہدے کے دوران میں ہی سوویت روس نے دس لاکھ سونے کے روبل افغانستان کو پیش کر دیئے اور تار برقی نصب کرنے کا کام شروع کر دیا اور ۱۹۲۳ء تک معاہدے کی رُو سے سوویت یونین نے اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر دیں۔

سوویت دوستی کی سزا

یہ تمام تفاصیل میں نے اس لیے دی ہیں کہ یہاں کے اہل علم کو پتہ چل جائے کہ سوویت یونین کا افغانستان کی آزادی، سالمیت اور استحکام میں کتنا حصہ رہا ہے اور کتنا پرانا رشتہ ہے۔ سوویت روس کے فنی ماہرین اور مشیر افغانستان میں آج ہی نہیں آئے بلکہ ان کی امداد کو ساٹھ برس گذر گئے ہیں اور دوستی کا معاہدہ بھی آج نہیں ہوا بلکہ اس سے پہلے بھی یہ معاہدے موجود تھے۔ لیکن امیر امان اللہ کو اس آزادی اور سوویت دوستی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ کیونکہ برطانوی سامراج یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا

کہ غلام ہندوستان کی سرحدوں پر ایک ترقی پسند اور آزاد ملک وجود میں آئے۔ چنانچہ جب برطانوی سامراج امیر امان اللہ کو سوویت کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلقات کی راہ سے ہٹانے میں ناکام رہا تو اس نے امیر امان اللہ کو ہی راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ امیر امان اللہ نے صرف خارجی تعلقات میں ہی ایک آزاد اور سامراج دشمن پالیسی اختیار نہیں کی تھی بلکہ اس نے اندرون ملک بھی ایسے اقدام کیے جس سے وہ افغانستان کے قبائلی معاشرے کو ترقی یافتہ سماج میں بدلنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے لیے اس نے صنعتیں قائم کرنی شروع کیں اور اس کے لیے اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ایک طرف اس نے زرعی اصلاحات کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف قبائلی سرداروں کی مراعات ختم کرنے کا اعلان کیا۔ سود پر پابندی عائد کر دی اور مقدمات کے فیصلوں کے اختیارات ان پڑھ ملاؤں کے ہاتھوں سے لے کر پڑھے لکھے عالموں کو منتقل کر دیئے۔

ان اصلاحات نے ہیجان پیدا کر دیا۔ قبائلی سرداروں اور ان کے دوست مولوی علما اور مشائخ سیخ پا ہونے لگے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان علما" اور مشائخ کا جاگیرداری اور قبائلی سماج میں ان جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں سے ہمیشہ گہرا رشتہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی خانقاہیں، ان کے مدرسے، ان کے حلوے مانڈے سب انہی زمینداروں کے ساتھ بہت حد تک وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ برطانوی ایجنٹوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ ادھر امیر امان اللہ کی اصلاحات کو کامیاب بنانے کے لیے کوئی عوامی ادارہ یا جماعت تو موجود نہ تھی۔ اس کا سہارا تو اپنے درباری اور وزیروں پر ہی تھا جو خود انہی قبائلی سرداروں اور زمینداروں کی آل اولاد تھے۔ اس لیے جب قبائلی سرداروں نے برطانوی ایجنٹوں کی امداد سے آواز بلند کرنا شروع کی تو امیر امان اللہ یکہ تنہا نظر آنے لگے۔ اور برطانیہ نے افغانستان کے اندر اور باہر اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ الحفیظ والامان، بالکل اسی طرح مولوی اور مشائخ ہندوستان میں پہنچنا شروع ہو گئے جیسے آج کل نظر آ رہے ہیں چنانچہ ۱۹۲۹ء کے بعد اس برصغیر کے اخبارات اور سیاسی زعما کے بیانات کو اگر کھنگالا جائے تو بہت ہی دلچسپ اور عبرت ناک تصویر سامنے آتی ہے اور اس دور کی صورت حال کی جھلکیاں دیکھ کر آج رونما ہونے والے واقعات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت

۱۹۲۸ء میں امیر امان اللہ خاں نے اپنے دورہ یورپ کے بعد سوویت یونین کا بھی دورہ کیا اور وہاں کی ترقی اور نظام حکومت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس سے وہ خاصے متاثر ہوئے، اب ایسے سمے میں جب یورپ اور یورپی ممالک کے مقبوضات میں عالمی اقتصادی بحران سر نکال رہا ہو۔ بیروزگاری بڑھ رہی ہو، افراط زر لوگوں کی زندگی اجیرن کر رہی ہو، پیداوار گھٹ رہی ہو، عوام کی قوت خرید جواب دے رہی ہو اور اس کے مقابلے میں ایک وسیع و عریض ملک سوویت یونین تھا جہاں بیروزگاری ختم ہو رہی تھی، پیداوار بڑھ رہی تھی۔ قیمتیں مقرر تھیں۔ ان میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا، افراط زر نام کو نہیں تھی تو ظاہر ہے امیر امان اللہ کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

اس صورت حال نے برطانوی سامراج کو خاصا پریشان کر دیا اور اس پر ظلم یہ ہوا کہ ہندوستان میں اقتصادی بحران نے انقلابی عمل کو دن بدن زیادہ واضح اور متشکل کرنا شروع کر دیا اور یہاں ہڑتالوں کی لہر تیز ہونے لگی، چنانچہ اس صورت حال کا اندازہ اس غصیلی اور جھنجھلاہٹ والی تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے برطانوی

وائسرائے لارڈ ارون نے ۲۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو کی تھی، اس میں انہوں نے کہا :

"ان صنعتی تنازعوں کا ایک اور اہم اور سنگین پہلو بھی ہے جس کا ذکر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا، یہ درست ہے کہ مزدور طبقہ کی صحیح اور درست شکایات کا ازالہ ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ مزدوروں اور محنت کرنے والوں کو کچھ شکایات ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پچھلے سالوں میں مزدور طبقہ میں بے چینی کی بنیادی وجہ بعض اشخاص کی سرگرمیاں ہیں جن کا مقصد مزدوروں کی بہبود نہیں ہے بلکہ سماج دشمن مقاصد کو ہوا دینا ہے۔ جس انداز سے کمیونزم کو پھیلایا جا رہا ہے اس سے میری حکومت کو بجا طور پر تشویش لاحق ہے نہ صرف کہ کمیونسٹ ایجنٹوں نے جو بیرون ملک سے تعلق رکھتے ہیں، صنعتی شعبے میں انتشار اور گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کا پروگرام جو انہوں نے اپنے سامنے رکھا ہے اس کے مطابق معاشرے کے پورے اقتصادی ڈھانچے کو تہس نہس کرنا ہے۔"

یہ تقریر دراصل برصغیر میں "کمیونسٹ خطرے" کے پیش نظر زبردست متشددانہ دور شروع کرنے کی نشان دہی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے امتناعی نظر بندی کے قوانین نافذ کئے گئے اور پھر ملک بھر کے مزدور اور کمیونسٹ رہنماؤں کو پکڑ لیا گیا اور ان کے خلاف حکومتِ وقت کے خلاف سرگرمیوں کی بنیاد پر ایک مقدمہ سازش قائم کیا گیا جسے میرٹھ سازش کیس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ سوویت انقلاب کے بعد یہ چوتھا مقدمہ سازش تھا جو میرٹھ میں قائم کیا گیا۔ اس سے پہلے پشاور، لاہور اور کانپور کے مقامات پر سازش کے مقدمات قائم کر کے مختلف کارکنوں اور رہنماؤں کو سالہا سال کے لیے قید کی سزا سنائی جا چکی ہے۔

اب ہندوستان میں جب بغاوت اور انقلاب کی چنگاریاں شعلے بن رہے ہوں اور ایسے میں اس کی سرحدوں پر ایک ایسی حکومت ہو جو سوشلسٹ روس کی ہمنوا ہو یہ برطانوی سامراج کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ برطانوی سامراج کو خطرہ تھا کہ سوویت یونین افغانستان کے ذریعے ہندوستان میں سوشلسٹ انقلاب لانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کی روک تھام کے لئے جہاں ہندوستان کے اندر ظلم و تشدد، مبینہ سازشوں کے مقدمات، وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ضروری تھیں وہاں افغانستان کے اندر امیر امان اللہ کو ہٹایا جانا بھی ضروری ٹھہرا۔ چنانچہ امان اللہ کی اصلاحات کو اسلام کے منافی قرار دیا گیا افغانستان کے اندر اور باہر امیر امان اللہ کی بیگم ملکہ ثریا کی عریاں تصویریں کروڑوں کی تعداد میں تقسیم کی گئیں، "علما اور مشائخ" کو سرگرم عمل کیا گیا، ان کی کھیپ کی کھیپ ہندوستان پہنچنی شروع ہوئی اور یہاں بھی عوام کو متاثر کرنے اور امان اللہ خان کے خلاف بھڑکانے کی کوششیں ہونے لگیں۔

سیاستِ ہند اور امیر امان اللہ

۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں جب یہاں برصغیر افغان "علماء اور مشائخ" پر مظالم کی داستانیں اور امیر امان اللہ کی "اسلام دشمنی" کی داستانیں شائع ہونی شروع ہوئیں اور مسلم رائے عامہ کو امان اللہ کے خلاف متاثر کیا جانے لگا تو پنجاب خلافت کمیٹی نے ان ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" اور مہر و سالک کا "انقلاب" جو عام طور پر ملکی مسائل پر مختلف مسلکوں کے حامی تھے نے افغانستان کی صورتِ حال پر بہت حد تک یکساں ردِ عمل کا اظہار کیا اور امیر امان اللہ خاں کے خلاف تحریک کو برطانیہ کی پیدا کردہ بتایا۔ چنانچہ افغانستان میں برطانوی ریشہ دوانیوں کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور مسلم اخبار

"مدینہ" نے جب ان ریشہ دوانیوں کو بے کیا تو ایک طرف "مدینہ" سے ضمانت طلب کر لی تو دوسری طرف اس کے مدیر مولوی نورالرحمان کو ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ چنانچہ اسی موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے اپنی نظم میں کہا تھا ؎

خدا کی شان اک سقے کا بچہ
مقابل ہے محمدزائیوں کے
نہیں دیکھے پٹے کے ہاتھ اس نے
امان اللہ کے شیدائیوں کے
اسے سلامیوں سے کیا سروکار
جو ٹکڑوں پر پلے عیسائیوں کے

اب ذرا اس زمانے کے اخبارات میں پراپیگنڈہ کے انداز سے پتہ چل جائے گا۔ انقلاب اور زمیندار ان خبروں کو روزانہ بے نقاب کرتے تھے لیکن ان کی خبروں سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح سے پراپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔

۷ر جنوری ۱۹۲۹ء کو روزنامہ "انقلاب" اپنے صفحہ ۲ پر دو کالمی جلی سرخیاں دیتا ہے۔

شنواریوں کی بغاوت اور شورش کابل
اینگلو انڈین اخباروں کا ناپاک پراپیگنڈہ

تین ماہ پہلے اخباروں نے یہ وحشتناک خبر شائع کی کہ شاہ افغانستان کے بھائی عنایت اللہ خاں گرفتار کر لیے گئے ہیں اور ملا شور بازار کا بھی افغانستان کی حکومت کے خلاف بیان شائع کیا گیا لیکن زمانہ نے ثابت کیا کہ یہ اطلاعات محض غلط تھیں اور خاص نظریہ کی بنیاد پر شائع کی گئی تھیں، اس کے بعد ایک بے بنیاد خبر شائع کی گئی کہ افغانستان میں مقیم سکھوں کے لئے ہیٹ پہننا لازمی قرار دیا گیا۔ نیز یہ کہ جبراً داڑھیاں منڈوائی گئیں۔ ان باتوں کی بھی حقیقت آہستہ آہستہ تمام دنیا کو معلوم ہو گئی کہ ایسا کوئی حکم افغانستان میں موجود ہی نہیں۔

۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس نے پشاور سے خبر دی ہے:۔

"یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ اعلیٰ حضرت ان آئین وضوابط میں کچھ ترامیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جو نکات ہمایوں نے تعلیم نسواں اور تنسیخ پردہ کے متعلق جاری کئے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ امور سلطنت میں ملاؤں کو کسی حد تک اقتدار دینے پر رضا مند ہو جائیں گے۔ اور اعلیٰ حضرت غالباً اس تجویز پر سخت برہم ہوں گے کہ ملکہ معظمہ ثریا سے قطع تعلق کر لیں نیز ممدوحہ کے عزیز واقارب کو افغانستان سے جلاوطن کر دیں۔"

اس وقت بھی افغانستان کی خبروں کے لئے پشاور ہی مرکز ومنبع تھا اور آج بھی انقلاب افغانستان کیخلاف پراپیگنڈہ کا مستقل مرکز پشاور اور یہ خطہ ہی ہے اور یہاں کے حوالے سے خبریں BBC نشر کرتا ہے اور BBC کے حوالے سے ہمارے اخبارات شائع کرتے ہیں۔ تاکہ BBC کے نام سے اس کو مؤثر اور مصدقہ بنایا جائے اور عوام کو ان پر ایمان لانے کے لئے مائل کیا جا سکے۔

ہندوستان کے "فری پریس جرنل" نے ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء کو افغان باغیوں کے ۱۰ مطالبات شائع کئے تھے۔

۱۔ پچاس ارکان کی ایک مجلس قائم کی جائے جس میں اکثریت ملاؤں کی ہو باقی سرکردہ لوگ ہوں، یہ مجلس

ملکی، فوجی اور مذہبی معاملات میں اقتدار کامل رکھا کرے گی۔
۲۔ ملک میں قانون داں اور وکیل رکھے جائیں۔
۳۔ بادشاہ اور شاہی خاندان اسلامی طریقوں کی پابندی کریں۔
۴۔ طبی تعلیم کے لئے جو لڑکیاں ترکی بھیجی گئی ہیں ان کو واپس بلا لیا جائے۔
۵۔ دیوبند کے فارغ التحصیل علما کو افغانستان میں داخلہ کی اجازت ہو۔
۶۔ پردہ کی سخت پابندی کی جائے۔
۷۔ جبری بھرتی موقوف کر دی جائے۔
۸۔ عورتوں کو یورپین لباس پہننے کی ممانعت
۹۔ ملاؤں کو نقل و حرکت کی مکمل آزادی ہو۔
۱۰۔ سکرات کا استعمال واجب التعزیر قرار دیا جائے۔
۱۱۔ جمعہ کو تعطیل ہوا کرے۔
۱۲۔ طالب علموں کو شادی کرانے کی اجازت ہوا کرے۔
۱۳۔ پیروں کو نذریں چڑھانے کی ممانعت نہ ہو۔
۱۴۔ لوگ قرضہ دینے میں آزاد ہوں۔
۱۵۔ لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے۔
۱۶۔ مرد جیسا جی چاہے لباس پہنے۔
۱۷۔ رشوت ستانی کے معاملات میں راشی اور مرتشی دونوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔
۱۸۔ ملاؤں کے متعلق جتنی پابندیاں ہیں سب دور کر دی جائیں۔ اور ملاؤں کو حق حاصل ہو کہ ہر شخص کا احتساب کر کے اسے سزا دے سکیں۔

۱۱ر جنوری ۱۹۲۹ء کو امیر امان اللہ نے باغیوں کے نام اپیل جاری کی۔

میں خلوص نیت اور صمیمِ قلب سے اعلان کرتا ہوں کہ خدا واحد ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے میرے اسلامی بھائیو یاد رکھو کہ میں خدا اور رسول کی تعلیم کے مطابق تمام لوگوں کو زیور علم سے آراستہ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ توہمات کے طلسم سے رہا ہو جائیں۔ خونریزی، غارت گری اور چوری ترک کر کے دنیا کی متمدن و مہذب قوموں میں اپنے لئے ایک جگہ حاصل کر لیں، لیکن اب تم نے اپنے جاہل اور خود غرض دوستوں کی ترغیب پر علم بغاوت بلند کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنے فرزندانِ توحید کی جانیں ضائع ہوئیں۔ میں نے اپنی رعایا کی خواہش پر کبھی درانی لڑکیوں کو ترکی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا اگرچہ ان کے شوہر بھی ان کے ہمراہ گئے تھے لیکن تم نے یہ اقدام بھی پسند نہیں کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ تمہاری بغاوت سے افغانستان کو کیا نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء کو ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور پروفیسر اندر نے ایک بیان میں حکومت ہند کو ان خطرناک نتائج

سے متنبہ کیا گیا جو معاملات افغانستان میں اس کے سیاسی و فوجی مداخلت سے جو کسی طرح افغانستان کی آزادی شکست و ریخت کا باعث ہو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بیان میں یہ بھی انتباہ کیا گیا کہ ہندوستان کے وسائل و ذرائع کو استعماری مقاصد کی تکمیل و توسیع کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

اسی دن یعنی ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو انقلاب میں پشاور کے حوالے سے ایک اور خبر شائع ہوئی ہے۔ جس پر انقلاب سرخی جماتا ہے:-

کیا یہ مداخلت کے لئے بہانہ تلاش کیا جا رہا ہے

پشاور مقامی تاجروں کے وفد نے چیف کمشنر سے مل کر افغانستان کے حالات پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا کہ کابل میں ان کے آدمیوں اور مال تجارت کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔

یکم جنوری ۱۹۲۹ء روزنامہ "انقلاب" میں بمبئی کے اخبار کے حوالہ سے خبر شائع ہوئی ہے کہ اس اخبار نے حکومت برطانیہ پر الزام لگایا ہے کہ اس نے شنواریوں کو اسلحہ و بارود سے امداد دی ہے گو پشاور میں سرکاری ذرائع نے اس کی تردید کی لیکن سفارتی حلقوں میں چہ میگوئیاں جاری ہیں۔

---

۳ جنوری ۱۹۲۹ء کو "انقلاب" اپنے اداریے میں رقمطراز ہے۔

اینگلو انڈین جرائد اور بعض مشتبہ خبر رساں ایجنسیوں نے پچھلے دنوں اعلیٰ حضرت شہریار افغانستان اور ان کی مملکت کے متعلق خوفناک غلط بیانیوں اور بے سروپا دروغ بافیوں کا جو مکروہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس میں سے ایک ایک کی تردید کی جا چکی ہے اور اہل ہند کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی ذات والا چونکہ اسلام کے لئے، ایشیا کے لئے افغانستان کے لئے ہزارہا برکات و حسنات کا سرمایہ ہے۔ اس لئے من گھڑت خبریں شائع کرکے آپ کو مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی نظروں سے گرانے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔

پشاور ۱۱ جنوری ۱۹۲۹ء کو کابل کے اخبار "امان افغان" میں شہریار غازی امان اللہ کا ایک شاہی اعلان شائع ہوا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ تمام اصلاحات جدیدہ کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔

۱۔ جو افغان لڑکیاں حصول تعلیم کے لئے ترکی بھیجی گئی تھیں انہیں واپس آنے کا حکم بھیج دیا گیا ہے۔

۲۔ یورپین لباس پہننے اور عورتوں کو پردہ ہٹانے کے احکام منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔

۳۔ لڑکیوں کے مدارس اور انجمنیں توڑ دی گئی ہیں۔

۴۔ سپاہیوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ بلا حصول اجازت پیروں کے مرید بن سکیں۔

۵۔ لازمی فوجی ملازمت کے احکام منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔

اس اعلان پر دیگر علما کے علاوہ ملا شور بازار کے بھی دستخط تھے اور قاضی القضاۃ قاضی محمد اکبر کے بھی دستخط ہیں۔

روزنامہ انقلاب کا اداریہ

۱۱ اپریل ۱۹۲۹ء کو مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کے روزنامہ "انقلاب" نے ایک بہت ہی جوشیلا اداریہ

افغانستان کے حالات پر رقم کیا۔ اداریہ میں رقم طراز ہیں۔

"فتنۂ افغانستان کے آغاز سے لے کر اب تک دشمنانِ اسلام اور بعض غرضمند طبقوں کی طرف سے ہندوستان میں یہی پراپگنیڈہ کیا جاتا رہا کہ اعلیٰ حضرت شہریار غازی کے خلاف بعض بدبخت افغانی قبائل کی بغاوت کا حقیقی باعث وہ اصلاحات تھیں جو حضور نے یورپ سے واپس آنے پر ملک میں نافذ فرمائیں۔ یہ بے سروپا پراپگنیڈہ کچھ ایسی ہنرمندی سے کیا گیا کہ اعلیٰ حضرت شہریار غازی کے بعض ہمدرد بھی اس کو صحیح سمجھنے لگے اور فضائے ہند میں طرح طرح کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کسی نے کہا کہ اعلیٰ حضرت کی نافذ کردہ اصلاحات خلاف شریعت تھیں۔ اس لیے علمائے افغانستان نے آپ کے خلاف خروج کا فتویٰ دے دیا۔ کوئی کہنے لگا کہ ان اصلاحات میں کوئی بات خلاف شریعت تو نہیں لیکن چونکہ افغان ابھی پرانے فیشن کے ملاؤں کی قدامت پرستی کے جال میں بُری طرح اسیر ہیں۔ اس لیے اعلیٰ حضرت کو چاہیئے تھا کہ کسی قدر توقف فرماتے یہ محض آپ کی تعجیل کاری تھی۔ جس نے افغانوں کو آتشِ زیر پا کر دیا۔ غرض ہمدردانِ اعلیٰ حضرت غازی کی عام رائے یہی تھی کہ باغیان افغانستان نے ایک ایسے بیدار مغز و خدا پرست مسلمان بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنے آپ کو قتل کا مستوجب بنا دیا ہے، "لیکن حق یہ ہے کہ اصلاحاتِ جدیدہ کے معاملے میں اعلیٰ حضرت سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں اور ان سب سے بڑی لغزش یہ ہے کہ آپ نے زنانہ اصلاحات میں بے حد عجلت سے کام لیا۔"

لیکن قارئین انقلاب کو معلوم ہے کہ انقلاب کا مسلک آغاز کار ہی سے مندرجہ بالا مسالک اور نقطہ ہائے نگاہ سے مختلف رہا ہے ہم نے ہمیشہ یہی لکھا کہ اصلاحات جدیدہ ہرگز بغاوت کا باعث نہیں ہوئیں کیونکہ ان میں ایک بات بھی خلافِ شرع نہیں ہے اور کوئی عالم دین کسی نصِ صریح سے ان اصلاحات کا عدم جواز ثابت نہیں کر سکتا۔ ہمارے نزدیک بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ جب دشمنانِ اسلام کفار کے پٹھوؤں اور ملک و ملت کے غداروں کو اعلیٰ حضرت شہریار غازی کی روشن خیالی اور صحیح اسلام پرستی کی موجودگی اپنا اُلو سیدھا ہوتا ہوا نظر نہیں آیا تو انہوں نے آہستہ آہستہ جاہل افغانی قبائل میں وعظ و تقریر کے ذریعے سے اور رسائل و تصاویر تقسیم کر کے یہ پراپگنیڈہ کیا کہ امان اللہ خاں کافر ہو گیا ہے۔ بتوں کی پرستش کرتا ہے۔ حضور سرورِ دوجہاں ﷺ کی توہین کرتا ہے۔ اس لیے جبراً عورتوں کا پردہ اُٹھا دیا ہے، وہ ہر شخص کو زبردستی انگریزی لباس اور انگریزی ٹوپا پہناتا ہے۔ علما کی توقیر نہیں کرتا۔ اس افغان لڑکیوں کو بے پردہ غیر ممالک میں بھیج کر افغانوں کی غیرت کو صدمہ پہنچایا

چونکہ اس ناپاک پراپگینڈے کی پشت پر بعض مخفی طاقتوں کا بے اندازہ روپیہ و اثر کارفرما تھا اور بعض ملاؤں نے جنہیں اپنے حلوے مانڈے کی فکر پڑ گئی تھی اس پراپگنیڈے کی حمایت میں جاہل افغانوں کو اکسانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ پراپگنیڈہ اپنے مسموم مقاصد میں کامیاب ہوا اور اعلیٰ حضرت غازی نے صورت حالات کی نزاکت کو ملحوظ رکھ کر اور اپنی محبوب رعایا کو خونریزی سے بچانے کی خاطر تاج و تخت سے دستبرداری دے دی لیکن اس دستبرداری سے پہلے اعلیٰ حضرت نے ایک اعلان عام شائع کیا جس میں اپنی قوم کو بتایا کہ اگر تم اصلاحات ہی پر معترض ہو تو میں ان سب کو منسوخ کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں مجھ سے پرخاش نہ ہونی چاہیئے۔ اعلیٰ حضرت خوب جانتے تھے کہ اصلاحات کو محض حیلے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور دراصل باغیوں کا مطلب کچھ اور ہے

اس لیے آپ نے بطور اتمام حجت اصلاحات کی تنسیخ کا اعلان کر دیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں میں سے ایک نے بھی بغاوت ترک نہ کی اور سردار عنایت اللہ خاں کو بھی اپنا بادشاہ تسلیم نہ کیا حالانکہ سردار صاحب اپنی پابندی شریعت کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی اس اتمام حجت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ بغاوت کا باعث اصلاحات نہیں اور باغیوں نے "شریعت، شریعت" کے نعروں کو محض اپنے مخصوص اور ناپاک مقاصد کا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔

خلافت کمیٹی میں کشمکش

یہی نہیں ہوا کہ برطانوی پراپیگنڈہ اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے یہاں پر رائے عامہ متاثر کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ کچھ مسلمان لیڈروں کو بھی اس پراپیگنڈے کے ذریعے ہمنوا بنانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ برطانوی سامراج کی یہ ریشہ دوانیاں رنگ لائیں اور مرکزی خلافت کمیٹی کا ایک عنصر بھی امان اللہ کے خلاف تلوار سونت کر میدان میں آ گیا۔ لیکن سامراج دشمن خلافتیوں نے بھی ڈٹ کر امیر امان اللہ کی حمایت ہی نہیں کی بلکہ سامراج دوست خلافت لیڈروں کو بے نقاب بھی کیا، اس تمام صورت حال کا میں ذکر اپنی کتاب "پنجاب کی سیاسی تحریکیں" میں کر چکا ہوں۔ بہر حال یہاں بھی اس صورت حال کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں جب امان اللہ خاں کے خلاف پراپیگنڈہ زوروں پر تھا تو اس کی زد سب سے زیادہ پنجاب اور صوبہ سرحد پر پڑتی تھی۔ اس لئے پنجاب خلافت کمیٹی جس کے سیکرٹری جمعیۃ العلمائے ہند اور بعد میں مجلس احرار کے مشہور رہنما مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی تھے نے امان اللہ کے حق اور برطانوی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرنے کے لئے متعدد بیان دیئے اور مرکزی خلافت کمیٹی کو بھی لکھا کہ وہ اس ضمن میں قدم اٹھائے۔ چنانچہ اس پر مرکزی خلافت کمیٹی کے آفس سیکرٹری مولانا محمد عرفان نے ایک مکتوب مولانا حبیب الرحمٰن کو لکھا۔

غازی امان اللہ کے خلاف مرکزی خلافت کمیٹی کا خط

مکرم بندہ مولانا حبیب الرحمان صاحب۔ دام مجدہم

مسئلہ افغانستان میں آپ کی روش اور طریقہ کار معقول نہیں۔ ہماری ذاتی اطلاعات ہیں کہ افغانستان میں سوائے چند نوجوانوں کے ایک متنفس بھی نہیں جو شاہ امان اللہ خاں کی حکمت عملی سے موافق ہو۔ یہ مسئلہ کسی ایک گروہ کی بغاوت کا نہیں ہے بلکہ تمام عمال حکومت وزراء اور تقریباً ساری پبلک کی مخالفت کا ہے اور یہ سارا کھیل کم از کم مجھے انقلاب افغانستان سے چار ماہ پہلے معلوم تھا۔ جب علی احمد خاں بمبئی آئے تھے۔ تب ان سے سارے حالات معلوم ہو گئے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اب آئندہ افغانستان میں ضرور کوئی نہ کوئی تبدیلی ہو گی۔ بہرکیف ہماری معلومات یہ تھی کہ سردار علی خاں، جنرل نادر خاں اور دونوں بھائی سردار محمد ولی خاں۔ شیر علی خاں۔ والدہ امان اللہ خاں اس پالیسی کے موافق نہیں تھیں۔ خود انقلاب افغانستان نے بھی یہی بات ثابت کی ہے کہ فوج اور عمال حکومت موافق نہ تھے۔ ورنہ (قبیلہ) خوست کی بغاوت چند ہفتوں میں ختم کر دی جاتی۔ لیکن ایک بچہ سقہ کی بغاوت جسے ڈاکو کہا جاتا ہے۔ اتنی مؤثر اور عالمگیر ہو کہ اس کے سامنے ساری نظامی فوج ہتھیار ڈال دے اور اپنی بے چارگی کا اعلان کر دے۔ بہر حال ہماری اطلاعات افغانی سرکاری ذرائع سے یہ ہیں کہ بچہ سقہ برائے نام

ہے اور اس کی پشت پر تقریباً سارا ملک ہے۔

ایسے حالات میں جو آپ کا رویہ ہے۔ وہ بہت نامعقول ہے، اور افغانستان کے لیے تباہ کن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امان اللہ خاں سے بہتر سرزمین افغانستان کے لیے دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کو واپس لانے کی یہ بھی تدبیر نہیں کہ تمام علماء افغانستان کو گالیاں دی جائیں اور بچہ سقہ نام کا جو ایک شخص ہے اسے "کتا" اور کیا کیا کہا جائے۔ صورت یہی ہے کہ امان اللہ صاحب کو بھی سمجھایا جائے کہ ساری اصلاحات عورتوں کے ننگے بدن میں نہیں رکھی ہوئی ہیں۔ اودھر علماء اور مشائخ اور قبائل کے سرداروں کو بھی سمجھایا جائے کہ یہ چیزیں اتنی اہم نہیں ہیں کہ آپ ان کی وجہ سے (یعنی اصلاحات کی وجہ سے) ایک بہتر آدمی کو ضائع کر دیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ مرکزی خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں ورنہ ایک جگہ بیٹھ کر اگر کوئی مشورہ ہوتا تو سب ایک ہی رائے پر جمع ہو جاتے۔

(محمد عرفان)

مولانا محمد عرفان آفس سیکرٹری مرکزی خلافت کمیٹی کے اس خط کے بعد مولانا شوکت علی نے غازی امان اللہ کے خلاف اخبارات میں بیان دیا۔ مولانا شوکت علی کے بیان کے جواب میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے حسب ذیل بیان دیا۔

غازی امان اللہ خاں کے حق میں بیان

میں یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہوں کہ پنجاب کے قومی کارکنوں نے افغانستان کے معاملے میں بروقت رہنمائی کی ہے اور یہ بات میرے لیے بہت زیادہ مسرت کا باعث ہے کہ تمام ہندو پریس اور ہندو لیڈروں نے پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ شاہ امان اللہ غازی کی حمایت میں آواز بلند کی ہے۔ یہ یقین ہے کہ یہ حالات ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک مضبوط چٹان ثابت ہوں گے۔

مگر ان حالات کے ساتھ ساتھ مجھے مولانا شوکت علی کے بیان سے شدید صدمہ پہنچا۔ مولانا شوکت علی کا بیان مجمل بھی ہے اور گمراہ کن بھی، مجھے حیرت ہے کہ علی برادران کی گذشتہ پانچ سالہ زندگی صرف مسلمان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں گذری ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے جس وقت سے ترکی نے لفظ خلافت سے انکار کیا۔ تو غازی مصطفےٰ کمال کی اتنی شدید مخالفت کی جس کو ہر مسلمان نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ سلطان ابن سعود کے معاملے میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اس کی حکومت "تباہ کرنے میں دونوں بھائی ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ اب جب کہ سلطنت افغانستان کی تباہی کا فیصلہ دشمنان اسلام نے کر لیا ہے اور وہ بظاہر کسی حد تک اپنے ارادوں میں بذریعہ باغیوں کے کامیاب بھی ہیں۔ ٹھیک اس وقت مولانا شوکت علی نے ایک مفتی کے انداز میں فری پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا ہے:-

"باغی افغانستان میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلامی احکام کی عزت اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک شرعی جہاد ہے اور شاہ امان اللہ غازی اپنی بد دینی کی وجہ سے تخت سے علیحدہ کیا گیا۔"

اس بیان میں مولانا شوکت علی نے یہ بھی کہا ہے کہ میں بچہ سقہ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے خیال میں یہ

الفاظ ان کی زبان سے ہندوستان کی رائے عامہ کے خوف سے نکلے۔ ورنہ ان کے بیان کا پہلا حصہ بچہ سقہ اور اس کے معاونین کی حرف بحرف تائید کرتا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شوکت علی کے بیان کا وہ حصہ جو غازی امان اللہ کے خلاف اور باغیوں کی حمایت میں ہے۔ افغانستان میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہوگا۔ اس لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دشمنان سلطنت اسلام کی تمام طاقتوں سے زیادہ مولانا شوکت علی کا بیان شاہ امان اللہ اور سلطنت افغانستان کے لئے نقصان رساں ثابت ہوگا۔ سلطان ابن سعود کی اس لئے مخالفت کی جاتی ہے کہ اس نے شریعت کا وقار سرزمین حجاز میں دوبارہ کیوں قائم کیا اور شاہ امان اللہ کی مخالفت یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ وہ شریعت کا مخالف ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی پس وپیش نہیں کہ ہندو پریس کے بعد مسلم پریس میں سوائے اخبار زمیندار کے مسلمان اخباروں کی اکثریت شاہ امان اللہ کے بارے میں بزدلی سے کام لے رہے ہیں اور بعض بدنیت اخبار شاہ امان اللہ کے خلاف مضامین لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان مسلم حقوق کی رٹ لگانے والے مسلم اخبارات سے سختی کے ساتھ یہ سوال کریں کہ افغانستان کے معاملے میں تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا ہے۔ خدا مسلمان قوم کو اپنے دوست ودشمن کے سمجھنے کی توفیق دے۔

(حبیب الرحمان لدھیانوی)

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے مولانا شوکت علی کے بیان کے بعد حسب ذیل فتوے علمائے ہندوستان کے پاس بھیجا۔

محترم المکرم السلام علیکم

ذیل کے سوالات ارسال خدمت ہیں۔ حالات کا اقتضا ہے کہ ان کا جواب جلد از جلد ملک میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد صاف مختصر ومدلل جواب ارسال فرمائیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت شاہ امان اللہ غازی پر کفر کا فتوے لگایا گیا ہے۔ اور باغیوں کی شرعی حیثیت سے امداد کی جا رہی ہے —— جس سے —— دشمنان اسلام فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت اسلام کو برباد کر رہے ہیں۔ (حبیب الرحمٰن لدھیانوی)

سوالات

۱۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ شاہ امان اللہ غازی والیٔ افغانستان نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کی تھیں۔ کیا وہ ان کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا؟

۲۔ (الف) کیا ان اصلاحات کا اجرا شاہ امان اللہ کے خلاف بغاوت کرنے کی شرعاً اجازت دیتا ہے؟

(ب) جو جماعت ان اصلاحات کی بنا پر بغاوت کرنا چاہتی ہے۔ اس کی کسی قسم کی معاونت کرنا کسی مسلمان کے لئے شرعاً جائز ہے۔

۳۔ جو لوگ ان اصلاحات کے اجرا کی وجہ سے شاہ امان اللہ کو کافر کہتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔

۴۔ جبکہ دشمنان اسلام مختلف ذرائع سے سلطنت افغانستان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات

میں شاہ امان اللہ کی امداد کرنا ہر مسلمان پر شرعاً فرض نہیں ہے!

اب لطف یہ ہے کہ خود مفتی محمود کے بزرگوں نے اس فتوے کے جواب میں ان اصلاحات کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ شرع کے مطابق بنایا اور امان اللہ کی حمایت کو فرض قرار دیا۔ لیکن مرکزی خلافت کمیٹی اور علی برادران سے جو شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ اس پر مولانا عرفان صاحب کا غیر مطبوعہ خط اور مولانا شوکت علی صاحب کے بیان پر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بیان اپنی جگہ بہت سی تفصیلات رکھتا ہے۔ مگر ان تفصیلات پر جنرل نادر خاں کے خط مورخہ ۲۱، اگست ۱۹۲۹ء اور جنرل نادر خاں کے خط کے ساتھ شہزادہ فضل داد خان کا خط مولانا شوکت علی اور مرکزی خلافت کمیٹی کے تباہ کن اثرات پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ ان خطوط کی آمد کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے تمام ساتھی مرکزی خلافت کمیٹی سے مسئلہ افغانستان میں کسی طرح بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ شہزادہ فضل داد خان کے خط کا مضمون حسب ذیل ہے۔

از ڈیرہ اسماعیل خان

عالی جناب مخدومی و محترمی حضرت فخر الاحرار صاحب مدظلہ العالی،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

مزاج اقدس! اندریں زماں جبکہ ہر طرف حوادثات انقلابی رونما ہو رہے ہیں۔ ہندوستان و افغانستان من حیثیت سیاسیات و شوار عبور طرائق سے گذر رہے ہیں۔ ایک سلطنت کا دوسری ہمسایہ سلطنت پر اثر انداز ہونا ہر حیثیت سے ضروری ہے۔ افغانستان و سلطنت محروسہ کے برخلاف چند گمراہ و کوتاہ اندیش اشخاص نے ضرورت حال و اقتضائے زمانہ سے ناآشنا ہو کر جو گمراہ کن پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ جو نقصان امن و اصلاح ملک و سلطنت ہے۔ اس سے جناب بھی باخبر و واقف ہوں گے۔ اکابر اسلام کی متفقہ آواز کو نہایت سرد مہری و کم دانشی سے پس پشت ڈال کر بے سروپا خود ساختہ افسانے گھڑ کر دولتِ عالیہ افغانستان کے خلاف بدظن کرنے کی جو ناپاک کوشش شروع کر رکھی ہے۔ ان سب ہتھکنڈوں سے جناب والا مطلع ہوں گے۔ ان کے خلاف اعلان فرمائیں گے، جو افغانستان کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اور ہماری مدد فرمائیں گے۔" (بالکل پرائیویٹ)

نیاز مند

شہزادہ فضل داد خان

کوچہ حافظ جمال ڈیرہ اسماعیل خان

اس خط کے ساتھ حسب ذیل خط جنرل نادر خان شہید کا موصول ہوا۔ جس کا مضمون درج ہے:

"درجرائدِ عالیہ ہند و جریدہ فریدہ افغانستان علاوہ از اظہار ہمدردی و تمام معنوی و قلبی کہ برادران ہندی راجع باحوال تباہ قابل ترحم افغانستان دارند۔ میخواہند کہ باعانت مالی نیز برادران مقام

ومتاثر خود را امداد مجاہدین حریت افغانی را تقویہ نمائید، وضعیت موجودہ مجاہدین خیلے بامداد ماں برادران ہمدرد خویش احتیاج دارد، ویگانہ وسیلہ پیشرفت مجاہدین ونجات افغانستان ازیں تہلکہ وبربادی وابستہ بہ امداد است الذمن ازیں عقیدہ عالیہ وادارۂ حسنہ برادران ہندی خود اظہار ممنونیت وامتنان نمودہ امید میکنم کہ ارادۂ ذہنی خود شانرا فوری لباس علمی پوشانیدہ مت دردرسیدہ افغانستان را دریں حالت فلاکت وتباہی شان دستگیری نمائید مار

امیدوارم کہ ایں حالت زار افغانستان ہمہ ہمدردان نوع بشر را متاثر نمودہ باشد دوست معاونت خود شاں را ایں ملت مصیبت زدہ کوتاہ نخواہد فرمود، وایں ملت را برابر ہمیشہ ممنون احسان خواہد مو

محمد نادر خان سپہ سالار ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نادر خاں کو جو اس زمانے میں مقبولیت حاصل ہوئی وہ اسی بنا پر تھی ۔ وہ امان اللہ خاں کو واپس لانے کے لئے مصروف پیکار ہو رہا ہے ۔ حالانکہ اس کو درپردہ برطانیہ کی حمایت حاصل تھی ۔ لیکن چونکہ برطانیہ نے ہندوستان میں امان اللہ کی مقبولیت کا احساس کر لیا تھا اس لئے نادر خاں کو یہاں امان اللہ کے دوست کے طور پر پیش کیا گیا ۔ لیکن برطانیہ کا جو مقصد تھا کہ امان اللہ کے جو سوویت یونین سے تعلقات میں قربت اور گہرائی آرہی ہے ۔ اس کے عمل کو روکا جائے اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔

کیا آج بھی امریکہ اور برطانیہ کو اسی لئے پریشانی بنی ہے کہ ہاں ہاں کیوں افغانستان میں ایسا انقلاب ہوا ہے اور ایسے لوگ برسر اقتدار آئے ہیں جو ماسکو کے قریب ہیں ، حالانکہ سوال ماسکو کی قربت کا نہیں ہے ۔ سوال ہے عوام کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کا ظاہر ہے ۔ جب بھی عامۃ الناس کے حالات زندگی بہتر کرنے کی کوشش کی جائے گی کو جو اقلیتی گروہ مال و دولت کے وسائل سمیٹے بیٹھا ہے ۔ اس پر چوٹ پڑے گی اور وہ اور اس کے تمام عزیز و اقارب پریشان ہوں گے ۔ یہ علماء یہ مشائخ یہ مولوی جو یہاں آکے شور مچا رہے ہیں اور کچھ یہاں پر لانے بیٹھے ہوئے ہیں ۔ یہ سب وہاں کے امراء کے دوست اور انکے پروردہ ہیں اور یہ دراصل دہائی اس امر کی دے رہے ہیں کہ ہاں ہاں زمینیں کیوں چھینی جارہی ہیں ، سودی کاروبار کیوں بند ہو رہا ہے ۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ افغانستان کے امراء میں سودی کاروبار کی روایت بہت پرانی ہے ۔ یہ پاوندے جو اس پورے برصغیر میں سودی کاروبار کرتے نظر آئے ۔ یہ اسی روایت ہی کا ایک حصہ ہیں ۔ یہی وجہ تھی کہ امان اللہ نے جب اس کاروبار پر قدغن لگائی اور اس کے خلاف تحریک اٹھی تو ملاؤں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا جیسے کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ان کا اولین مطالبہ تھا کہ " لوگوں کو قرضہ دینے کی آزادی ہو " اب اس کا مطلب کیا تھا کہ قرضے کی آزادی سے مراد سود کی آزادی ہے کہ آپ جیسے چاہیں قرضہ دیں اور جتنا چاہیں وصول کریں ۔

آج کی صورت حال

یہ تاریخی مواد میں نے اس لئے یکجا کر دیا ہے کہ ہمارے عوام دیانتداری سے غور کر سکیں کہ کل

افغانی مولویوں، پیروں اور مشائخ کے ایک گروہ نے برطانوی سامراج کے اشارہ پر تحریک شروع کی تھی۔ کیونکہ وہ افغانستان کے رشتوں اور قبائلی معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے اور ان نام نہاد مولویوں، پیروں، اور مشائخ کے مفادات، قبائلی سرداروں، زمینداروں، سودخوروں اور برطانوی سامراج سے ہم آہنگ ہو گئے تھے اور انہوں نے مل کر امان اللہ کی ترقی پسند قوت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ آج پھر افغانستان میں طبقاتی رشتے بدل رہے ہیں، عوام کو زمینداروں اور قبائلی سرداروں کے ظلم و جبر سے نجات مل رہی ہے تو پھر یہ طبقات مولویوں، پیروں اور مشائخ کو لے کر میدان میں اتر آئے ہیں اور اس کے لئے پھر اسی نعرہ کو چنا گیا ہے جس کو کل چنا گیا تھا اور آج ان کو یہاں کی رجعت پسند جماعتوں اور عناصر کی حمایت حاصل ہے اور ان صفوں میں مفتی محمود کا اضافہ ہے۔ کل ان کے بزرگ سامراج دشمن صفوں میں تھے۔ لیکن آج مفتی صاحب ان صفوں میں جن کا براہ راست تعلق سامراج کی حاشیہ بردار طاقتوں سے ہے، ورنہ مفتی محمود صاحب کے لئے افغانستان کے اندر کی صورتحال جاننا کوئی مشکل کام نہیں، مثال کے طور پر افغانستان کی صورت حال پر حال ہی میں نور محمد ترکی جو افغانستان کی حکمران جماعت خلق پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور مملکت افغانستان کے سربراہ ہیں نے ایک حالیہ تقریر میں قدرے وضاحت سے اس صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"افغانستان کی حکومت اور محنت کش عوام اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے وسیع تر اقدامات کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے دشمن ہم پر الزامات لگا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ علماء اور دوسرے محب وطن کو یہ کہہ کر ڈرا رہے ہیں کہ ان کے لئے افغانستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تمام علماء اور دوسرے افراد جو ہمارے انقلاب کے خلاف اسلام کے پردے میں سازشیں نہیں کرتے۔ وہ ہمارے بھائی ہیں۔ ہم نے ان کے خلاف نہ تو پہلے ہی کچھ کہا ہے اور نہ آئندہ کچھ کہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر یہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ کوئی بھی شخص جو بیرونی سرمائے کا سہارا لے کر ہمارے انقلاب کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا اسے کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مذہب کا لبادہ اوڑھ کر انقلاب کے مفادات کے خلاف اقدامات کرتا ہے تو سامراج کا ساتھی ہے اور اسے ہم نے نہ تو پہلے ہی معاف کیا ہے اور نہ ہی اب کریں گے۔

ہمارے دل میں اسلام کے لئے بے پناہ عقیدت موجود ہے اور ہم لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کریں گے۔ تاکہ وہ بہتر طریقے سے اپنے مذہبی فرائض ادا کریں، تاکہ وہ بہتر طریقے سے اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکیں۔ یہاں مساجد موجود ہیں جن میں لوگ اذانیں دیتے اور نمازیں ادا کرتے ہیں۔ لوگ روزے رکھتے ہیں اور دوسرے تمام مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں لیکن سامراج کا کہنا ہے کہ جب تک ہم اس کے ساتھی نہیں بن جاتے اس وقت تک ہم لادین اور کافر ہیں۔ سامراجیوں کا کہنا ہے کہ افغانستان میں نہ تو مساجد ہیں اور نہ ہی لوگ نمازیں پڑھتے ہیں کیونکہ ہم فرنگی کے ساتھی اور پیروکار نہیں ہیں۔ ہمارا جواب ان کو یہ ہے کہ افغانستان کے محنت کش عوام ماضی کی طرح کسی کو بھی اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت

کرنے کی اجازت نہیں دیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سامراج نے انہیں بہت زیادہ تکلیفیں پہنچائی ہیں۔ ہم سامراجیوں اور ان کے ایجنٹوں کے الزامات کا جواب عملی اقدامات کر کے دیں گے۔ اس کے باوجود کہ افغانستان میں شرعی عدالتیں موجود ہیں اور ان کے جج شرعی احکامات کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے ہیں۔ لیکن سامراجی ابھی تک ہمارے خلاف الزامات لگانے سے نہیں چوکتے۔ لیکن میں دوبارہ کہتا ہوں کہ ان کے یہ الزامات ان کے کسی مقصد کو پورا نہیں کریں گے۔ ہماری حکومت پچھلی حکومت سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ اپریل انقلاب سے پہلے جو حکومت افغانستان میں برسرِ اقتدار تھی وہ ملک کے اندر استحصالیوں، خون چوسنے والوں اور جاگیرداروں کے مفادات کی نمائندہ تھی اور وہ اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے سامراج کے کہنے پر چلتی تھی لیکن ہماری حکومت افغانستان کے محنت کشوں اور مزدوروں کی نمائندہ ہے جو کہ ملک کی آبادی کا پچاسی فی صد ہیں ہم ان محنت کشوں کے بیٹے اور خادم ہیں۔ ہم ان سب محنت کشوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے برسرِ عمل ہیں ہم ماضی میں ان کے لئے کام کر چکے ہیں اور مستقبل میں بھی ان کے لئے کام کریں گے۔

سابقہ فیوڈل حکومت کے ادارے لوگوں کو بھوکا ننگا اور غریب رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے تاکہ وہ مصیبتوں اور مشکلات میں گھرے رہیں اور سیاست یا معاشرتی مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنے کی انہیں فرصت ہی نہ ملے لیکن ہماری حکومت کی تمام تر کوششیں اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہیں کہ افغانستان کے عوام کو خوراک بہم پہنچائی جائے انہیں تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان مہیا کئے جائیں اور وہ اچھی صحت کے مالک ہوں اور سیاسی معاملات میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ہمارے ساتھ تعاون بھی وہ سیاسی حوالے سے کریں۔ مثال کے طور پر انہیں اپنے اپنے اداروں میں یونینیں بنانی چاہئیں۔ اپنے مسائل اور مشکلات پر ہمارے اور سابقہ حکومت کے درمیان یہی فرق ہے۔ سابقہ حکومت بھوک، احتیاج، جہالت پر یقین رکھتی تھی جبکہ ہم خوشحالی، ترقی اور آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ نور محمد ترکئی نے مزید کہا کہ خلقی حکومت اس وقت بہت زیادہ کامیاب ہو گی جبکہ افغانستان میں سیاسی طور پر باشعور افراد کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا اور وہ آزاد ماحول میں حکومت سے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اور عوام مختلف نہیں ہیں بلکہ ہم باہم ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ ہماری سیاسی پالیسی ہمیشہ اس حقیقت پر مبنی رہی ہے کہ ہم نے عوام کو سیاسی شعور دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے اسی سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی ہے ہم نے عوام کے سیاسی شعور کو بلند کرنے کے لئے ذرائع ابلاغ کو ہر ممکن طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ماضی میں کسی کو اس بات کی اجازت نہ تھی۔ اس وقت ہماری فوج کو اخبارات آزاد ماحول میں پڑھنے کی آزادی نہ تھی۔ اب آپ جانتے ہیں کہ ہم نے ہر رجمنٹ کو ایک ایک ٹیلی ویژن سیٹ دیا اور ان کو مزید ٹیلی ویژن سیٹ دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہمارے افسر شعوری طور پر اور خوشی کے ساتھ اپنی عوامی حکومت کی حمایت کریں۔

نور محمد ترکئی نے کہا افغانستان میں فرمان نمبر ۶ اور فرمان نمبر ۸ نے جاگیرداری کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور فرمان نمبر ۷ نے خواتین کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب افغانستان میں ماضی کی طرح عورتوں اور لڑکیوں کو تجارتی مال نہیں سمجھا جاتا۔ اب زبردستی ماضی کی اس فرسودہ رسم کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔ فرمان نمبر ۷

نے ہمارے ادب کو بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ جس میں پہلے صرف دو دلوں کے بھڑکنے کے نوحے ہی ہوتے تھے۔ ہجر اور جدائی کے گیتوں سے ہمارا ادب پُر تھا۔ لیکن فرمان نمبر ۷ نے عورتوں کو آزادی دے کر شاعری کی بنیاد ہی بدل ڈالی ہے۔ ماضی میں ہم نے دیکھا کہ ہماری نوجوان نسل وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی تھی۔ ان کے چہرے پر جھریاں اور ان کے بال وقت سے پہلے ہی سفید ہو جاتے تھے بے شمار لڑکیاں اپنے والدین کے گھر پر ہی بوڑھی ہو جاتی تھیں کیونکہ ان کے والدین کے لئے جہیز کا بندوبست کرنے سے قاصر تھے۔ "میں یہاں بوڑھی ہو گئی ہوں اور وہ وہاں اپنے والدین کے گھر بوڑھا ہو گیا ہے۔" یہ ہوتا تھا جواب جو اکثر ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس وقت دیتے تھے۔ جب ان سے ان کی شادی کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا کیونکہ ان کے والدین جہیز کا انتظام نہیں کر سکتے تھے لیکن فرمان نمبر ۷ کے اجرا نے جو کہ موجودہ عوامی حکومت نے جاری کیا ہے۔ اس چیز کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب ہمارے چالیس لاکھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مکمل طور پر آزاد ہیں اور یہ سب کچھ اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ شریعت کہتی ہے کہ نوجوان آزادانہ طور پر اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر سکتے ہیں۔

ماضی میں ہر کوئی ہمارے عوام کو دھوکہ دیتا تھا۔ مثال کے طور پر کئی سال پہلے کا ذکر ہے کہ کچھ لوگوں نے یہاں اجارہ دارانہ تجارت کا آغاز کیا۔ اس وقت کی حکومت کی حمایت انہیں حاصل تھی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ سرمایہ اکٹھا کرنے کے بعد یہاں افغانستان میں بھاری اور ہلکی صنعتیں لگائیں گے۔ وہ اس قسم کی بہت سی اور باتیں بناتے رہے۔ ان کی اجارہ دارانہ تجارت کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص باہر سے کچھ نہیں منگوا سکتا تھا۔ انہوں نے درآمد شدہ مال کو اپنی من مانی قیمتوں پر بیچا اور اپنے مذکورہ بالا وعدے پر بے پناہ دولت سمیٹی اور اس وقت کی ظاہر اور داؤد کی حکومت نے بھی اپنا حصہ اس دولت سے وصول کر لیا اور صنعتیں لگانے کا منصوبہ اور وعدہ تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ ہم نے تمام ایسی باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہم افغانستان کے عوام سے عہد کرتے ہیں کہ اب اس قسم کی سازشیں نہیں ہو سکیں گی اور ماضی میں جو کچھ نقصان ہو چکا ہے۔ اس کی تلافی کی جائیگی

اپریل انقلاب نے افغانستان میں بسنے والی قومیتوں کو حقیقی آزادی بخشی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اپریل انقلاب سے پہلے چھوٹی قومیتوں کے کوئی حقوق نہ تھے اور حکمرانوں نے دوسری قومیتوں کے حقوق پر بھی ڈاکہ ڈالا ہوا تھا لیکن موجودہ حکومت نے افغانستان کی تمام قومیتوں (بلوچی، نورستانی، ترکمانی، افغانی تاجک، ہزارہ وغیرہ) کو ان کے تمام حقوق دے دیئے ہیں۔ انہیں اپنا کلچر، ادب اور آرٹ کی ترقی دینے کی مکمل آزادی ہے اور ہم ان کی ترقی کے لئے تمام کوششیں کریں گے۔ ہم نے ان کی زبانوں میں کتابیں اور لٹریچر چھاپنے کے لئے ہر ممکن سہولتیں فراہم کی ہیں تاکہ سب قومیتوں کے عوام تک سائنس اور علم جا سکے اور ان کا طبقاتی اور سیاسی شعور بلند ہو سکے۔"

پشتو نظم

میرے چون غر، دلبر!

سلیمان لائق
احمد سلیم

سلیمان لائق افغانستان کے ممتاز پشتون شاعر، مورّخ اور نئی انقلابی حکومت کے ریڈیو اور ٹی وی کے وزیر ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "یاد ونہ او دردمند ونہ" کے نام سے انقلاب کے فوراً بعد چھپا تھا۔ زیرِ نظر نظم اس کے بعد کی ہے۔

میرے چون غر، دلبر!
اپنے پھیلے درّوں میں
میرے گرم نعروں کا
تونے زور دیکھا ہے؟
اور چشمِ محنت میں
جاگتی تمنّا کا
تونے شور دیکھا ہے؟

تونے اور دیکھا ہے؟
مردہ پھول کے اندر
جو ہنسی تھی محوِ خواب
کھلکھلا اٹھی کیسے؟
اور جہاں کی آنکھوں میں
آب اپنی تیغوں کی
جگمگا اٹھی کیسے؟

آسمان پر تونے
جگمگاتے تاروں کو
یوں اترتے دیکھا ہے
جیسے پھول پر شبنم
نرم پاؤں دھرتی ہے

تُونے آج دیکھا ہے
کانپتے پہاڑوں کو
اور سرکتے درّوں کو
بھاگ اُٹھتے ریچھوں کو
اور اُچھلتے بھیڑوں کو

تونے آج دیکھا ہے
آسماں کو غرّاتے
بادلوں کو اِٹھلاتے
جھومتا ہوا سیلاب
لہلہاتی موجِ آب
دیس کے جیالوں کو
گر کے اُٹھتے لوگوں کو

تونے آج دیکھا ہے
کیسے مسکراتے ہیں
وہ جو اپنے ہوتے ہیں
اور غنیم روتے ہیں
پیش خیمہ ہیں یہ سب
آنے والے طوفاں کا
دیس کے دکھی دل میں
سرخ زیست کی صبحوں
کا نشاں ہیں یہ سارے
ان بلندیوں سے اب
بجلیوں کے لشکارے
اس زمیں پہ اُتریں گے
اور وطن کے ہونٹوں سے
لال گیت اُبھریں گے
اپنی سرخ غیرت پر
آج ناز کرنے کو
سارے لوگ لپکیں گے
اُن کے ہر بُنِ مُو سے
زندگی جنم لے گی

جن پہاڑی کانٹوں کے
میں نے گیت گائے تھے
آج گُل کھلے اُن پر
میرے چون غر، دلبر!
اب تو زندگانی کا
ساز گرم کر، دلبر!
تیرے لوگ، تیرے در
جاگ اُٹھے بشر، دلبر!
میرے چون غر، دلبر!

ل چون غر — کوہِ چون، افغانستان کا ایک پہاڑ

سوہن سنگھ جوش
احمد سلیم

پنجابی نظم

افغانستان

محنت کے پسینے کی کرامات
پتھروں میں سے پھوٹ پڑی بہار
پھول کھلنے لگے رنگ رنگ کے
خوشبو سے فضائیں بھر گئیں
کھل اٹھا گلزار ....

صدیوں کسے جکڑے ہوئے پرندوں نے
اپنے پنجرے توڑ کر
صیاد کو زمین پر گرا کر،
ایک ہی جھٹکے میں
آزادی حاصل کرلی
وہ رسیلی زبان کے سروں میں ——
آزادی کے گیت گانے لگے
جگنوؤں سے مشعلیں لے کر
اڑنے لگے آسمانوں میں
دھرتی کے اندھیرے سے چھٹکارا پانے کے گیت گاتے ہوئے،


چیتھڑے لٹکے برہنہ پا چرواہے
بھیڑوں بکریوں کو چرانے والے
روٹی کے دو ٹکڑوں کے لئے
خان صاحبوں کا جبر سہتے ہوئے
صدیوں کی نیند سے بیدار ہوئے

اور سوار ہو گئے حاکموں کی چھاتیوں پر
صدیوں کا بدلہ چکانے کے لئے
جگ پلٹ پڑا
سب کچھ تہ و بالا ہو گیا
خان صاحبوں کے گھروں میں بھگدڑ مچ گئی ــــــ
سوگ، آہیں، آنسو
چوکھٹ پکڑ کر بیٹھے
جو سہاگ لوٹتے تھے
ان کے اپنے سہاگ لٹ گئے
انہیں جان کے لالے پڑ گئے
وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگے
برتن، سامان، گھر بار......
حاکم شاہی کے ارد گرد
دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں
محنت کے پسینے کے چھینٹے
کہیں اس طرف نہ آ گریں

یہ نئی کرامت
کہیں اوپر سے نہیں اتری
اسے دھرتی کے بیٹوں نے،
تخلیق کیا ہے

تخلیق جاگ پڑی
غیرت ہوش مند ہو گئی
ختم ہو چکی راج شاہی کی
کالی بھیانک رات
لوک راج کا سورج طلوع ہوا

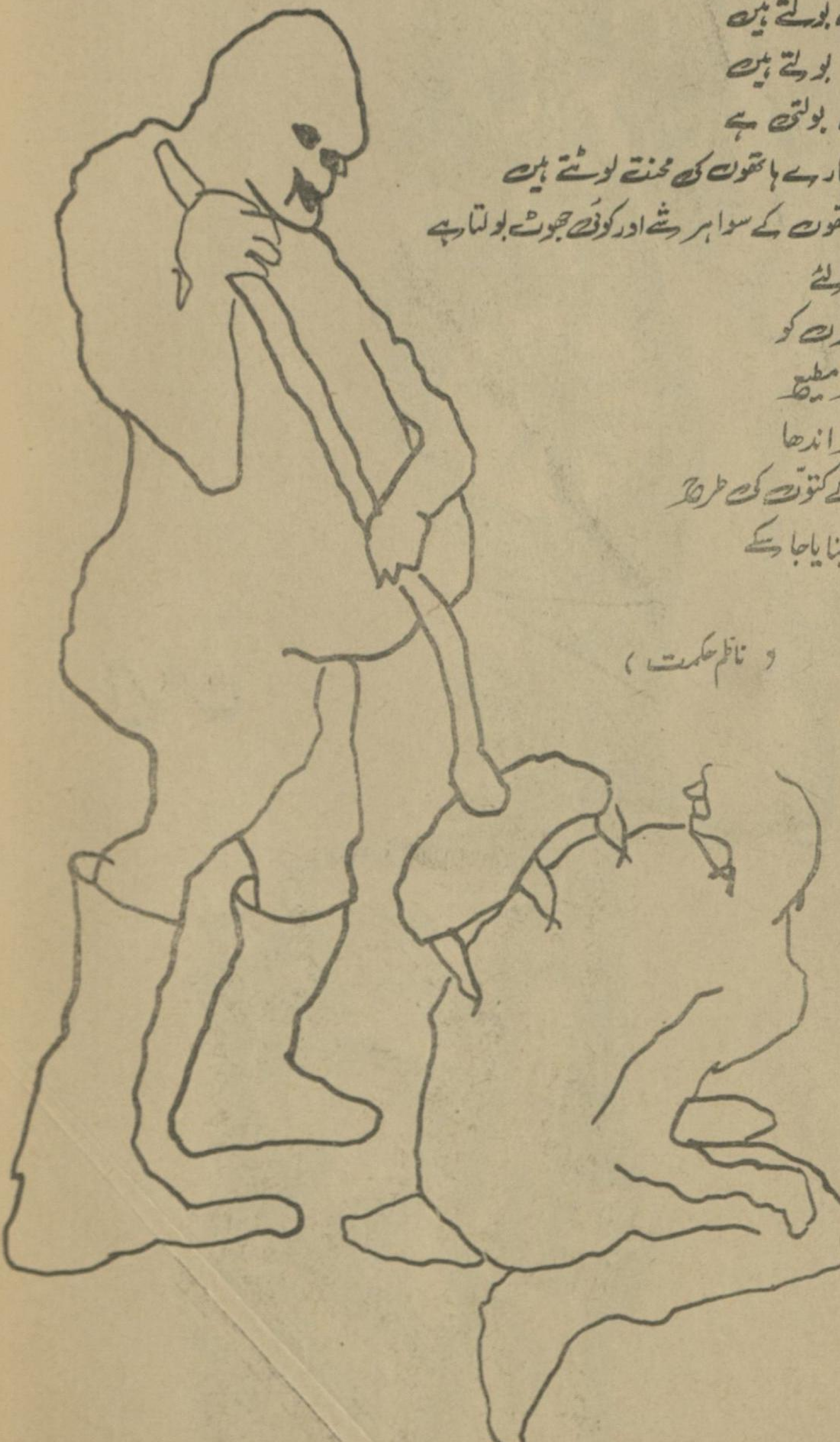
چہچاہٹ اور خوشبو کا سفید دن
افغانی آج آزاد ہو گئے
محنت کے پسینے کی یہ ایک کرامت ہے



ایران

"اگر الفاظ جھوٹ بولتے ہیں
اگر رنگ جھوٹ بولتے ہیں
اگر آواز جھوٹ بولتی ہے
اگر وہ سب جو تمہارے ہاتھوں کی محنت لوٹتے ہیں
اور تمہارے ہاتھوں کے سوا ہر شے اور کوئی جھوٹ بولتا ہے
تو یہ سب اس لئے
کہ تمہارے ہاتھوں کو
مٹی کی طرح مطیع
تاریکی کی طرح اندھا
اور چرواہے کے کتوں کی طرح
احمق اور گونگا بنایا جا سکے

(ناظم حکمت)



عبداللہ ملک

ایران کا انقلاب

ایران میں جو انقلاب آیا ہے وہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے گا۔ اس کے متعلق حتمی طور پر شاید ابھی کچھ نہ کہا جا سکے لیکن ایک بات مسلّمہ اور واضح ہے کہ اس انقلاب نے سامراج کے ایک بہت ہی اہم قلعہ کو مسمار کر دیا ہے اور آج امریکی سامراج کو ویت نام کے بعد دوسری اہم شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس سے یقینی طور پر عالمی سطح پر سامراج نواز اور سامراج دشمن طاقتوں میں توازن میں نمایاں تبدیلی ہوگئی ہے۔ امریکہ اور اس کے دوست گھبرا گئے ہیں اور قومی آزادی کی تحریکوں کو زبردست تقویت ملی ہے۔ ایران کی شہنشاہیت اور آمریت کے خلاف اس قومی اور جمہوری انقلاب میں مختلف عناصر نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔

اس انقلاب کی کامیابی میں ایک طرف شیعہ علماء نے آیت اللہ روح اللہ خمینی کی قیادت میں حصہ لیا ہے۔ دوسرا عنصر ایران کی کمیونسٹ پارٹی جو تودے پارٹی کے نام سے موسوم ہے کا تھا۔

اس انقلاب کی جدوجہد کے دوران ایرانی کمیونسٹ پارٹی کے مختلف عہدے داروں نے عالمی کمیونسٹ جرائد اور مغربی رسائل کو جو انٹرویو دیئے ہم ان کو شائع کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ایرانی انقلاب کی صحیح ماہیت سمجھنے میں مدد ملے۔ کیونکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فوجی اختیارات ہوں یا پھر ہمارے ہاں کے اخبارات اور حکام ایران کے اس پورے انقلاب کو صرف ایک مذہبی اور دینی انقلاب کا نام دے رہے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے کہ دنیا بھر کے اور ہمارے عوام کے سامنے اس انقلاب کے سامراج دشمن پہلو، اقتصادی مطالبات اور سماجی انصاف کے جذبات سامنے نہ آئیں۔ یہ بھی ان کو پتہ نہ چلے کہ آخر فوج کے جرنیل عوامی غیظ وغضب کا نشانہ کیوں بن رہے۔ کیا وہ مسلمان نہ تھے، خفیہ پولیس کے سربراہ گولیاں سے کیوں اڑائے جا رہے ہیں۔ یہ بھی تو مسلمان تھے، خدا اور رسول پر اعتقاد رکھتے تھے، تو پھر اس کا مطلب کیا ہوا؟ کہ اسلام بھی دو ہیں ایک ظالم کا اسلام ہے اور ایک مظلوم کا اسلام ہے اور ان کے درمیان عالمی سطح پر بھی اور مسلم ممالک کے اندر بھی طبقاتی کشمکش جاری و ساری ہے۔

اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایرانی انقلاب کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے اور جانا جائے کہ وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے بیسویں صدی کے آٹھویں دہائی کی سب سے زبردست

عوامی تحریک کو جنم دیا۔

یہ انٹرویو اور مضامین پچھلے سال ستمبر اور نومبر اور جنوری ۱۹۷۹ء میں رقم ہوئی تھے، ان میں تحریک کے مختلف پہلوؤں پر کمیونسٹ پارٹی کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ پہلا انٹرویو ستمبر ۱۹۷۸ء میں دیا گیا تھا

سوال:۔ آپ ایران میں موجودہ عوامی تحریک کے کردار پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ تحریک جو ستمبر کے شروع میں ایرانی حکومت کے ساتھ کھلم کھلا متصادم ہو رہی تھی؟

جواب:۔ پچھلے چند مہینوں سے ایران کے اندر شہنشاہ کی آمریت کے خلاف تحریک بہت تیزی سے زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ہماری پارٹی کے لئے یہ کوئی حیران کن واقعہ نہیں ہے۔ ہماری پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے تین سال پہلے اپنے ایک اجلاس میں اس صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا اور ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ایران کے اندر جمہوری اور قومی تحریک بہت تیزی سے ابھرنے والی ہے۔ کیونکہ اس وقت صنعتی اداروں میں ہڑتالیں، طلباء میں بے چینی، دانشوروں کا اضطراب اور خود قومی سرمایہ داروں میں بڑھتی ہوئی بے چینی سب ایک نئے دور کی نشاندہی کرنے لگے تھے۔

یہ درست ہے کہ کوئی بھی اس وقت واضح طور پر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ تحریک ایک خاص موقع پر کیا رنگ روپ اختیار کرے گی۔ اگر یہ تحریک اس وقت مذہبی رجحانات کا اظہار کرتی ہے تو اس کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ایران کے شیعہ مذہبی رہنما جو نچلے اور درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اپنے ملک کی صورت حال اور عوام کی زبوں حالی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے اور یہ عوام کو آمریت کے خلاف احتجاج کے لئے ابھارنے پر مجبور تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایران کے اندر مختلف عناصر آمریت کے خلاف احتجاجی تحریک میں بے ساختہ اور خود رو انداز میں متحد ہو گئے ہیں۔

ہمارا تجزیہ ہے کہ موجودہ تحریک ایک مقبولِ عام جمہوری اور انقلابی تحریک ہے۔ اس تحریک کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں عوام کے مختلف طبقے بالخصوص محنت کش، درمیانہ اور خود سرمایہ دار طبقے کے کچھ عناصر بھی اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ مظاہروں میں شریک ہو رہے ہیں۔ یہ تحریک جمہوری اس لئے ہے کہ اس تحریک کا سب سے اہم مطالبہ جمہوری حکومت کا قیام ہے۔ یہ انقلابی اس لئے ہے کہ اس تحریک کا مقصد سماج میں انقلابی تبدیلیاں لانا ہیں اور یہ انقلابی تبدیلیاں عوام خود لانا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی رہنمائی کوئی جماعت نہیں کر رہی ہے جسے تحریک سے پہلے اس مقصد کے لئے وجود میں لایا گیا ہو بلکہ عوام کے صبر کا پیمانہ اس حد تک لبریز ہو گیا تھا کہ عوام کے مختلف طبقوں نے شہنشاہ کے خلاف جدوجہد میں شرکت پر آمادگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس میں ہر اس شخص نے شرکت کی جو جمہوریت کا خواہاں تھا اور حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے جو سماجی ظلم ہو رہا تھا۔ اس کے خاتمے کا خواہشمند تھا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایرانی جو تیل سے اربوں ڈالر کما رہا تھا۔ اس کمائی نے امیر اور غریب کے درمیان خلیج کو پاٹنے کی بجائے اور وسیع کیا ہے۔ یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ اس مختصر گروہ نے جو ایران پر حکومت کر رہا تھا اور جو سامراجی اجارہ داریوں سے وابستہ تھا۔ ایران کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں عوام، محنت کش عوام دن بدن غریب اور نادار ہو رہے تھے۔ بیروزگاری بڑھ رہی تھی، کسان اور دستکار تباہ ہو رہے تھے۔ رشوت ستانی روزمرہ کا معمول تھا ظلم و تشدد

کا دور دورہ تھا اور قانون کی کسی کو پرواہ نہ تھی اور حکمرانوں کی دھاندلیاں ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ ان سب نے مل کر اس بے چینی کو جنم دیا جو ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ جس میں مختلف نظریات کے حامل عناصر، مختلف طبقے اور ان کی مختلف جماعتیں شریک ہیں۔

حکومت کو ملک کے اندر صرف فوج اور پولیس کی حمایت حاصل ہے اور جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس فوج کی قیادت امریکی مشیر کرتے ہیں اور ان کی مجموعی تعداد ۴۰ ہزار ہے اور ان پر ایران کو سالانہ ایک ارب ڈالر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ فوج اور پولیس ہی تھی جس نے عوام کا بے پناہ خون بہایا ہے۔ اس میں ۸ ستمبر کا واقعہ بھی شامل ہے جس میں سرکاری بیان کے مطابق کوئی ایک سو ایرانی شہید ہوئے لیکن غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دو تین ہزار سے بھی زائد تھی۔ ان اشتعال انگیزیوں کے باوجود عوام پُرامن مظاہرے کرتے رہے ہیں۔ اگر عوام نے مورچے بنائے ہیں تو یہ اقدام عوام نے اپنے دفاع کے لئے کئے ہیں۔ بہرحال اس امر کے امکانات موجود ہیں کہ حکومت کو فوج کی حمایت زیادہ دنوں تک حاصل نہیں رہے گی۔ ایسے واقعات ابھی سے دیکھنے میں آ رہے ہیں جب افسروں اور فوجیوں نے عوام پر گولی چلانے سے انکار کیا ہے۔

سوال:۔ سرمایہ دار ممالک کے اخبارات اور ذرائع ابلاغ اس موجودہ تحریک کو ایک ایسی رجعت پسند تحریک قرار دے رہے ہیں جو شہنشاہ کی ایران کو ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے خلاف منظم کی جا رہی ہے جس کی رہنمائی دقیانوسی ملّا کر رہے ہیں جو ایران کو "خالص اسلام" کے دور میں واپس لے جانا چاہتے ہیں اور یہ عناصر شہنشاہ کی نافذ کردہ ان تمام اصلاحات کو کالعدم کرنا چاہتے ہیں جن کے ذریعے شہنشاہ نے ایران کو ازمنۂ وسطیٰ سے نکال کر دورِ جدید میں داخل کر دیا تھا۔ آپ کا اس ضمن میں کیا نقطۂ نظر ہے؟

جواب:۔ موجودہ تحریک کے مذہبی پہلوؤں کا جہاں تک تعلق ہے ایک بات یاد رکھنی چاہئیے اور میں اس پر اصرار کرتا ہوں کہ شیعہ علماء کو ایسی طاقت نہیں سمجھنا چاہئیے جو موجودہ دور اور اس کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر ملک کو ازمنۂ وسطیٰ میں لے جانا چاہتے ہوں۔ حقیقت میں ان کی روّیہ اور مؤقف بہت حد تک عوام کی خواہشات اور تمناؤں کی ترجمانی کرتا ہے اور اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئیے اور اس کو قابلِ تحسین سمجھنا چاہئیے کہ آج کی یہ مذہبی تحریک ایران کے قومی اور جمہوری عناصر کو منظم اور متحرک کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے اور میں تحریک کے سامراج دشمن اور آمریت مخالف پہلوؤں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ہماری پارٹی عوام کی پارٹی ہے، اس نے ہمیشہ مذہبی اعتقادات کا احترام کیا ہے۔ ایران کے عوام کی بہت بھاری اکثریت میں ان مذہبی اعتقادات کی جڑیں کافی گہری ہیں اور ہماری پارٹی ایک جمہوری پارٹی ہے۔ اس لئے ہم تمام جمہوری عناصر جن میں مذہبی اور دینی عناصر شامل ہیں سے اتحاد کے خواہاں ہیں۔ جب خمینی جیسے مذہبی رہنما یہ اعلان کرتے ہیں کہ شہنشاہ کی حکومت عوام دشمن ہے، غیر اسلامی ہے۔ اس لئے اس حکومت کو الٹ دینا چاہئیے تو ہم اس اعلان کو ایک مثبت اور واضح اعلان تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئیے کہ ہم ان علماء کے تمام نکات سے متفق ہیں لیکن انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہئیے۔ اگر تو یہ علماء خالصتاً مذہبی حکومت قائم کرنا چاہیں گے، تو پھر معاملات دوسرا رُخ اختیار کریں گے۔ لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے ایران

کے مذہبی علماء نے کبھی ایسی حکومت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اگر شریعت مدار ہی ۱۹۰۶ء کے آئین کے نفاذ کی بات کرتے ہیں تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۰۶ء کا آئین کافی حد تک جمہوری آئین تھا اور اسی لئے شاہ نے اس میں ترمیم کر کے تمام اختیارات خود سنبھال لئے تھے۔ اسی لئے ۱۹۰۶ء کے آئین کی طرف رجوع کسی صورت بھی رجعت پسند اقدام نہیں کہا جا سکتا۔

حال کے سالوں میں شہنشاہ اور اس کی حکومت نے حکومت مخالف تحریک کی پوری ذمہ داری "اسلامی مارکسسٹوں" پر ڈال دی ہے، انہوں نے "اسلامی مارکسسٹ" کی یہ ترکیب وضع ہی اس لئے کی ہے تاکہ شہنشاہ مخالف تحریک میں پھوٹ ڈالی جا سکے اور ایک طرف مذہبی عناصر کو مارکسسٹوں سے تعاون کرنے کا الزام دے کر مشتعل کیا جائے اور دوسری طرف مارکسسٹوں کو کٹھ ملاؤں کا ساتھی قرار دے کر ان کی صفوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ کیونکہ شہنشاہ اس کی حکومت اور اس کی خفیہ پولیس مسلسل اس امر پہ اصرار کر رہے ہیں کہ مذہبی تحریک اور تودے پارٹی ایک دوسرے سے تعاون نہیں کر سکتے کیونکہ مارکسزم اور اسلام کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ یہ واقعہ ہے کہ سرکاری طور پر ہمارا ایک دوسرے سے کوئی اتحاد اور تعاون طے نہیں پایا۔ لیکن ہم دونوں شہنشاہ کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں لیکن شہنشاہ اور اس پراپیگنڈہ کا مقصد کمیونسٹوں اور ان کی پارٹی کے وقار اور مقبولیت کو نقصان پہنچانا ہے۔

اگر موجودہ تحریک جو حکومت کے خلاف چلائی جا رہی ہے صرف مذہبی تحریک ہوتی تو شہنشاہ بڑی آسانی سے مذہبی مطالبات تسلیم کر کے اس عوامی اضطراب اور ہیجان کو مطمئن کر سکتا تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے یہ ایک سیاسی تحریک ہے جس کے سیاسی مطالبات ہیں اور جن کی پشت پر پورے عوام ہیں اور سب سے بڑا مطالبہ تو شہنشاہیت کو ختم کرنا اور ایک جمہوری حکومت کا قیام ہے۔

سوال :۔ اور کون سے عناصر شہنشاہ اور اس کی حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں ؟

جواب :۔ ان عناصر میں سر فہرست تو نیشنل فرنٹ ہے جو مختلف سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ ہے اور ان کا موقف قومی اور جمہوری ہے۔ ان میں شریک عناصر ڈاکٹر مصدق کے پیروکار ہیں۔ اس نیشنل فرنٹ کے تمام شرکاء شہنشاہ کی آمریت کے مخالف ہیں۔ یہ جمہوری آزادیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ حق بالغ رائے دہندگان کی بنیاد پر چنی جانے والی آئین ساز اسمبلی کا بھی مطالبہ کرتے ہیں اور آزادانہ انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی جمہوری حکومت کے لئے بھی آواز اٹھا رہے ہیں۔ گو وہ سرکاری طور پر شہنشاہیت کے خاتمے کا مطالبہ نہیں کرتے لیکن ان کے مطالبات کا نتیجہ ہی نکلتا ہے۔ یہ نیشنل فرنٹ کے عناصر تیل کی پیداوار پر بھی پابندیوں کے حامی ہیں تاکہ ملک کے وسائل کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔ سماجی طور پر یہ عناصر پیٹی بورژوا یعنی نیم سرمایہ دار طبقہ پر مشتمل ہیں۔ نیشنل فرنٹ کا دانشوروں اور طلباء میں خاصا اثر ہے۔

اس کے علاوہ شاہ کی مخالف صفوں میں رجعت پسند عناصر بھی ہیں جو شاہ کی حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں یہ امریکہ کے حامی سیاست داں ہیں۔ یہ موجودہ بحران کا ایسا حل چاہتے ہیں جس سے امریکہ، برطانیہ اور اجارہ دار کمپنیوں کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ سوویت روس مخالف اور کمیونسٹ دشمن موقف اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا نمائندہ علی امینی ہے جو وزیر اعظم بھی رہ چکا ہے اور

امریکہ جس کا زبردست حامی ہے۔

سوال :۔ شہنشاہ کی حکومت کو کونسی بیرونی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے ؟

جواب :۔ اس ضمن میں سرِفہرست تو امریکی سامراج ہے ۔ امریکی سامراج کے لئے ایران کو زبردست

اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ امریکہ کو تیل مہیا کرنے والا اہم ملک ہے بلکہ وہ سوویت یونین کی سرحدوں پر واقع ہے ۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی کہ ۸ ستمبر ۱۹۷۸ء کے قتل عام کے بعد امریکی صدر مسٹر جمی کارٹر نے شہنشاہ سے ٹیلی فون پر اس وقت ہمدردی کا اظہار کیا اور امداد کا یقین دلایا ۔ جب وہ کیمپ ڈیوڈ میں صدر سادات اور اسرائیلی وزیر اعظم بیگن کے درمیان کانفرنس کی صدارت کر رہا تھا اور اسی سے امریکی وزارتِ خارجہ نے طنزیہ انداز میں اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ ایران میں شورش پر بہت نرمی اور انسانیت کے ساتھ قابو پایا جا رہا ہے ۔ اس طرح سے ایران کے واقعات نے کارٹر انتظامیہ کے 'انسانی حقوق' کی پُرزور اور پُرشور مہم کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے ۔ گو ہماری پارٹی اور نیشنل فرنٹ پر تو اس مہم کی اصل غرض و غایت پہلے بھی واضح تھی ۔ لیکن اب ایران کے رجعت پسند حلقے جو پہلے کارٹر انتظامیہ پر تکیہ کئے ہوئے تھے بھی مایوس ہو گئے ہیں ۔ اب ہر ذی ہوش پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ کارٹر انتظامیہ ایران کے بارے میں اپنے مؤقف سے سرِ مو انحراف نہیں کرنا چاہتی ۔ اس لئے امریکہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایران کی حکومت کے خلاف نفرت عوام کے تمام طبقات میں سرایت کر چکی ہے ۔ امریکہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ اسے ایران میں کوئی ایسا سہارا مل جائے جو اس شورش کو دبا سکے لیکن اس کو کوئی ایسا سہارا نہیں مل رہا ۔ لہٰذا اسے ان سطحی تبدیلیوں پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے جو شریف امامی کی حکومت لانے کی کوشش کر رہی ہے ۔

اسرائیل کی حکومت بھی شہنشاہ کی حکومت کو پوری پوری امداد دے رہی ہے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس شہنشاہی آمریت کو ایک اور پشت پناہی بھی حاصل ہے اور وہ ہے موجودہ چینی قیادت ! ۸ ستمبر کے قتلِ عام کے بعد پیکنگ کی طرف سے شہنشاہ کے خلاف تحریک پر الزام لگایا گیا جو تہران کے اخبارات میں شائع ہوا کہ یہ تحریک بیرونی عناصر کی شہ پر اور بیرونی سرمائے سے چلائی جا رہی ہے ۔ لیکن اس سے بھی پہلے چینی قائد ہوکوافینگ نے تہران کا دورہ کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی ہو گئی تھی کہ عوامی جمہوریہ چین کے قائدین اور امریکی سامراج کے درمیان ایک شرمناک معاہدہ طے پا چکا ہے اور دنیا کے ترقی پسند عناصر جو کبھی چین کے انقلاب سے بے حد متاثر ہوئے تھے ۔ ان کی نگاہوں میں چینی قیادت کی ساکھ ختم ہونے لگی تھی اور افریقہ کی آزادی کی تحریکوں اور چلی کے بارے میں اس قیادت کے رویّے نے چینی قیادت کو امریکی سامراج کا تتمہ بنا دیا تھا ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایرانی عوام نے چین کی موجودہ قیادت کے اصل روپ کو اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا ہے اور اب ماؤ پرستوں کا تمام پراپیگنڈہ بے اثر ہوتا جا رہا ہے ۔ یہ ماؤ پرست اٹھتے بیٹھتے ہماری پارٹی کو ترمیم پسندی کے طعنے دیا کرتے تھے ۔ اب ہر ایرانی نے اپنے تجربے سے جان لیا ہے کہ کون ترمیم ہے اور کون سامراج کا دوست ہے اور کون پارٹی عوام کی آزادی کے لئے سر بکف جہاد میں مصروف ہے ۔

حمید سفری
سیکرٹری ایرانی کمیونسٹ پارٹی

انقلاب اور جمہوریت کا احیاء

ایران میں عوامی تحریک نے جن حالات کو جنم دیا ہے اس کا تجزیہ ہماری پارٹی نے اپنے پہلے مضمون میں کر دیا تھا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء کے وسط میں کامریڈ سکندری نے اس تجزیے کے بارے میں سوالات کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد حالات نے نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔ زبردست رجعت پسند اور آمرانہ حکومت کی مسلسل متشددانہ پالیسیوں نے ایسے سماجی و اقتصادی حالات کو جنم دیا تھا۔ جنہوں نے اس جمہوری تحریک میں ایسے عناصر کو شامل ہونے پر ابھارا ہے۔ جن کا کبھی اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور پچھلے ۲۵ برس میں ایسی ہمہ گیر تحریک کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

شہنشاہ اور اس کی حکومت پچھلے دس پندرہ سال سے اپنی اقتصادی اصلاحات کا زبردست پراپیگنڈہ کرتی رہی ہے اور دنیا بھر کا سرمایہ دار پریس اس کو "سفید انقلاب" سے بھی موسوم کرتا رہا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان اصلاحات اور اس اقتصادی ریل پیل سے صرف ایک حقیر سی اقلیت کو فائدہ پہنچا ہے۔ جبکہ عوام کی بھاری اکثریت کے حالاتِ زندگی بد سے بدتر ہوئے ہیں اور ان کا سب سے بڑا ثبوت زرعی اصلاحات سے پیدا ہونے والی صورتِ حال ہے حالانکہ یہی زرعی اصلاحات اس "سفید انقلاب" کی اساس متصور ہوتی ہیں۔

ان زرعی اصلاحات کا اصل مقصد دیہات میں جہاں نیم فیوڈل پیداواری رشتے موجود تھے وہاں سرمایہ داری کو فروغ دینا تھا اور اس طرح سے شہنشاہ کی حکومت کے پشت پناہ طبقوں میں تھوڑی سی ترمیم مقصود تھی۔ ان اصلاحات کا مقصد بڑے بڑے قطعاتِ اراضی کو ختم کرنا ہی تھا اور نہ ہی ان کو غریب اور بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنا مقصود تھا۔ آج تک کے دن تک کسانوں کی اکثریت یا تو زمین سے بالکل محروم ہے اور یا پھر بہت چھوٹے غیر اقتصادی قطعاتِ اراضی ان کے پاس ہیں۔ مگر اس کے مقابلے میں شہنشاہ، اس کے خاندان فوج اور پولیس کے اعلیٰ افسران، افسر شاہی اور گماشتہ سرمایہ داروں کے پاس اب تک بڑے بڑے قطعاتِ اراضی ہیں۔ ان سرمایہ دارانہ نوعیت کی زرعی اصلاحات کے کتنے مہلک نتائج نکلے ہیں ان کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر ۵ لاکھ کسان ہر سال دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی پر مجبور ہو رہے تھے اور اس طرح سے ایران کی زراعت ایک مسلسل بحرانی کا شکار رہی ہے۔ ۶۵ ہزار دیہات بالکل تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔ فی ایکڑ پیداوار میں اضافے کی بجائے کمی آ رہی ہے اور ایک ملک جو کبھی اپنی زرعی اجناس برآمد کرتا ہے۔ اب وہ گندم، چاول، گوشت وغیرہ درآمد کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

ایران کی سب سے بڑی دولت تیل ہے۔ لیکن اس دولت کو نہ تو ایران کی اقتصادی پسماندگی ختم کرنے، نہ سامراجی ممالک پر انحصار کے خاتمہ کے لئے اور نہ ہی عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ ایران

کا شمار سرمایہ دار ممالک کو تیل برآمد کرنے والے جو ممالک ہیں ان میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ پہلا نمبر سعودی عرب کا ہے۔ ایران اپنی تیل کی برآمد سے ۲۰ ارب بلکہ اس سے زیادہ ڈالر سالانہ حاصل کرتا رہا ہے لیکن تیل سے حاصل ہونے والی اس آمدنی کا سب سے زیادہ حصہ تو اسلحہ کے انبار خریدنے پر صرف ہوتا تھا۔ اسلحہ کی اس خریداری کا مقصد ایران کو مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ مسلح ملک بنانا تھا اور اس طرح خود شہنشاہ سامراج بالخصوص امریکی سامراج کا "مراعات یافتہ" دوست اور علاقے کا پولیس مین جو امریکی کمپنیوں کے تیل سے متعلق مفادات کی حفاظت احسن طریقے سے کرسکتا ہو۔ دوسری مد جس میں تیل سے حاصل ہونے والی اس آمدنی کا بڑا حصہ صرف ہوتا تھا۔ وہ ایران کو جدید بنانے کے لئے ٹیکنیکل ساز و سامان ہے۔ اس کا مقصد ایران کو جدید بنانے سے زیادہ شہنشاہ کو اپنا وقار بڑھانا ہے اور ان کا ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۳ء تک ایران میں ۲۰ ایٹمی پاور پلانٹ کی تعمیر کی جانی ہے۔ تیل کی آمدنی جس تیسری مد میں سب سے زیادہ صرف ہوتی تھی وہ ہے رشوت جو شہنشاہ کی حکومت کے تمام شعبوں میں پوری طرح جاری و ساری ہے۔ ایران کے اندر جو پالیسیاں روا رکھی جا رہی ہیں وہ نہایت واضح مثال ہیں کہ کس طرح تشدد کے ذریعے حکومت ہوتی ہے۔ خفیہ پولیس ساوک کی قتل و غارت گری، سیاسی کارکنوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا، انسانی حقوق کی پامالی اور ہر دفتر، ہر کارخانے، ہر یونیورسٹی، ہر کالج اور سکول میں خفیہ پولیس اور اس کے ایجنٹوں کی تعیناتی نے ایران کو ایک قیدخانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ مصدق کے زوال جو ۱۹۵۳ء میں ہوا، سے آج تک کوئی بھی ترقی پسند تنظیم کھلم کھلا نہ تو قائم ہو سکی اور نہ کام کر سکی ہے، ہماری پارٹی کے ہزاروں کارکنوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان پر ظلم و تشدد کیا گیا اور سالہا سال سے وہ اب بھی جیلوں میں بند ہیں۔

شہنشاہ اور اس کی حکومت کی یہ عوام دشمنی اور سامراج دوست پالیسیاں تھیں۔ جنہوں نے اس زبردست عوامی احتجاج کی تحریک کو جنم دیا اور اس کا لاوا مدتوں سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ گو اس وقت جب یہ مضمون تحریر کیا جا رہا ہے۔ تو اس پوری تحریک اور مزاحمت کا مکمل تجزیہ کرنا مشکل ہے لیکن اس کے باوجود اس کے بعض پہلو بہت نمایاں ہیں۔

اس احتجاجی تحریک نے اس رو بہ زوال بادشاہت کی اخلاقی اور سیاسی گراوٹ کو ایک طرف ظاہر کر دیا ہے اور دوسرے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ اس کو عوامی تائید بالکل حاصل نہیں ہے اور کوئی طبقہ مؤثر طور پر اس بادشاہت کی پشت پناہی اور حمایت کے لئے تیار نہیں ہے۔ ملک گیر احتجاج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پورا احصاؤ شہنشاہ نے پچھلے ۲۵ برس سے اپنی آمریت کے گرد تعمیر کیا تھا۔ اس میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ اب شہنشاہ نے اپنی تخلیق کردہ جماعت رستخیز کو بھی ناکارہ سمجھ کر توڑنے کے احکام صادر کر دیئے ہیں اور اب شہنشاہ کی حکومت کا واحد سہارا ظلم کے ہتھیار پولیس اور فوج ہی رہ گئے ہیں۔

اس وقت اس احتجاجی تحریک کی مذہبی زبان اور نعروں میں ہمیں کسی مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ بنیادی طور پر یہ تحریک سیاسی اور سماجی ہے۔ اس تحریک میں سب سے زیادہ سرگرم عمل مزدور طبقہ ہے، سرکاری ملازمین ہیں اور شہری نوجوان ہیں۔ جن میں طلباء اور دانشور بھی شامل ہیں اور یہی اس تحریک کا رخ متعین کر رہے ہیں۔ تحریک میں شامل مختلف طبقات اور گروہوں کا سیاسی شعور اتنا پختہ ہے کہ انہوں نے صرف اقتصادی مطالبات

ہی پیش نہیں کئے کیونکہ بہت سے اقتصادی مطالبات تو یہ شہنشاہ کی حکومت تسلیم کرنے پر مجبور بھی ہو گئی ہے بلکہ ان گروہوں نے سیاسی مطالبات کو سر فہرست رکھا ہے۔ مثلاً مارشل لا کا خاتمہ، تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی، تحریر و تقریر کی آزادی، اختیارات کی آزادی، سیاسی جماعتوں پر سے پابندی کا خاتمہ، ساوک کا خاتمہ، سامراجی ممالک سے تمام معاہدوں کی منسوخی اور ان کے فوجی اور دوسرے مشیروں کا ایران سے انخلاء۔

صنعتی مزدوروں بالخصوص سب سے زیادہ منظم اور باشعور تیل کے مزدوروں، دفتری ملازمین اور اساتذہ و طلباء نے تحریک پر زبردست تنظیم اور جارحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ۱۹۷۸ء کے اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں جو ہڑتالوں کی زبردست لہر اٹھی تھی اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ صنعتی مزدوروں نے شہنشاہ کی مسلط کردہ ٹریڈ یونین قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ مزدور اپنے طبقاتی اور قومی مفاد کے لئے سینہ سپر تھے۔ یہ ہے وہ اہم پہلو جو ہماری آزادی اور نجات کی طبقاتی جدوجہد پر آئندہ سب سے زیادہ اثر انداز ہو گا۔ صرف یہی نہیں حالات نے اس تحریک کی کمزوریوں کو بھی عیاں کر دیا ہے اور یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ اس عوامی جمہوری تحریک میں کسانوں نے اس جذبے سے شرکت نہیں کر رہے جس انداز سے شہری اس جدوجہد کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہ بھی اس تحریک نے ثابت کر دیا کہ عوام ایک چاک و چوبند اور مستعد قیادت حاصل نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ تمام کمزوریاں مسلسل ایک آمرانہ رجعت پسند حکومت کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ کمزوریاں عوامی جمہوری تحریک کا کام خاصا مشکل بنا رہی ہیں۔

نومبر کے شروع میں شہنشاہ نے ایک فوجی حکومت جنرل اظہری کی قیادت میں قائم کر دی تھی اور اس سے یہ ثابت کر دیا کہ بادشاہت کو دوام صرف فوج کے سہارے پر ہے۔ چنانچہ اس فوجی حکومت نے سب سے پہلے اہم اخبارات پر پابندیاں عائد کر دیں تاکہ عوام کو خبروں اور اطلاعات حاصل نہ ہونے پائیں۔ مارشل لاء کے نفاذ میں سختی شروع ہو گئی اور مشہور اہل قلم "بے حزن" کو گرفتار کر لیا گیا۔ کئی صحافیوں، ادیبوں اور نیشنل فرنٹ کے قائدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں ڈاکٹر کریم سنجابی اور ڈاکٹر فرہر بھی شامل ہیں۔

فوجی حکومت کے قیام کا یہ مطلب نہیں کہ شاہ نے اپنی شرائط اور اپنی ضرورتوں کے مطابق اس سیاسی بحران کو حل کرنے کی کوشش ترک کر دی ہیں۔ ہماری پارٹی محسوس کرتی ہے کہ رجعت پسندوں اور شاہ پرستوں کی سیاسی طاقت کو کمزور سمجھنا بہت بڑی غلطی ہو گی۔ کیونکہ ان کی طاقت کا انحصار اس طاقت پر ہے۔ جو شہنشاہ امریکی سامراج اور بیرونی رجعت پسند طاقتوں، اسرائیل، مصر، سعودی عرب، اور دوسرے ممالک سے حاصل کرتا ہے۔ پچھلے پانچ برسوں میں امریکہ نے ایران کے ہاتھ دس ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا ہے اور مستقبل قریب میں اور بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کا تخمینہ بارہ ارب ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ ایران میں اس وقت ۸۰ ہزار امریکی مشیر ہیں۔ ان میں سے ۴۰ ہزار فوجی امور میں شریک ہیں۔ اس لئے جب صدر کارٹر شہنشاہ کے خلاف تحریک پر اپنی سراسیمگی کا اظہار کرتا ہے۔ تو یہ حیرانی کی بات نہیں اور صدر کارٹر کا ایک نائب تو یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ "واشنگٹن نے ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کا منصوبہ بنا لیا ہے"۔

ظاہرا طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامراجیوں نے ایران کے اندرونی معاملات میں فوجی مداخلت کا

فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ بین الاقوامی قانون کی زبردست خلاف ورزی ہوگی اور کے نتائج خاصے مہلک نکل سکتے ہیں۔ ہماری پارٹی سوویت یونین کی اس ضمن میں شکرگذار ہے کہ لیونڈ برزنیف نے واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا ہے:۔

" سوویت یونین ایران کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کا زبردست مخالف ہے۔ یہ مداخلت کسی صورت، کسی طریقے اور کسی طرف سے اور کسی بہانے کے تحت برداشت نہیں کی جائے گی ——— "

اس طرح سے سوویت یونین اس نازک ترین دور میں ایک اصولی مؤقف کو واضح کرکے اور مداخلت کی مذمت کرکے سامراجیوں کی مداخلت کا راستہ روکا ہے۔ اس وقت ایران کے اندر عوام اور رجعت پسند حکمرانوں کے درمیان جو محاذ آرائی ہورہی ہے وہ ایران کا اندرونی معاملہ ہے۔ پوری دنیا پر اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ ایران کے عوام انقلابی تبدیلیوں، جو اقتصادی بھی ہیں، سیاسی اور سماجی بھی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ تحریک کوئی بھی شکل اختیار کرے یہ بنیادی مطالبات ہمارے ملک کے مستقبل کے ڈھانچے کا تعین کریں گی۔

۱۲ر نومبر ۱۹۷۸ء

عبداللہ ملک

رفاقت کہاں تک!

"ماہ جنوری ۱۹۷۹ء میں جب ابھی انقلاب ایران ابھی ابتدائی منازل میں تھا۔ تو ایران کی کمیونسٹ پارٹی جو"تودہ پارٹی" کے نام سے پکاری جاتی ہے، کے سربراہ نورالدین کیانوری نے امریکی جریدے "نیوز ویک" کو ایک اہم انٹرویو دیا تھا۔ اس کا مکمل متن امریکی روزنامہ "نیشنل ہیرلڈ ٹریبون" نے شائع کیا تھا۔ اس سے ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ انٹرویو آج بھی بہت اہم ہے۔ کیونکہ آج سامراجی پریس اور اس کے تتبع میں ہمارے اخبارات بھی دن رات یہ اعلان کر رہے ہیں کہ کمیونسٹوں اور خمینی کے حامیوں میں ٹھن گئی ہے اس کا مقصد ایران کے انقلاب کو پایہ تکمیل تک پہنچنے سے روکنا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے جو اس انٹرویو سے عیاں ہو جائیں گی کہ کمیونسٹ خمینی کی سامراج دشمن پالیسیوں کے شدت سے حامی ہیں۔ اور یہی قدرِ مشترک۔ کمیونسٹوں اور خمینی کو ایک ساتھ چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ خمینی جب کمیونزم کے خلاف کچھ کہتا ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ جب کوئی قائد ایک ایسے عوامی انقلاب کی قیادت کرتا ہے۔ جو سامراج اور بالخصوص امریکی سامراج سے اپنے ملک کو نجات دلاتا ہے۔ تو وہ کچھ بھی کہتا رہے۔ اس کی قربت، اس کی دوستی، اس کی رفاقت لازماً سوشلسٹ اور ترقی پسند کیمپ کے ساتھ ہوگی۔ اس لئے کمیونسٹ کہتے ہیں کہ وہ خمینی کے ساتھ بہت دیر تک چل سکتے ہیں

جب سے ایران میں بحران نے زور پکڑنا شروع کیا ہے، شیعہ رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی اور ایران کے اندر غیر مذہبی مخالف پارٹی نیشنل فرنٹ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مگر ایران کے اندر انتہائی طاقتور اور فیصلہ کن قوتوں میں سے ایک ممنوعہ ایرانی کمیونسٹ پارٹی بھی ہے۔ جو تودہ پارٹی کے نام سے مشہور ہے اور ۱۹۴۹ء سے انڈر گراؤنڈ ہے تودہ پارٹی نے جو ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ شاہ محمد رضا پہلوی کی جانب سے گذشتہ تیس سال میں متعدد بار کچلے جانے کے باوجود ماضی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اب بھی ایران کے اندر اس کا ایک پوری طرح منظم خفیہ ڈھانچہ موجود ہے۔ ماضی میں اس کے لیڈروں تک راست رسائی حاصل کرنا

کسی بھی مغربی صحافی کے لئے عملاً ناممکن تھا۔ مگر گذشتہ ہفتے مشرقی یورپ میں نیوز ویک کے یورپی ایڈیٹر بہر نے تودہ پارٹی کے نومنتخب اوّل سیکرٹری ۶۳ سالہ نورالدین کیانوری سے ایک گھنٹے سے زیادہ گفتگو کی۔

بہر:۔ آپ کی پارٹی ۱۹۴۹ء سے انڈرگراؤنڈ ہے۔ آپ نے کس طرح رابطہ رکھا ہُوا ہے۔ اور اس پر آپ کا کنٹرول کس حد تک ہے؟

کیانوری:۔ ہماری بہت سی مشکلات اور بالخصوص ۱۹۷۰ء میں ہماری تحریک میں (ایران کی خفیہ پولیس) ساواک کے تھوڑا سا آنے کے باوجود ہمارا رابطہ کبھی منقطع نہیں ہُوا۔

سوال:۔ آپ کو زیادہ تر حمایت کس کی حاصل ہے؟

جواب:۔ تیس لاکھ کا ایرانی مزدور طبقہ بلند سیاسی شعور رکھتا ہے، جس کا اظہار اس نے انقلاب کے گذشتہ مرحلے میں کیا ہے۔ انقلاب کے ساتھ ساتھ تودہ روایات کا بھی احیاء ہو رہا ہے۔ پرانے کارکن جن میں سے اکثر کو جیل کا تجربہ ہے نئی نسل کی رہنمائی کر رہے ہیں، اب تو شاہ کے حکام بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تیل کے کنوؤں کے مزدور صرف تودہ پارٹی کی طرف سے ملنے والی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ دانشوروں، نچلے درمیانے طبقے، "قومی بورژوازی" بازار کے سوداگروں، مختصراً یہ کہ ان تمام طبقوں میں بھی ہمیں کافی حمایت حاصل ہے جو براہِ راست اجارادارانہ، سامراجی سرمایہ داری میں شریک نہیں ہیں۔

سوال:۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سڑکوں میں خمینی کی حمایت میں نعرے لگانے والوں میں بہت سے درحقیقت تودہ پارٹی کے ممبر یا حمایتی ہیں؟

جواب:۔ میں یہ نہیں کہہ رہا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ گذشتہ بیس سال سے آیت اللہ خمینی ہر طبقے سے شاہ اور سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے اسلامی قوانین کی بنیاد پہ اپنے سیاسی افکار کو بھی ترقی دی ہے۔ بادشاہت کے خاتمے، اسلامی جمہوریہ کے قیام، سامراج کی بالادستی کے خاتمے کی خاطر ایک قومی حکومت کی رہنمائی کے لئے ایک نئے آئین کی تیاری کے لئے دستور ساز اسمبلی کے قیام، عوام دوست جمہوریت کی تمام صورتوں کی ضمانت، سیاسی جبر کے خلاف جدوجہد اور ہماری قومی دولت کو مشترکہ بہبود کے لئے استعمال کرنے کے لئے ان کی پہل کاریوں کی ہم مکمل حمایت کرتے ہیں۔ یہ ہمارا عارضی طریقۂ کار نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور واضح موقف ہے۔

سوال:۔ ایک مارکسی کی حیثیت سے کیا۔ آپ کو آیت اللہ خمینی کی پالیسیوں کے گہرے اسلامی کردار پر تردّد نہیں ہے؟

جواب:۔ ایک طویل عرصے سے شیعہ مذہبی رہنما مسجدوں میں عوام سے رابطہ پیدا کرتے رہے ہیں۔ شیعہ مذہبی تصورات کی جڑیں جمہوری ہیں اور وہ ہمیشہ عوامی، قومی، سامراج دشمن قوتوں سے وابستہ رہے ہیں اسی وجہ سے جب آیت اللہ خمینی نے شاہ کے خلاف طاقتور اور انقلابی نعرے دیئے تو انہوں نے ہماری ہمدردیاں جیت لیں۔ تودہ پارٹی ان کی تحریک میں معروضی طور پر ترقی پسند عناصر کو تسلیم کرتی ہے اور ان کے ساتھ ایک مشترکہ پروگرام تیار کرنے کے لئے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ نقطۂ عروج پر

وہ ایران کی نشو ونما میں مکمل طور پر ترقی پسند کردار ادا کر رہے ہیں۔

سوال :۔ تو تودہ پارٹی اور آیت اللہ خمینی کب تک ساتھ چل سکتے ہیں؟

جواب :۔ کافی طویل عرصے تک۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنسی سوشلزم اور اسلام کے سماجی مافیہ میں بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان میں زیادہ تر باتیں مشترک ہیں۔ بہت سے سوشلسٹ ملکوں میں مسلمان آبادی ہے اور وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

سوال :۔ کیا آپ کا ان سے براہِ راست رابطہ ہے؟ اور آپ نے حال میں ان کے پاس کوئی ایلچی بھیجے ہیں؟

جواب :۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

سوال :۔ آپ اقتدار میں کتنا حصہ چاہتے ہیں؟

جواب :۔ ہم جس مجوزہ متحدہ محاذ کی بات کرتے ہیں اس کی ساخت ثانوی اہمیت رکھتی ہے۔ اصل چیز اس کے مشترکہ پروگرام کے نکات ہیں۔

سوال :۔ کیا آپ کے نزدیک نیشنل فرنٹ پارٹی کے ساتھ ایک متحدہ محاذ میں مل کر کام کرنے کا امکان ہے؟

جواب :۔ ہم ایک متحدہ محاذ کی حمایت میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے اور ہم ہر اس سیاسی تحریک کے ساتھ کریں گے جو ہمارے مقاصد یعنی سامراج کی امریکی اور دیگر شکلوں کے خاتمے، اسلحہ کی تباہ کن خریداری کے خاتمے اور ایک دستور ساز اسمبلی کے قیام سے اتفاق کرتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیشنل فرنٹ کے اندر ایک دھارا ایسا ہے جو ہمارے ساتھ تعاون کے حق میں ہے اور ہمیں کسی بورژوا پارٹی کے ساتھ کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں پھر زور دیتا ہوں کہ متحدہ محاذ کی کسی حکومت میں ہمیں ملنے والی نشستیں اہم نہیں ہیں۔ بلکہ یہ خیالات اور پالیسیاں ہیں جن کی اہمیت ہے۔

سوال :۔ مگر اس وقت جب نیا آئین بنے گا اور ایرانی عوام مسلمہ پارٹیوں کو ووٹ دیں گے۔ آپ کے پاس کیا ضمانت ہے کہ آیت اللہ خمینی غیر مذہبی پارٹیوں کو معمول کے مطابق کام کرنے کی اجازت دیں گے؟

جواب :۔ ہم بہت معروضیت پسند (حقیقت پسند) ہیں۔ جب یہ مسائل ابھریں گے تو ہم ان پر غور کریں گے۔

سوال :۔ آپ کی نئی قیادت میں تودہ پارٹی نے مسلح عوامی جدوجہد کی تیاری کرنے کا اعلان نامہ جاری کیا ہے، کیا آپ خانہ جنگی کو ناگزیر سمجھتے ہیں؟

جواب :۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کو اپنے ہاتھ کھلے رکھنے چاہیئے۔ قومی جدوجہد جو شاہ کی روانگی پر منتج ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے پُر امن طور پر اپنے منطقی انجام کو پہنچے اور فوج جمہوری ایران کے تابع ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایران کی رجعت پسند قوتیں امریکہ، اسرائیل اور دیگر سامراج اتحادیوں کے ساتھ چلی کے پیمانے پر یا انڈونیشیا میں بڑے پیمانے پر کمیونسٹوں کے قتل عام کے طرز پر جوابی انقلاب کی کوشش کریں۔ ہم یہ بات یا ۱۹۵۳ء میں تودہ پارٹی پر ہونے والے مظالم کا اعادہ نہیں چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چوکنا رہنا چاہیئے۔

سوال :۔ تو کیا آپ آگے چل کر مسلح عوامی جدوجہد کو ناگزیر سمجھتے ہیں؟

جواب :۔ میں قنوطیت پسند نہیں ہوں۔ مگر میں ضرورت سے زیادہ رجائیت پسند بھی نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ

خونریزی کے بغیر بھی قومی تحریک اپنے منطقی انجام کو پہنچ سکتی ہے، مگر پھر بھی ہمیں چوکنا رہنا چاہیئے۔

سوال:۔ آپ ہتھیار کہاں سے حاصل کریں گے؟

جواب:۔ پوری تاریخ میں انقلابی تحریکوں نے اس مسئلے کو خاص انداز میں حل کیا ہے۔ ہتھیار ہمیشہ حاصل کئے جا سکتے ہیں یا خریدے جا سکتے ہیں۔ ایران میں کافی ہتھیار موجود ہیں۔

سوال:۔ تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ایرانی فوج آپ کا ساتھ دے سکتی ہے؟

جواب:۔ ہماری فوج کا ماخذ عوامی ہے، جس کا نوے فیصد کسانوں اور دس فیصد مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ بڑھتی ہوئی انقلابی تحریک بیرکوں کی دیواروں کے باہر نہیں رہے گی۔ جلد یا بدیر یہ تحریک فوج تک پہنچے گی۔ شہری آبادی کے بعد ہی سہی مگر پہنچے گی ضرور۔ اس کی علامات پہلے سے موجود ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے عوام اور فوج کے درمیان رابطے کے بعد انقلابی افکار فوج میں اس حد تک سرایت کر گئے ہیں۔ کہ مظاہروں کو ختم کرانے کے لئے اب افسر رضا کاروں کو بلا رہے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ فوج کی وفاداریاں قائم نہیں رہیں۔

سوال:۔ آپ سوویت یونین اور ایران کے درمیان ۱۹۳۱ء کے معاہدے کو کیا اہمیت دیتے ہیں۔ جس کے تحت ایران پر حملے کی صورت میں سوویت یونین کو ایران کا ساتھ دینا ہے؟

جواب:۔ یہ معاہدہ ہی وہ واحد سبب تھا جس کی بناء پر برطانیہ ایران پر نوآبادی کی حیثیت سے قبضہ نہیں کر سکا اس نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے، اب بھی ادا کر رہا ہے اور آئندہ بھی ایران کی قومی خودمختاری میں اہم کردار ادا کرے گا۔

سوال:۔ بعض مبصرین یاد دلاتے ہیں کہ پیٹر اعظم کے زمانے میں ایران روسی سرزمین کا جزو لاینفک رہا ہے۔ سوویت اثر کے دوبارہ پھیلاؤ کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب:۔ اگر ایران ایک جمہوری ملک بن کر سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے گا تو مجھے یقین ہے کہ یہ ملک ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اپنی جنوبی سرحدوں پر ایک دوست حکومت سے جہاں اس کے خلاف کوئی اڈے نہیں ہوں گے۔ سوویت یونین خوش ہوگا۔ سوویت یونین کی سلامتی کے لئے ترقی پسند ایران ضمانت ہوگا۔

رضا براهینی
ترجمہ: شمیم حنفی

نظم

تیسری دنیا کے نوجوان
ناشتہ کرتے ہیں
ہینڈ گرینیڈز کا
لنچ کے لئے
بارود
اور ٹکڑے ٹکڑے بکھر جاتے ہیں
ڈنر کی خاطر

اب وہ غذا کے طور پر
ایٹم بم کھانے لگیں گے
کل یا پرسوں
جب انہیں
زیادہ کیلوریز کی ضرورت ہوگی
تاکہ موت کے سامنے وہ کھڑے ہو سکیں
یا کھڑے کھڑے مر سکیں

رضا براہینی
ترجمہ: شمیم حنفی

نظم

ہمارے بیچ اگا گلاب سوکھ جائے گا
آسمان کا کوئی نشان بچا نہ رہے گا
شہر کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے
اور فصیلوں سے دیوتا نیچے پھینک دیئے جائیں گے
پرانی سپاہ نئی سپاہ کو شکست دے گی
خستہ و درماندہ چمگادڑیں شہرِ شیراز سے اڑتی گزر جائیں گی
انسانی سروں کے گولے بھینچ کر پلپلے کر دیئے جائیں گے
مہمانوں کو شراب کے پیالوں میں زہر دیا جائے گا
تبریز میں تابوت فضاؤں میں لے جائے جائیں گے
صحرا اپنے آپ کو راجدھانی تک پھیلا دے گا
اور راجدھانی کی پیٹھ بھونچال کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی
سانپ زمین کی ریڑھ میں رینگتے پھریں گے
شہید اپنی پرانی قبروں سے نکل بھاگیں گے
کیسپین سوکھ جائے گا
مچھلی درندوں اور انسانوں کے ساتھ سارے گاؤں کو نگل جائے گی
جنوبی خلیج سے جلتے ہوئے ستارے یکایک پھوٹ پڑیں گے
اور روزنوں کے شیشوں کے پیچھے بیٹھی ایرانی بلیوں کی آنکھوں میں اتر جائیں گے

پھر ایک چیخ طلب کرے گی پادشاہوں کو جو اپنی باری کے منتظر ہیں
سب کے سب زمین پر آئیں گے
ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے خنجر دبائے ہوئے اپنے دانتوں میں
ناخنوں میں
کانچ کے ٹوٹے ٹکڑوں میں

ذرّوں کی طرح چھوٹے چھوٹے آدمیوں میں
ریت میں
دستانے پہنی ہوئی کلائیوں میں
پیپ اور پیشاب کی تلچھٹوں میں

بھیڑیوں اور سیاروں میں
سوکھے پیڑوں اور پت جھڑ کی پرانی پتیوں میں
کرگسوں اور چونچوں کے چاقوؤں میں
درندوں میں جن سے آدمی اور جانور یکساں طور پر ناواقف ہیں
کوڑھیوں میں جو ایک دوسرے کو ناخنوں اور خنجروں سے کھرچ رہے ہوں گے
لہو کے لبوں میں اور جہنم کے دہانوں میں
ایک نئی صدی کا جنم ہوگا
فارس ایک بار پھر جنم لے گا

رضا براهنی
ترجمہ: شمیم حنفی

نظم

(مجیبن تبریزی کے نام۔ ایک ایرانی خاتون جو شاہ کے ٹورچ چیمبر میں مقید رہی)

بہن !
مجھ سے باتیں کرنا، جب ستارے سو جائیں

مجھ سے کہنا، اپنی باتیں، جب ستارے چمک نہ رہے ہوں

بہن !
مجھ سے
کہنا
اپنے دل کی
باتیں
جب
ستارے
روشن
نہ
ہوں

تمہاری انگلیاں میرے ہاتھوں میں ہیں
بہار کے گلابوں کی پنکھڑیاں

تمہارا مفہوم
ہمارے بیچ کھڑی دیواروں
ہمارے چاروں طرف پھیلی دیواروں سے گزر کر
گلابوں کی زبان میں
مجھ تک پہنچ جاتا ہے

بہن !
چمکتے
ستارے
کچھ کہتے ہیں
تم مجھ سے دل کی باتیں کرنا جب ستارے سو جائیں

دو

زنداں میں ایک عورت کا بدن
یہ اسی عورت کا بدن ہے
کڑے پانیوں کی یخ جھیل میں
دیوار کھڑی ہے، کھڑی ہے
برف پڑی ہے، پڑی ہے
کوئی حرکت نہیں
چلو، میں تمہیں باہر لے چلوں
گرماؤں تمہارے بالوں، تمہاری آنکھوں، تمہارے یخ شانوں کو،
تمہارے سینے کے برفیلے گولوں کو
تمہارے دل کی ٹھنڈی کلائیوں کو
چلو، میں تمہیں صحرا کی طرف لے چلوں
جہاں سورج کی گرمی ہے
اور دیکھوں برف سے ایک نیا جنم لیتے ہوئے

تمہیں بولتے اور چلتے ہوئے

بہن !
جگمگ کرتے تارے
کچھ کہتے ہیں
تم مجھ سے اپنی باتیں کہنا جب یہ تارے بجھ جائیں

تین

اندھیرے کی اپنی بُو ہوتی ہے
یہ بُو اس عورت کے لئے نہیں ہے
جو تیرگی میں ایک نوخیز پودے کی صورت ایستادہ ہو

تمہارے پاؤں کے ناخن میری جڑیں ہیں
سپاہی اندھے ہیں
وہ ان ناخنوں کو کھینچ نکالیں گے، تو میں سوکھ جاؤں گا

بہن !
چمکتے ستارے
کچھ کہتے ہیں

چار

جب دوستوں نے مجھے بتایا
کہ کُتے تمہیں اغوا کر لے گئے
میں حیران تھا
کہیں بھیڑیے بھی چاند کو چھین سکتے ہیں ؟
میں اپنے کمرے میں اپنے لاموجود مجسمے کے سامنے کھڑا ہوں

اور تم سے باتیں کرتا ہوں، یوں جیسے
ہم انقلاب کے بعد کے دور میں ہوں
اور ہمیں ایک موزوں نام منتخب کرنا ہے
اس تند و تیز شراب کے لئے
تاکہ ہم ان چار برسوں کو خراج دے سکیں جو تم نے شاہ کی قید میں گزارے
تم نے کہا: ایک پڑھا لکھا کسان
بہتر ہے ایک اَن پڑھ کسان سے
میں نے یہ بات مان لی کہ ایک نہ بک سکنے والا مزدور
بہتر ہے بک جانے والے سے
پھر ہم نے تالیاں بجائیں!
اور ان تمام اچھے دنوں کے بارے میں سوچا
جنہیں ہم اس جیل میں پڑے سڑنے کے بجائے
ایک ساتھ گذار سکتے تھے

پانچ

ہمارے دھیان کی کوٹھریوں میں
شاعر اور اس کے شعر
ایک ــــ بالکل ایک ہو جاتے ہیں

پڑھنے والے اور لکھنے والے
گانے والے اور سوچنے والے
کھیلنے والے اور وہ کھیل جو کھیلا جا رہا ہو
ایک ہو جاتے ہیں

بھائی ہی بہن ہے
بیٹا ہی باپ ہے

اور باپ اور ماں
ایک ہیں ـــــ بالکل ایک

ناموں کے الگ الگ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا
دنیا کی ہر شے

وہ جو چل رہا ہے اور وہ جو لنگڑا ہے
سب ایک ہیں

شاہ کی جیل میں مقید
اس لڑکی کو
میں تسکین و تشفی کے یہ لفظ نذر کرتا ہوں

اس لڑکی کا نام
شاہ اور اس کے جرگے کو
شرمندہ کرتا رہے گا
اس عمل کا امتحان صرف یہ ہے، ساتھیو! ہم
ایک ہیں

فارضیہ احمدی

نظم

میدانوں میں پہاڑوں میں
ایک عورت جو بچے کو جنم دیتی ہے
پربتوں میں،
اور وہ گنوا بیٹھتی ہے اپنی بکری کو
میدانوں کے پھیلاؤ میں
اور وہ بیٹھ کر اس کا سوگ مناتی ہے
میں ایک مزدور عورت ہوں
جس کے ہاتھ دیو ہیکل مشینوں کو چلاتے ہیں
مشین، جس کے پہیوں تلے
میری آبرو کہیں کھو جاتی ہے
میری ہی آنکھوں کے سامنے
ایک عورت، جس کے خون پر
خونخواروں کے بدن پلتے ہیں
اور جس کے لہو کے کم ہونے سے
سرمایہ دار کا نفع بڑھ جاتا ہے
ایک عورت، جس کے لئے
تمہاری بے شرم لغات میں ایک بھی لفظ نہیں ہے،
میری اہمیت کی ترجمانی کے لئے ۔۔۔۔۔۔۔

تمہاری لغات صرف اس عورت کی ترجمانی کرتی ہیں
میں ماں ہوں
میں بہن ہوں
میں وفادار بیوی ہوں
میں وہ عورت ہوں جو شروع ہی سے ننگے پاؤں
بھٹکتی بھٹکتی رہی تپتے صحراؤں میں
میں ہوں شمال کے دیہات کی وہ عورت، جس نے شروع ہی سے
اپنی ہمت سے کہیں بڑھ کر کام کیا ہے
دھان کے کھیتوں میں، چائے کے باغات میں ......
میں ہی دُور جنوب کے کھنڈرات کی وہ عورت ہوں
جس نے شروع ہی سے،
ننگے پاؤں
پانی کے ایک قطرے کی تلاش میں
دھرتی کی ماں بھی پیاس محسوس کی ہے
میں ایک عورت ہوں،
جس نے شروع ہی سے
ننگے پاؤں
اپنی مریل سی گائے کے ساتھ
کھیتوں کھلیانوں میں
پو پھٹنے سے لے کر سورج ڈوبنے تک
دکھ درد کا بوجھ اُٹھایا ہے
میں ایک عورت ہوں
ان خانہ بدوش قبیلوں کی
جو بھٹکتے ہیں
جس کے صاف ستھرے ہاتھ ہیں
بدن لچکدار ہے

چمڑی نرم اور ملائم ہے
اور جس کے بال خوبصورت ہیں
میں ایک عورت ہوں
زخموں سے بھرے ہاتھوں والی
ایک عورت، جس کا جسم ٹوٹ پھوٹ چکا ہے
تمہارے لئے نہ ختم ہونے والی بے شرم مشقت کرتے ہوئے
ایک عورت،
جس کی چمڑی
تپتے ریگستانوں کے سورج کا آئینہ ہے
اور جس کے بالوں میں کارخانوں کے دھوئیں کا اندھیرا ہے
میں ایک آزاد عورت ہوں
ایک عورت جس نے شروع ہی سے
اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کے ساتھ کندھے جوڑ کر
میدان پار کئے ہیں
ایک عورت
جس نے جنم دیا ہے مزدور کی طاقتور باہوں
اور کسانوں کے ان تھک ہاتھوں کو
میں خود ایک مزدور عورت ہوں
اور ایک کسان عورت
جس کا تمام جسم تشدد کی تصویر ہے
جس کا انگ انگ نفرت کی نمائش کرتا ہے
تمہارا یہ دعویٰ کس قدر بے شرمی پر مبنی ہے
کہ میری بھوک محض ایک واہمہ ہے
کہ میرا ننگا پن محض ایک چھلاوہ ہے
میں ایک عورت ہوں
ایک عورت جس کے لئے

تمہاری بے شرم لغت میں
ایک بھی لفظ نہیں
میری اہمیت کی ترجمانی کے لئے
ایک عورت جس کے سینے میں
غصیلا، رِستے زخموں سے بھرا ایک دل ہے
ایک عورت جس کی آنکھوں میں
آزادی کی گولیوں کی سُرخ پرچھائیاں چمکتی ہیں
ایک عورت
جس کے ہاتھوں نے محنت مشقت کے باعث
بندوق اٹھانا سیکھا ہے

ترجمہ:- کشور ناہید

ایران کی نظمیں

(شاعر نامعلوم)

یقین

اب کسی لمحے
طویل رات اپنے اختتام کو پہنچے گی
ہماری آنکھوں میں آتشیں سورج
اور بھی انگارہ بن کر عکس ریز ہے
بس اسے دیکھو
اور اس پر یقین رکھو

ستاروں کے نزدیک

حقیقت کے باوجود
میں یہ کیسے کہوں
کہ رات نے اپنے مہیب پر پھیلائے ہیں
ہمارے گھروں اور ہمارے آتشدانوں پر
اور یہ کہ میرے خیالات
ستاروں کے نزدیک غوطہ زن ہیں

صبح سے رات تک

صبح سے رات تک
مدوجزر کے باوجود
ریت فنا نہیں ہوتا
مگر اے سمندر
تیرے کنارے کہاں ہیں

پیغام

میں اپنی انگلیاں مجتمع کرتا ہوں
کہ یہ ایک ناقابلِ تسخیر مکہ بن جائیں
میں اس مکّے سے
سڑکوں کو خاک میں بدل دیتا ہوں
ٹنکوں میں خوف اور دہشت بھر دیتا ہوں
میں جنگوں کا سپاہی
اور وہ گوریلا ہوں
کہ جو اپنی زندگی
اپنے لوگوں کی حیات کی خاطر
بڑی خوشی سے قربان کر دیتا ہے
میری سانس کی گرمی
اخوت اور بھائی چارے کے
جوہرِ زیست سے عبارت ہے
میری زندگی کا کل سرمایہ
آزادی کا لفظ ہے
اے میری سرزمین کے چاہنے والو
اے میرے وطن کے لوگو!

چیتے کی جماہی

سلاخوں کے پیچھے ـــــ چیتا
ایک لمبی جماہی لیتا ہے
بھیڑیں، باڑے میں محصور ہیں
ہرن، برفانی علاقوں میں
فنا کے خوف سے ڈر رہے ہیں
اور سن رہے ہیں
بھیڑیے کی مکروہ خرخراہٹ

مگر چیتے کی جماہی
آزادی کے یقین طلوع کی راست علامت ہے

چٹانوں کی فکر

پریشاں حال
میں پہاڑوں کی وحشت ناکی میں
چیختا پھرتا ہوں
میری دنیا، گھاس، پتے اور جلتی پہاڑیاں ہیں
اور ذخیرہ شدہ نظموں کی گولیاں
میرا اندوختہ ہیں
گھاس
پہاڑی چشموں کے درمیان
خاموشی میں گونج پیدا کرتی ہے
اور میری سنگ صفت ساخت
ہر ہر چیخ
اور ہر خوں آلود فریاد
پہاڑوں میں دفن ہو جاتی ہے
پریشاں حالی
جلی ہوئی گھاس، ہوا اور عظیم موت
کہ انہی سے چٹانوں کا فقید المثال فکر ترتیب پاتا ہے

ایرانی انقلابیوں کا گیت

ایران اے میرے وطن
خلیج سے، جہاں خونی خط کھنچے ہیں
تیرے بلند و معتبر درکوہ تک
پاگل کتے، بھونک رہے ہیں
ایران اے میرے وطن
کس لئے چند مکروہ چرخ
خون کے لوتھڑے
تیری زرخیز زمین پر
ہل چلا کر کھود رہے ہیں
تیری گہرائیوں کا بلوری پانی
سامراج کا گندا نالا چوس رہا ہے
لیکن ایران، اے میرے وطن
قسم کھاتا ہوں
ان سے نمٹ لوں گا
تیری رات کی خموشی میں
گولیوں کی آواز گونجے گی
تیری رات کی تاریکی میں
گولیوں کے شعلے لپکیں گے
تیری رات کی سردی کو
گولیوں کی آگ گرم کرے گی



ویت نام

"مجھے شعلوں کے درمیان سے گزر کر
گلیشیر زمیں جا کر آباد ہونے دو۔"
ہیروشی لونا
(جاپان)

عبداللہ ملک

ویت نام بنام چین

ویت نام ایک ملک کا نام نہیں ہے، یہ جغرافیائی اکائی کا اظہار بھی نہیں، یہ کسی محدود خطے کی نشاندہی بھی نہیں کرتا۔ ویت نام دراصل ایک جذبے کا نام ہے۔ ایک خواب کی تعبیر ہے۔ ایک عزم کا اظہار ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ تمام جذبے اور تمام ارادے، تمام عزم اور حوصلے ویت نام کی شکل میں ہمارے شعور کا حصہ بن گئے ہیں، ہر نسل کا شعور ہوتا ہے۔ کبھی یہ شعور شاعر کے شعروں سے نمو حاصل کرتا ہے تو کبھی مصور کے شاہکار سے یا کسی مغنیہ کی رس بھری آواز سے، لیکن یہ شعور اس کے ساتھ سماجی تبدیلیوں کے عمل سے بھی تشکیل ہوتا ہے۔ انقلاب کی تند و تیز ہوائیں بھی اس شعور کو نوازتی ہیں اور بہت دفعہ اس کا رخ متعین کرتی ہیں۔ ہم کتنا بھی ناک بھوں چڑھائیں کل سوویت روس کے انقلاب نے بھی ہماری بوڑھی نسل کے خون کو گرمایا تھا اور پھر جب ہماری نسل نے پاکستان کی تخلیق کے گن گائے اور مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے تو اس کے ساتھ ہی انقلاب چین نے ہمیں نئی صبح کی نوید بھی سنائی تھی اور یہی نوید کبھی ظہیر کاشمیری کی نظم "ایشیا" میں "اور کبھی ابن انشا کی "شنگھائی" کی نظم میں سنائی دیتی رہی ہے، یہ درست ہے نسلوں کا بُعد ہوتا ہے۔ یہ بُعد ایک نسل کو دوسری نسل سے بالکل اجنبی بنا دیتا ہے۔ ان کے شعور میں اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ لباس میں تبدیلی آجاتی، بالآخر یہ تبدیلی، یہ اجنبیت یہ غیریت نئی نسل کو پہلی نسل کے خلاف بغاوت پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر نسل میں ایک تسلسل بھی ہوتا ہے۔ یہ تسلسل بغاوت کا تسلسل ہے، یہ تسلسل زندہ رہنے کا تسلسل ہے، زندگی کو بہتر بنانے، اسے نکھارنے، اس کے حسن کو دوبالا کرنے کی جد و جہد کا تسلسل ہے، ہر نسل یہ جد و جہد کرتی ہے ہماری نسل ہو یا ہم سے پہلی نسل یا پھر آج کی نوجوان نسل ہو اس میں تمام غیریت اور اجنبیت کے باوجود ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے جہدِ انقلاب، ہر نسل کے لئے انقلاب کی جد و جہد، اس کے مظاہر، اس کے داؤ پیچ، اس کے طور طریقے تو بدل سکتے ہیں لیکن تبدیلی کی خواہش، طبقاتی کشمکش، انقلاب کا جذبہ، نئے سماج کی تشکیل کی لگن، یہ سب جذبے اور خواہش ہر نسل کو مصروف پیکار رکھتے ہیں۔ چنانچہ آج کی نسل کو یہ جذبہ پیکار "ویت نام" کی صورت میں عطا ہوا۔

یہ ویت نام حقیقت میں آزادی کے لئے مسلسل جد و جہد کا مظہر بن کر ہمارے شعور کا حصہ بن گیا ہے، ویت نام موجودہ نسل کے جذبہ بغاوت کا نام بن گیا۔ ویت نام نے سالہا سال تک اس

موجودہ نسل کا خون گرمایا ہے، یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے نوجوان سال ہا سال تک ویت نام کی بہادری اور جوانمردی کی قسمیں کھاتے رہے ہیں اور ویت نام پر امریکہ کی جارحیت، اس کی لشکر کشی اور اس کے مظالم کے خلاف دنیا بھر کے شہروں اور گاؤں میں، ریگستانوں اور سبزہ زاروں میں، باغوں اور پارکوں میں، گلیوں اور کوچوں میں مظاہرے ترتیب دیتے رہے ہیں۔ نعرے لگاتے رہے ہیں "امریکیو ویت نام سے نکل جاؤ" اور اس ویت نام کے مختصر سے ملک نے، اس کے پستہ قد، چپٹی ناک اور بھورے رنگ والے باشندوں، اس کے مردوں اور عورتوں نے، اس کے بچوں اور بوڑھوں نے معجزے کر دکھائے۔ انہوں نے اس دنیا کے سب سے مضبوط، طاقتور اور فنی طور پر سب سے ترقی یافتہ سامراج —— امریکی سامراج کو شکست دی، چاروں شانے چت گرا دیا۔

یہ ایک عظیم حقیقت تھی۔

یہ ایک حقیقت تھی۔ جس سے ہم سب آشنا ہوئے، جس کو ہم سب نے جانا، یہ حقیقت آج بھی ہمارے بہت ہی قریب ہے۔ کیونکہ یہ کل کی بات وہی کل جو ابھی پوری طرح گذر بھی نہیں پایا۔ اس حقیقت کو ہم فراموش بھی نہیں کر سکتے۔ ہم بھول بھی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اس حقیقت نے مجبور و مقہور، بے بس و بے کس اور مظلوم و مجبور انسانوں کی مایوسیوں کو امیدوں میں بدل دیا ہے۔ ویت نام کی حقیقت نے انسان کو درخشاں مستقبل کی نوید سنائی ہے۔ ایک خوشحال اور آزاد معاشرے کا خواب دکھایا ہے اور اس خواب میں رنگ بھرے ہیں۔ یہ ویت نام کی حقیقت ہی ہے جس نے افریقہ کی شکل بدل دی ہے۔ جس نے حبشہ کے انقلاب کے لئے زمین ہموار کی ہے۔ جس نے اس دنیا کے باسیوں کو یقین دلایا کہ اگر امریکہ جیسا جابر اور ظالم سامراج عوام کے ریلے کے سامنے تنکا بن سکتا ہے تو پھر عوام کی منظم طاقت کسی بھی آمر کو جھکا سکتی ہے بھگا سکتی ہے اور انقلاب بپا کر سکتی ہے اور اپنا مستقبل تعمیر کر سکتی ہے۔ ایران کے بپھرے ہوئے ہجوم کی پشت پر بھی تو وہی ویت نامیوں کا جذبہ تھا۔ وہی چنگاری تھی جس کو ویت نامی سالہا سال اپنے دامن سے ہوا دیتے رہے ہیں اور آج وہ شعلہ جوالا بن گئی ہے۔ جس شعلے نے افغانستان میں نادر شاہی خاندان کے فرد داؤد کی حکومت کا تختہ الٹ کر انقلاب کے لئے راہ ہموار کر دی اور ایران میں شہنشاہ کے تاج کجکلاہ کو پاؤں تلے روند ڈالا۔

اب وہی ویت نام اپنے نو آزاد ملک کی تعمیر میں مصروف ہو گیا، اب اس کے بہادر بیٹوں نے بندوق کندھوں سے اتار کر کدال پکڑ لی تھی۔ ہل جوتنے میں مصروف ہو گئے تھے اور اب وہ جنگ کی تباہ کاریوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس ملبے سے ایک نیا سوشلسٹ ویت نام تعمیر کرنے میں مگن تھے۔ وہ امن کے گیت گا رہے تھے تاکہ وہ اس امن کی فضا میں اپنے زخموں پر مرہم رکھ سکیں، اپنے لوگوں کو مکان مہیا کر سکیں، روٹی مہیا کر سکیں، کپڑا فراہم کر سکیں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں حاصل کر سکیں۔ ان کی اس جدوجہد میں تمام سوشلسٹ ممالک سوویت یونین، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ، مشرقی جرمنی یہ سبھی شریک تھے۔ نئے کارخانے لگائے جا رہے تھے۔ نئے مکانات تعمیر ہو رہے تھے کہ فضا پھر مرتعش ہونے لگی

سروں پر پھر جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور چاروں طرف گولیوں اور توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی اور دیکھتے دیکھتے ویت نام پھر ایک بار فوجوں کی زد میں آگیا۔ لیکن یہ فوجیں امریکیوں کی نہ تھیں، یہ فوجیں فرانسیسیوں کی بھی نہ تھیں، یہ جاپانی بھی نہ تھیں، یہ حملہ آور عوامی جمہوریہ چین کی فوجیں تھیں۔ وہ فوجیں جو ایک سوشلسٹ ملک کی فوجیں تھیں، اس ملک کی فوجیں تھیں جس نے خود ایک انقلاب برپا کیا تھا۔ ایک سوشلسٹ معاشرے کے تشکیل کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ آج یہی سوشلسٹ ملک اپنے چھوٹے ننھے منھے ہمسائے سوشلسٹ ملک پر لشکر کشی کر رہا تھا اور دنیا بھر کے انقلابی ترقی پسند، لبرل، جمہوریت پسند، آزاد خیال، دانشور اور ادیب پریشان تھے وہ چین کی روش کو بہت دنوں سے کچھ بدلا بدلا محسوس کر رہے تھے، عوامی جمہوریہ چین کے انقلاب کی بلند سریں اب مدھم ہوتی جا رہی تھیں، اس کا انقلاب کا شعلہ بجھتا چلا جا رہا تھا لیکن کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ یہ انقلاب رد انقلاب میں بدل جائے گا اور نوبت یہاں پہنچے گی کہ سوشلسٹ ویت نام پر چین کی فوجیں چڑھ دوڑیں گی اور سامراجی زبان میں یہ اعلان کریں گی کہ ویت نام کو اس کی گستاخیوں کی سزا دی جائے گی۔

اس پورے عمل نے ایک عالم کو پریشان کر دیا ہے اور چار وانگ عالم یہی سوال کیا جانے لگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اور مجھے رہ رہ کے احمد فراز یاد آرہا ہے جس نے کہا تھا۔

سحر کے سورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہو لہو ہے
وہ میرا مشرق
جو میرا بازو ہے
میرا دل ہے
میری نمو ہے
جو میرے اطراف کا نشان
میری آبرو ہے
لہو لہو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاعوں کا نور اندھیروں میں
گھٹ گیا ہے

کہ آج ہر رشتہ رفاقت ہی کٹ گیا ہے
سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں

اور آج اسی ہیجانی اور اضطرابی کیفیت میں یہ سوال پریشان کر رہے ہیں

۱ ۔ چین نے ویت نام پر حملہ کیوں کیا ؟
۲ ۔ ایک سوشلسٹ ملک نے دوسرے سوشلسٹ ملک پر جارحیت کیوں کی ؟
۳ ۔ کیا چین سوشلسٹ اصولوں سے منحرف ہو گیا ہے ؟
۴ ۔ اگر چین نے ویت نام پر حملہ کیا بھی تھا تو پھر فوجیں اتنی جلدی واپس کیوں بلالیں ؟
۵ ۔ کیا چین نے دو ہفتوں میں اپنے مقاصد حاصل کر لئے تھے ؟
۶ ۔ سوویت روس نے اس دوران میں چین پر حملہ کیوں نہیں کر دیا ؟
۷ ۔ کیا سوویت یونین چین سے ڈر گیا ؟
۸ ۔ چین نے ویت نام کو کہا تھا کہ وہ کمپوچیا سے جب تک فوجیں واپس نہیں بلائے گا، اس وقت تک ویت نام سے چینی فوجیں واپس نہیں ہوں گی ۔ تو کیا کمپوچیا میں چین کی حامی حکومت جو پول پاٹ کی سربراہی میں قائم تھی وہ واپس آگئی ہے ۔
۹ ۔ کیا ویت نام نے کمپوچیا کے فوجی محاذ آزادی کی امداد و اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے ۔
۱۰ ۔ اس پوری جارحیت میں، لشکر کسی میں سامراج کا کیا رویہ رہا ہے ؟

یہ اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہیں جو ہر مکتبِ خیال کو پریشان کر رہے ہیں اور وہ دانشور اور ادیب، شاعر اور مصور جو اپنے ادب، اپنی نگارشات کے لئے ان تمام "تضیوں" کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں ۔ وہ بھی ان پر بحث کرتے سنائی دیتے ہیں اور یہ موضوع ہماری مجالس میں اتنا ہی اہم ہو گیا ہے ۔ جتنا بھٹو کا پھانسی پر لٹکنا ۔ اس لئے ان سوالوں پر فوری ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا، کیونکہ جو شعلے آج ہمارے وطنِ عزیز کے اردگرد بلند ہو رہے ہیں ان سے ہم نہ تو آنکھیں بند کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہم ان کی گرمی سے اپنے کو بچا سکتے ہیں ۔ اسلئے ہمارے لئے بھی ضروری ہے ہم جنگ کے ان شعلوں کو بجھانے کی کوششوں میں دنیا کی تحریک امن میں شریک ہوں ورنہ یہ شعلے ہمیں بھی بھسم کر دیں گے ۔

عوامی جمہوریہ چین کے عظیم قائد ماؤزے تنگ جو ایک زمانے میں پوری ترقی پسند دنیا کے انقلابی جذبات کے مظہر تھے وہ امریکی سامراج کو کاغذی شیر کے لقب سے پکارتے تھے اور سوویت یونین کو اسی حوالے سے موردِ الزام ٹھہراتے تھے کہ وہ اس کاغذی شیر سے ڈر رہا ہے اور اس سے محبت والفت کی پینگیں بڑھاتا ہے ۔ لیکن آج چین کی قیادت جس طرح امریکہ سے دوستی والفت کی پینگیں بڑھا رہی ہے، اس سے تمام ترقی پسند دنیا کو پریشانی لاحق ہو رہی ہے ۔ چنانچہ یہ آخر کیسے ہوا کہ چین کے چوٹی کے

قائدین امریکہ کے دورے پر جاتے ہیں اور وہاں ویت نام کو سزا دینے کے متعلق اشارے کرنا شروع کر دیتے ہیں، واپس آتے ہیں اور جاپان میں رکتے ہیں اور اس کے بعد ۱۷ فروری کو چینی فوجیں ویت نام پر بغیر اعلانِ جنگ کئے ہوئے چڑھ دوڑتی ہیں، گو اس حملے کی تیاریوں کا چرچا کئی ہفتوں اور مہینوں سے سننے میں آرہا تھا اور چینی پراپگنڈہ اس انداز سے کیا جا رہا تھا جیسے ویت نام چین پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور چین سب کچھ حفظِ ماتقدم میں کر رہا ہے لیکن صورتِ حال خود امریکی اخبارات نے واضح کر دی تھی۔ چنانچہ نیویارک ٹائمز نے چین کے حملوں کے بارے میں اپنے نمائندے کے حوالے سے یہ لکھا تھا:

"چین کا ویت نام پر حملہ امریکہ کے لئے قطعاً حیرانی کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ چین کے قائدین نے اپنے دورہ امریکہ میں ہی اس بات کا اظہار کر دیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ ان قائدین نے واشنگٹن میں سینیٹروں اور اخبار نویسوں سے گفتگو کے دوران اس امر پر اصرار کیا تھا کہ ویت نام کو خونی سبق سکھانا پڑے گا۔ مزید برآں امریکی محکمہ جاسوسی کے پاس اس امر کی مصدقہ اطلاعات اور تصاویر موجود تھیں جن میں دکھایا گیا تھا کہ چینی فوجیں ویت نام کی سرحدوں پر جمع ہو رہی ہیں۔"

امریکہ نے اپنے "دوستانہ" اور "مربیانہ" تعلقات جو اس کے چین کے ساتھ استوار ہوئے ہیں، ان کو بروئے کار لاتے ہوئے چین کو اس جارحیت سے روکنے کی کوشش کیوں نہ کی، تو اب اس کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ امریکہ اور چین دونوں ہی اس حملے کے حامی تھے اور ان سے کچھ مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

<u>مقاصد</u>: دراصل پچھلے پانچ چھ برسوں میں افریقہ، دنیائے عرب، لاطینی امریکہ وغیرہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان سے امریکی سامراج کو زبردست پریشانی لاحق ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان تبدیلیوں نے چین کو بھی لرزاں و ترساں کر دیا ہے کیونکہ چین اب تقریباً ایک دہائی سے سوشلسٹ روس کو اپنا دشمن نمبر ایک تصور کرتا ہے، شروع شروع میں وہ اس دشمن سے نبٹنے کے لئے، اپنے کو عظیم انقلابی کے طور پر پیش کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے پوری کمیونسٹ تحریک کو باور کرانے کی کوشش کی کہ سوویت روس سامراج دشمنی انقلاب اور سوشلزم کی راہ سے ہٹ گیا ہے اور چین ہی اس راستے پر سختی سے گامزن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک میں چین نے کمیونسٹ پارٹیوں اور ترقی پسند تحریک میں نفاق کے بیج بو دیئے اور عملاً آزادی کے لئے لڑنے والی تحریکوں کو چین نواز اور ماسکو نواز گروہوں میں تقسیم کر کے ان کو ان کے اصل مقصد "سامراج دشمنی" کی راہ سے ہٹا دیا۔ لیکن جب قومی آزادی کی تحریکوں نے اپنے تجربے سے حقیقت کو جانا تو ان کو محسوس ہوا کہ وہ کس طرح اپنے راستے سے بھٹکے ہیں اور ان کی منزل کھوٹی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب پچھلے پانچ چھ برسوں میں ان تحریکوں کے اندر ایک زبردست تبدیلی آئی ہے اور چینی مؤقف کو رد کر دیا گیا ہے چنانچہ جیسے جیسے چین کو انقلابی اور کمیونسٹ تحریکوں میں عدم مقبولیت کا سامنا ہوتا گیا ہے اسی انداز اور رفتار سے وہ سامراج کے قریب آتا گیا ہے اور اس کی ضرورت اس کو سوویت روس اور سوشلسٹ بلاک دشمنی جاپان، امریکہ محور میں شرکت پر مجبور کرنے لگی۔ چنانچہ چین نے اس محور کی حمایت کے بل پر اپنی سیادت کے قیام

کے لئے ویت نام پر حملہ کیا۔

ویت نام پر حملہ کرنے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ویت نام کو پُرامن فضا مہیا نہ ہونے دی جائے کیونکہ اگر ویت نام کو پُرامن فضا حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ملک کی معیشت کی سوشلسٹ بنیادیں مستحکم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پورا جنوب مشرقی ایشیا اس سے متاثر ہونا لازمی ہے اور چین اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس سے اس کی اس پورے علاقے میں اپنے بالا دستی اور توسیع کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں کیونکہ چین کے قائدین کی نفسیات میں یہ بات رچی بسی ہوئی ہے کہ وہ اس پورے خطے کے جائز حاکم ہیں، وہ کسی صورت یہ فراموش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ ان کے شہنشاہوں نے ہزار برس تک ویت نامیوں پر اپنا تسلط قائم رکھا ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے کمپوچیا میں چین نے ایک ایسی حکومت کی پشت پناہی کی جو ایک ایسا "سوشلزم" قائم کرے جس کو ایک عظیم قید خانہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے اور اس کے ذریعے ویت نام کو مسلسل پریشان کیا جاتا رہے۔ اس لئے جب کمپوچیا میں انقلاب برپا ہو گیا اور چین کی پسندیدہ حکومت کا تختہ الٹا گیا تو چین کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہی۔ چنانچہ اس وقت یہ طے کیا گیا کہ چین کی فوجیں ویت نام کو سبق سکھائیں۔

نتائج: چین اور امریکی سامراج دونوں ہی یہ خیال کر رہے تھے کہ دنیا کی رائے عامہ چین کی اس جارحیت کو کمپوچیا کے واقعات سے منسلک کر کے ویت نام کو موردِ الزام ٹھہرائے گی۔ لیکن امریکی سامراج یہ فراموش کر گیا کہ کمپوچیا کی چین نواز حکومت جو پول پوٹ کی سربراہی میں قائم تھی اس کے مظالم اور جبر کی داستانیں تو خود اس کے اخباروں نے پورے دو تین سال شائع کی ہیں۔ اب ایسی حکومت کے تختہ الٹ جانے کے لئے صرف ویت نام کو کیسے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے یہ کمپوچیا کے عوام تھے جنہوں نے اس جبر کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور ان کی قیادت وہی کمیونسٹ کر رہے تھے جو کمپوچیا کی کمیونسٹ پارٹی کے قائد رہ چکے تھے وہ پال پوٹ کی حکومت میں بھی تھے لیکن پول پاٹ کے مظالم سے تنگ آ کر وہ جنگلوں میں چلے گئے اور انہوں نے مسلسل گوریلا منظم کئے اس عمل میں ویت نام کی ہمدردیاں بھی اُن کو حاصل تھیں اور ویت نام نے ان کی امداد بھی کی ہے، جیسے ہر کمیونسٹ تحریک دوسری کمیونسٹ تحریک کی حمایت کرتی ہے۔ چنانچہ جب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی رائے عامہ نے چینی جارحیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود امریکہ کے اندر کارٹر انتظامیہ کو موردِ الزام ٹھہرایا جانے لگا اور جنگ کے امکانات سے خوف زدگی نے چینی جارحیت کے خلاف احتجاج کو اور بھی تیز کر دیا اور پھر جب سوویت یونین کی طرف سے اس جارحیت کے خلاف بیانات شائع ہونے شروع ہوئے تو امریکہ ایک گونہ مطمئن تھا کہ شاید سوویت یونین ویت نام کی امداد کے نام پر چین پر چڑھ دوڑے گا اور اس کی "چین اور روس" کو لڑانے کی دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ لیکن سوویت روس کے بیانات نے تمام دنیا کو چونکا دیا اور جنگ کے شعلے لپکتے دکھائی دینے لگے تو اس سے عوامی احتجاج بڑھنے لگا اور لطف یہ ہے کہ یہ احتجاج سب سے زیادہ خود امریکہ اور جاپان میں منظم ہوا اور جاپان کے اخبارات نے چین کی جارحیت کے خلاف زبردست اداریے لکھے۔ دوسری طرف

چین کو یہ خیال تھا کہ وہ ویت نام کو دنوں میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن اس کی مزاحمت نے چین کو ایک ایسی دلدل میں پھنسا دیا کہ نہ کھائے بنتی اور نہ چھوڑے بنتی۔ بہر حال چین اپنی فوجیں نکالنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ کیونکہ عالمی رائے عامہ نے اسے یکہ و تنہا کر دیا ہے، اب ہمارے ہاں نوائے وقت کے بعض قابل تجزیہ نگار یہ کہتے ہیں کہ چین نے سوویت روس کو ڈکری" کر دی ہے۔

لیکن اصل صورت کیا ہے کہ ویت نام سرخرو ہوا ہے، چین بدنام ہوا ہے اور ایک عالم اس کی جارحیت پر تھوکر رہا ہے، تیسرے "کمپوچیا کا انقلاب قائم و دائم ہے۔ کل میزائل کے بحران کے بعد "کیوبا" کا انقلاب محفوظ ہوا تھا۔ آج اس بحران میں کمپوچیا کا انقلاب محفوظ ہے۔ اب یہ کس کی فتح ہے۔

لیکن ایک عالم اب بھی سہما ہوا ہے کہ کہیں پھر یہ چنگاری شعلوں میں نہ بدل جائے اور امن عالم کو بھسم نہ کر ڈالے۔ اس لئے آج پاکستان ہو یا ویت نام یا افغانستان کوئی بھی ملک ہو اس کو اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے امن کی فضا بے حد ضروری ہے، کیونکہ اسی میں ادب زندہ رہ سکتا ہے، شعر کہے جا سکتے ہیں، مصوری کی جا سکتی ہے اور خوشحال مستقبل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال ایک نیا مستقبل جنم لے رہا ہے اور ویت نام جو ایک جذبے کا نام، ایک شعور کا ہیولا ہے وہ مٹ نہیں سکتا۔

کوند جاؤ ـــــ سنگ آخر کا نشاں مٹ جائے گا
یہ جہانِ کہنہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے
وہ اُفق پر کچھ نئی سرگوشیاں ہونے لگیں
ظلم کے سائے پگھلتے ہیں سحر ہونے کو ہے

توھُو (ویت نام)
ترجمہ: کشور ناھید

خون اور شگوفے

سو سال کی مجنونانہ جستجو
اور لامحدود تمناؤں کے بعد
خوشی ملی تو ایک خواب سی معلوم ہوئی
شفاف آسمان
نیلا ـــــ ناقابلِ یقین حد تک نیلا
اور زمین
ایسی پرسکون، جیسے ایک سوتا ہوا بچہ
دوسرے جنم کا وقت
کایا کلپ کا موسم
اس صدی کا موسمِ سرما
بہار میں تبدیل ہو رہا ہے
اے ویت نام!
تم اس حشر ساماں سمندر کی تہہ سے
ایک آسمانی مخلوق کی طرح نمودار ہوتے ہو
بحران کے زمانوں میں
تو پہاڑوں کی روح
سمندروں کی روح پر غالب آ گئی تھی
اب نہ وہ طوفانی لہریں ہیں

نہ وہ ہواؤں سے باتیں کرتے دھارے
ہمارے پہاڑوں کے قدموں نے
سمندروں کو گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے
اب وہ ہی خاک اور راکھ ہیں
کہ جو ہمیں اس رسوائی میں دھکیلنا چاہتے تھے
مگر ہم
شعور اور آگہی کا کندن بن گئے
انہوں نے تو ہمیں
بے عزتی کے بازار میں فروخت کرنے کا ارادہ کیا تھا
مگر ہم نے تو کنول کی طرح
دلدل کو بھی معطر کر دیا
ہم اپنی مادرِ وطن کے لئے
بڑی خوشی کے ساتھ
اپنی جان اپنا سب کچھ
قربان کر دیں گے
یہ جھنڈا ہمارا لہو
اور ہمارا گوشت پوست
ہم انسان ہیں
ہم بکنے کے لئے نہیں ہیں
تم بین کر رہی ہو
ننھی بہنو!
تم مت روؤ
ہر چند کہ تمہاری ماں اور تمہارا باپ
مارے گئے
مگر ان آنسوؤں سے
شاید دشمن کا چہرہ چمک اُٹھے

تمہیں اپنی آنکھیں
امریکی قزاقوں کے سروں کو نشانہ بنانے پہ
مرکوز رکھنی چاہئیں
عظیم محبت، آگ اور آہن سے بھی قوی تر ہوتی ہے
یہ میدانِ جنگ تو انسانوں کے دلوں میں
پیراستہ ہے
دھوپ اور بارش کی یورش
اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی
زمین ہمیشہ ہی گول اور خوبصورت رہی ہے
زندگی ہم سے پیار کرتی ہے
اور ہمیں زندگی کی خاطر کامران ہونا چاہیئے
اے غلیظ بھیڑیو!
تمہارا یومِ حساب آپہنچا ہے
ہمیں ہمارا عظیم ملک
ہمارا نیلا آسمان
واپس دو
اور ہم تمہاری قبروں کے لئے
بموں کے خول دے دیں گے
تاریخ مطالبہ کرتی ہے
کہ تم اپنے سر، اپنے ہی مظالم
کے بوجھ سے
ہمارے سورما دارالحکومت
کی پاک تلوار تلے جھکا لو
چاروں سمندر
ہنوئی ہنوئی پکار رہے ہیں
ہوائی قلعے مسمار ہو جاتے ہیں
اور جھیل میں آگ لگ جاتی ہے

پھولوں جیسے ننھے ننھے دیہاتوں میں
بہار لوٹ آئی ہے
اور سارے ملک میں جنوب سے شمال تک
مہک کی سواری خیمہ زن ہے
چچا ہو، بہت خوش ہوں گے

جاؤ اپنا یہ کارنامہ ان کی نذر کرو
اور اسے اُن سب کے نام معنون کرو
کہ جو ہمارے ساتھ قزاقوں سے لڑے ہیں

غم کسی ایک فرد کی جائداد نہیں ہے
یہ کارِ عظیم ساری انسانیت
کی سربلندی کا نشان ہے
اے ویت نام!
کیا یہ خون اور یہ غنچے
کہ رنگوں سے ہمارے دنوں کو بھگو دیں؟
زخم بہت جلد نہیں بھرا کرتے ہیں
اے میری جنم بھومی!
ابھی تو تمہارا آدھا جسم
اذیت کی بھٹی میں ہے
مگر خوشی کا موسم
بہار کی نوید لے کر آیا ہے
آج محاذِ جنگ پہ خاموشی ہے
جنگل اور پہاڑ
آزادی کے رنگ میں سرسبز ہو گئے ہیں
اے میکانگ دریا کی لہرو!
اُچھلو، خوب اُچھلو

اور سالوں کی غلاظت اور کیچڑ کو دھو ڈالو،
ان خاردار تاروں کو توڑ ڈالو
کہ جو لوگوں کو جُدا کرتی ہیں
اور ان کے دل توڑتی ہیں
ہم پھر یک جا ہوں گے،
اے میرے وطن کے بچو!
خون، خون میں مل جاتا ہے
شنگرفی، سرخ خون!
اے سائیگون! اے ہوئے!
دوسرے جنم کا دن قریب ہے
جب دریا اور پہاڑ
اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ
پھر مل جائیں گے

ہو ئی کالف (ویت نام)
ترجمہ: کشور ناھید

ہتھیلی پہ صبح

ماں بچے کو
ایک ہی دفعہ اپنے پیٹ میں پرورش کرتی ہے
اور پیدا کرتی ہے
مگر ہم نے اپنی فیکٹری پانچ دفعہ دوبارہ بنائی ہے
یہ ققنس نہیں ہے
کہ دوبارہ اپنی راکھ سے زندہ ہو
بلکہ یہ ہمارے خالی ہاتھ اور پانچ انگلیاں ہیں
کہ جو صبح تخلیق کرتی ہیں
دن کی روشنی واپس لاتی ہیں
اور سالوں اور مہینوں کو تموج کو رواں کرتی ہیں
وقت ہمارے ہاتھ میں
ایک چمکدار آہنی مچان بن جاتا ہے
ہم بناتے ہیں اور ہم تخلیق کرتے ہیں
ذرا سا زنگ بھی ہو
تو ہم اسے دھو ڈالتے ہیں
ہم اسے کھرچ دیتے ہیں
تین مرتبہ ہم عمارت کے مچان پر چڑھے
تین مرتبہ، ہم نے قطاروں میں اپنی اپنی جگہ

کھڑی مشینوں کی مرمت کی
تمہیں مبارک باد دیتے ہوئے، اے مزدور!
جس نے آسمان تک لگے زنگ کو کھرچ دیا تھا
تمہارے ہاتھوں کی آگ
ہزاروں چمکتے ستاروں میں منکشف ہو کر
فولادی کڑیوں کو جوڑ دیتی ہے
یہ اتنی جاوداں اور خوبصورت ہے
کہ جتنی کائنات کی اقلیدس
دھکتی بھٹی کے کارکن! تمہیں مبارک ہو
لامحدود مستقبل کے محبت بھرے بوسوں کے ساتھ!

توھو (ویت نام)
ترجمہ: کشور ناھید

سبز وردی

میری وردی کو رنگ دو
ایک دفعہ پھر، برگ خیز سبز
میری محبوب!
جنگ میں سفید رنگ پہننے کی اجازت نہیں ہے

میں ہواؤں اور بارش سے
ایک بار پھر گزرنے جا رہا ہوں،
کندھوں پہ بندوق رکھے
اور فتح مندی کی سبز وردی پہنے

بموں اور گولوں کی بارش سے
نہ تھمنے والے قتل و غارت کے طوفان سے
میں واپس لوٹوں گا
اپنی مصیبتوں کو بھلانے کے لئے
اپنے پیدائشی گاؤں کے سبز جنگلوں میں

یہ وردی جو تم میرے لئے رنگ رہی ہو
میری جلد کے اندر، مجھے گرمی پہنچائے گی،
اور ہماری محبت کے موسم بہار میں
ہمیشہ سبز رہے گی

میری ماں
"(کالی ماؤں کہ جن کے بیٹے بچھڑ جاتے ہیں)
تم نے مجھے انتظار کرنے اور اُمید کا سبق سکھایا
وہی سبق جو تم نے خود تلخ دنوں میں سیکھا تھا
مگر میرے اندر
زندگی نے اسی عارفانہ اُمید کی رمق کو مار ڈالا ہے
میں وہ نہیں ہوں
کہ جو انتظار کرتا ہے
بلکہ وہ کہ جس کا انتظار کیا جاتا ہے
اور ہم خود اُمید ہیں
تمہارے بچے اس یقین سے گندھے ہیں
کہ جو زندگی کو سینچتی ہے
تمہارے بیٹے زندگی کو تلاش کر رہے ہیں"

نیتو ——— انگولا

مزاحمتی ادب

تراجم



لفظوں کو سینے میں سلامت رکھو
ورنہ ہوا اپنی راکھ کی طرح اڑا لے جائے گی

(محمود درویش

●

ان قید خانوں کے نام جہاں میری زندگی کو راتوں میں بدل دیا گیا
ان ہتھکڑیوں کے نام جن سے مجھے دلہن بنایا گیا
ان فائلوں کا تذکرہ جو میرے محافظوں نے تیار کیں
ان تمام گالیوں کی فہرست جن سے مجھے نوازا
یہ سب کچھ میں زیتون پہ کھود ڈالوں گی۔

(توفیق زیاد)

جلی عبدالرحمان (سوڈان)
ترجمہ: احمد ندیم قاسمی

لورکا کے نام

آج کا دن کیسا بھورا بھورا ویرانہ ہے
بادل شہر کے افق پر ڈھیر پڑے ہیں
اور غروبِ آفتاب اُداس ہے
میرے پیارے لورکا تو نے سیاہ دلوں کے بارے میں کیا کہا تھا
"آنکھیں کھول دو اور خواب مت دیکھو"
معاف کرنا لورکا
گلی یوں کانپ رہی ہے جیسے غرناطہ میں تیرا لہو کانپا تھا
اور ساز کے تار نوحہ کر رہے ہیں
تو نے آزادی اور موت پر کتنے نغمے لکھے
کیونکہ آزادی انسانوں کی مسرت ہے
اور موت ایک ایسی نیند ہے جس میں کوئی دھند نہیں کوئی آواز نہیں
اگر تمہیں ایک جنازہ نظر آتا
جسے لوگ جلدی جلدی سے قبر کی طرف لئے جا رہے ہوتے
اور سڑکوں پر لوگ دم بخود کھڑے ہوتے
اور آنسوؤں کے بغیر رو رہے ہوتے
(خدا اسے مغفرت نصیب کرے
تو میرے لورکا تم کیا کرتے
جب ننگی چھاتیوں والی عورتیں کانپتے لفظوں میں اعلان کرتیں

کہ وہ ایک دولہا تھا

اور ابھی اس کی شادی کے دیئے بجھائے بھی نہیں گئے

اور اس کا بستر معطر ہے

اے لورکا ـــــ مجھے شاعری کی قوت بخش

تاکہ میں تیرے "بلڈ ویڈنگ" کا سا شاہکار لکھ سکوں

ایک مینارہ رات کے دریا میں ڈوب گیا ہے

میرے گاؤں میں سب سے بلند مسجد کا یہ مینار ہے

اس پر سے میرا دادا صبح کی اذان دیتا ہے

اس کی آواز سن کر مرغ جاگتے تھے اور پرندے چونکتے تھے

(اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے)

میرا دادا اب ایک خالی کھوپڑی میں بدل چکا ہے

جو قبر میں پڑی ہے

کیڑوں نے اس کی آنکھیں چوس لی ہیں

اور موت ایک ایسی نیند ہے جس میں کوئی دھند نہیں کوئی آواز نہیں

اے لورکا اے وہ جس نے موت پر فتح پائی

میرا دادا حلفہ کا ایک کسان تھا

جس نے کسی مہمان پر اپنا دروازہ کبھی بند نہ کیا

اس کی موت پر سارا گاؤں رویا

شدید گرمی میں بھی زمین کو آنسوؤں سے بھگو دیا

وہ کوئی ایک ہزار کی تعداد میں تھے

کھجوروں کے درخت تک روئے

اور اے لورکا

روٹی کا صرف ایک ٹکڑا اس کا سہارا تھا

اور اس کے پھیپھڑوں کو تمباکو کی کوئی ہوس نہ تھی

میری روح مہندی کے درخت کی مانند ہے

سخت ـــــ خون سے محروم

اور گلی کانپ رہی ہے
اندھے اندھوں کی رہنمائی کر رہے ہیں
ایک بوڑھی عورت اپنے آپ کو جوان سمجھ رہی ہے
کیا خضابوں سے جوانی واپس آجاتی ہے
اے دوستو میں لہروں میں تنہا ڈوب رہا ہوں
ہاتھ پھیلاؤ اور مجھ سے پوچھو ——— "تم کیسے ہو"
یہ بوڑھا جو اپنی لاٹھی پر جھکا ہوا چل رہا ہے
یہ تو بالکل میرے دادا کی طرح ہے ——— دادا جان
کیا بات ہے میرے بچے
میرے دکھوں کو سینے سے لگالو اور میرے خوف دور کر دو
مجھے تھپکی نہ دو
صرف تھپکی کافی نہیں
اے لورکا تم نے موت پر فتح پائی تھی
جب وہ تمہیں مقتل کی طرف لے گئے تھے
تو تمہاری خاموشی تمہاری شاعری سے بھی زیادہ بلیغ تھی
اے لورکا مجھے کہہ تو دو
کوئی ایسی چیز جو میری بانسری میں سے گزرے
تو مجھے زندہ رہنے پر اکسائے

ایمے سیزیئر
ترجمہ: مختار صدیقی

نظم

"کیلسے درات" کے عالی دودمان کو سلام
اُن کو سلام
جنہوں نے کوئی چیز ایجاد نہ کی،
جنہوں نے کوئی دریافت بھی نہ کی،
جنہوں نے کسی چیز کو بھی اپنا تابع نہ بنایا،
بلکہ اپنے آپ کو عالمِ اشیا کے اصل جوہر میں کھو دیا،
وہ سطح سے بیگانے رہے، لیکن عالمِ اشیا کی حرکتِ جان کے
پوری طرح قبضے میں تھے،
انہوں نے عالمِ اشیا کی کسی چیز کو مسخر کرنے کی کوئی پروا نہ کی
بلکہ عالمِ اشیا کے فطری کھیل میں پوری طرح شریک رہے!
یہی لوگ ہیں جو کائنات کے پہلوٹھے بیٹے ہیں
یہی لوگ ہیں جن تک کائنات کی ہواؤں کی رسائی ہے
یہی لوگ ہیں جن تک کائنات کی تمام ہواؤں کی برادرانہ رسائی ہو سکتی ہے
یہی لوگ ہیں جو کائنات کی مقدس آگ سے تابندہ ہیں
یہی لوگ جو کائنات کے گوشت کا گوشت ہیں
یہی لوگ ہیں جو کائنات کی ہر دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ ہیں!

(طویل نظم سے اقتباس)

تادیوش روزےوچ

محمد سلیم الرحمان

گھاس

میں اینٹوں سے چنی دیوار کی
ریخوں میں اگتی ہوں
جہاں دیوار سے دیوار ملتی ہے
جہاں دیوار میں دیوار جڑتی ہے
جہاں دیوار محرابوں میں ڈھلتی ہے
میں اُگتی ہوں
وہاں میں ایک اندھے بیج میں جس کو
ہوا لے آئی ہو
پہنچ جاتی ہوں

میں خاموشی کی درزوں میں
بڑھے جاتی ہوں دھیرج سے
میں دیواروں کے
گر کر خاک ہو جانے کی
ہر دم راہ تکتی ہوں

اور اس کے بعد ناموں اور چہروں کو
چھپا لوں گی

مصنف :۔ ژاں دیلو
ترجمہ :۔ زاھد ڈار

ایک چڑیل کی نصیحت

جب پو پھٹ رہی ہو
ہنسنے سے اجتناب کرو
ان درختوں کی بات مت سنو
جو راستوں پر پہرہ دیتے ہیں

سوئی ہوئی زمین کو
آدھی رات سے پہلے
اپنا نام مت بتاؤ

بارش اور برفباری کی طرف
اپنا ہاتھ مت بڑھاؤ

کسی کے لئے اپنی کھڑکی مت کھولو
سوائے ان چھوٹے چھوٹے سیاروں کے
جنہیں تم خوب جانتے ہو

اعتماد کے بدلے اعتماد
تم جو مجھ سے مشورہ کرنے آئے ہو
خبردار خبردار

کیا پتہ کس وقت کیا ہو جائے

شاعر: ناظم حکمت
ترجمہ: احمد مشتاق

تمہارے ہاتھ اور ان کے موت

تمہارے ہاتھ
پتھروں کی طرح مصمم اور قید خانے میں گائی جانے والی دھنوں کی طرح اُداس ہیں
تمہارے ہاتھ
بڑے بڑے ہیں، کام میں لائے جانے والے جانوروں کی طرح
تمہارے ہاتھ بھوکے بچوں کے غصیلے چہروں کی طرح ہیں
تمہارے ہاتھ
شہد کی مکھیوں کی طرح مشاق، محنتی
اور دودھ سے بھری چھاتیوں کی طرح بوجھل ہیں
فطرت کی طرح دلیر تمہارے ہاتھ
اپنی کھردری کھال کے نیچے دوستی کی نرمی چھپائے ہوئے ہیں

یہ دنیا بیل کے سینگوں پر نہیں کھڑی
اس دنیا کو تمہارے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں

اور لوگو! اے میرے لوگو
وہ تمہیں کھانے کو جھوٹ دیتے ہیں
جبکہ تم بھوکوں مر رہے ہو
جبکہ تمہیں گوشت اور روٹی کی ضرورت ہے

اور سفید میز پوش والی میز پر
ایک بار، پیٹ بھر کے کھائے بغیر
تم اس دنیا سے
اور اس کے پھل دار درختوں سے رخصت ہو جاتے ہو
اے لوگو! اے میرے لوگو
خاص طور پر تم جو ایشیا میں رہتے ہو اور افریقہ
جو مشرق قریب، مشرق وسطیٰ اور بحرالکاہل کے جزیروں میں رہتے ہو
تم جو میرے وطن کے رہنے والے ہو
تم جو کل انسانی آبادی کے ستر فی صد سے زیادہ ہو
اپنے ہاتھوں کی طرح تم بوڑھے ہو اور فکر مند
پھر بھی انہی کی طرح متجسس، پرجوش اور جوان

اے لوگو! اے میرے لوگو
میرے یورپ کے باسیو! میرے امریکیو
تم چوکنے ہو
تم نڈر ہو
لیکن اپنے ہاتھوں ہی کی طرح
تم جلد ہی سب کچھ بھول جاتے ہو
اور تمہارے ہاتھوں ہی کی طرح
تمہیں بھی آسانی سے احمق بنایا جا سکتا ہے
دھوکہ دیا جا سکتا ہے

اے لوگو! اے میرے لوگو
اگر ریڈیو اور ٹی وی جھوٹ بولتے ہیں
اگر دیواروں پر لگے پوسٹر اور اخباروں میں چھپنے والے اشتہار جھوٹ بولتے ہیں،
اگر پردہ سیمیں پر نمودار ہونے والی لڑکیوں کی ننگی ٹانگیں جھوٹ بولتی ہیں

اگر دعا جھوٹ بولتی ہے
اگر خواب جھوٹ بولتا ہے
اگر لوری جھوٹ بولتی ہے
اگر شراب خانے کا سارنگی بجانے والا جھوٹ بولتا ہے
اگر مایوس دن کے بعد آنے والی رات کی چاندنی جھوٹ بولتی ہے
اگر الفاظ جھوٹ بولتے ہیں
اگر رنگ جھوٹ بولتے ہیں
اگر آواز جھوٹ بولتی ہیں
اگر وہ سب جو تمہارے ہاتھوں کی محنت کو لوٹتے ہیں
اور تمہارے ہاتھوں کے سوا ہر شے، اور ہر کوئی جھوٹ بولتا ہے
تو یہ سب اس لئے
کہ تمہارے ہاتھوں کو
مٹی کی طرح مطیع، تاریکی کی طرح اندھا اور حیرد بے کے کتوں کی طرح احمق
اور گونگا بنایا جا سکے
تاکہ
تمہیں اس فانی مگر شاندار دنیا میں، جہاں ہم تھوڑے عرصے کے لئے آتے ہیں
سرمایہ داروں کی حکومت اور ان کے ظلم و ستم کے خلاف
بغاوت کرنے اور اُسے ختم کر دینے سے روکا جا سکے

ایتلا جوزف
ترجمہ:۔ احمد مشتاق

ماں

ایک اتوار
وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا مگ اُٹھائے
اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ
تھوڑی دیر تک
پھیلتے ہوئے اندھیرے میں بیٹھی رہی

وہ دستے والی چھوٹی دیگچی میں کھانا لے کر آئی تھی
جو ان لوگوں نے اُسے دیا تھا جن کے ہاں وہ کام کرتی تھی
بستر میں پڑے پڑے میں سوچتا رہا
امیر لوگوں کے پیٹ ہمیشہ بھرے رہتے ہیں

میری ماں ایک مسکین سی عورت تھی
وہ کم عمری ہی میں مرگئی جیسے دھوبنیں مرجاتی ہیں
ان کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں بوجھ اٹھاتے اٹھاتے
اور استری کرتے کرتے ان کے سر دکھنے لگتے ہیں

ان کے لئے پہاڑ میلے کپڑوں کے ڈھیر ہیں
ان کے بادل بھاپ سے بنتے ہیں
اور اگر وہ آب و ہوا کی تبدیلی چاہیں

تو بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھے پر جا سکتی ہیں

میں اسے استری کرتے کرتے تھک کر دم لیتے دیکھتا ہوں
اس کے روز دبلے ہوتے ہوئے لاغر جسم کو
سرمائے نے توڑ ڈالا تھا
پرولتاریو اس بارے میں بھی سوچو
کپڑے دھوتے دھوتے
اس کی کمر کمان ہو گئی تھی
مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ابھی جوان ہے
صرف اپنے خوابوں میں
وہ دھلا ہوا ایپرن پہنے ہوتی
اور پھر ڈاکیہ بھی اسے ہیلو کہتا

تانجھیریا یروبا
ترجمہ:۔ کشور ناھید

بھوک

بھوک انسان کو چھت تک چڑھا دیتی ہے
اور اُسے کڑیاں پکڑ کر لٹکنے پر مجبور کر دیتی ہے
بھوک انسان کو زمین پر لٹا دیتی ہے
مگر آرام نہیں کرنے دیتی
بھوک انسان کو زمین پر لیٹ کر
کڑیاں گننے پر مجبور کر دیتی ہے
جب مسلمان بھوکا نہ ہو تو کہتا ہے
ہم پہ بندروں کا گوشت حرام ہے
اور جب ابراہیم بھوکا ہو تو
لنگور بھی کھا جاتا ہے
بھوک، عورت کو حرم کی گرسنگی
میں لا کھڑا کرتی ہے
وہ عورت
دن میں گلی میں بھاگ کھڑی ہوتی ہے
جو بھوکا ہو
وہ روایتوں کی پابندی نہیں کرتا

جو بھوکا ہو
وہ موت کی بھی پرواہ نہیں کرتا
جو بھوکا ہو
وہ تو زکواۃ کی رقم بھی چوری کر لیتا ہے
جب موت دروازہ بند کر دیتی ہے
بھوک اُسے کھول دیتی ہے
میں نے کل ہی اپنے پیٹ کا دوزخ بھرا ہے
اب مجھے بھوک سے کوئی علاقہ نہیں
اپنے ہی گلے سے زیادہ، اور کوئی خدا نہیں
ہمیں اِسے روز قربان کرنا پڑتا ہے

انگولا کا شاعر اگستینو نیتو
ترجمہ:۔ کشور ناہید

خون اور بیج

ہم
افریقہ جیسے دور دراز ملک سے
انسان کی بدنیتی سے ماورا
غیر مفتوحہ اور پرشکوہ جنگوں کے اس پار
زندگی کے تموج کے اس پار
کہ جو دریاؤں کے خروش میں
بے تاب و بے پایاں اور لاانتہا ہے
کہ جو طبل کی مترنم آواز میں مرتعش
بھرپور مگر نوخیز آنکھوں سے ہویدا
اور لاانتہا بازؤں کے تموج سے آشکار
اُمید اور دکھ کا دھارا

افریقہ جیسے دور دراز ملک سے
پنجے کے نیچے
ہم دکھ اور اُمید کے خوف میں نہاتے ہیں
ہمارے غم اور ہماری قوت کا خون
پانی پانی ہوتا ہے
خون ہوتا ہے

ہماری جبری مشقت کا وہ پسینہ
کہ جو ہم کپاس کے کھیتوں میں بہاتے ہیں
خون ہوتی ہے
ہماری بھوک، جہالت، مایوسی اور موت
ہاں اور ایمانداری کے زخموں میں
خون اور بیج
افریقہ جیسے دور دراز ملک سے
کالے
مگر دوستی کی صبح کی طرح اُجلے
آزادی کے قدموں کی طرح
خواہشوں اور قوت سے لبریز
ہماری چیخیں
وہ طبل ہیں جو خواہشوں کی نوید دیتے ہیں
ہنگامہ خیز آوازوں میں
کہ جو قوموں کی موسیقی ہیں
ہماری چیخیں محبت کی وہ حمد ہیں
کہ اس زمین پہ دلوں میں ہی پرورش پا سکتی ہیں
جیسے سورج میں بیج
افریقہ کی چیخیں
صبحوں کی چیخیں
کہ جب سمندروں سے مردے اُٹھے
اور انہوں نے
خوف اور بیج کو پابہ زنجیر کیا

دیکھو
یہ ہمارے ہاتھ ہیں

یہ ہاتھ انسانی برادری کے لئے وا ہیں
اس یقین میں متحد ہیں
کہ انسان کا مستقبل
حق، امن اور دوستی کا پیامبر ہوگا
ہمارے پنجوں کے نیچے
گلاب اُگتے ہیں
کہ جن میں زائرے کے دریاؤں کی
پُرجوش لہروں کی خوشبو ہے
کہ جن میں، ہومبو کے درختوں کا شکوہ ہے
ہمارے ذہنوں میں
افریقہ کے لئے دوستی کی شاہراہ ہے
یہ شاہراہ، ساری دنیا کے لئے ہے
ہماری آنکھیں
کہ جو زندگی کے خون کا منبع ہیں
ان ہاتھوں کی جانب نگراں ہیں
کہ جو ساری دنیا میں محبت ارزاں کر رہے ہیں
ہاتھ کہ جو مستقبل میں ایستادہ ہیں
افریقہ کی قوتِ حیات میں ایمان تازہ کرتے ہیں
انسانیت کی آماجگاہ افریقہ
افریقہ جیسے دور دراز ملک سے
اُمید کے آفتاب تلے
زیست شناسی کا دوبارہ عمل
بھائی چارے کا وہ بندھن
کہ جس کا ضمیر

امن کی مٹھاس سے اٹھایا گیا ہو
خون اور بیج
مستقبل کے لئے
یہ ہیں ہماری آنکھیں
امن کے لئے
ہماری آواز ہے
ہمارے ہاتھ میں
افریقہ سے محبت میں گندھے ہوئے، متحد!!

زبگینو ہربرٹ (پولینڈ)
ترجمہ: سہیل احمد

شہنشاہ کا خواب

شگاف! شگاف! شہنشاہ سوتے میں چیختا ہے اور شتر مرغ کے پروں کا بنا
ہوا چھتر تھراتا ہے۔ سپاہی جو تلواریں سونتے غلام گردشوں میں ٹہل رہے ہیں سمجھتے ہیں
کہ شہنشاہ ضرور کسی محاصرے کا خواب دیکھ رہا ہے ابھی ابھی اس نے دیوار میں کوئی رخنہ
دیکھا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ سپاہی قلعے کے اندر داخل ہو جائیں
حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہ اس وقت ایک مکوڑا ہے جو بچے کھچے کھانے کی
تلاش میں فرش پر ادھر سے اُدھر دوڑ رہا ہے۔ یکایک اُسے اپنے سر پر ایک
مہیب پاؤں نظر آتا ہے جو اسے کچلنے ہی والا ہے۔ شہنشاہ کوئی شگاف ڈھونڈھتا
ہے جس میں وہ دبک جائے۔ فرش ہموار اور پھسلواں ہے
ہاں۔ شہنشاہوں کے خوابوں سے زیادہ معمولی کوئی چیز نہیں

پابلو نرودا
ترجمہ :- سہیل احمد

میڈرڈ ۱۹۳۶ء

اے میڈرڈ۔ تو تنہا ہے لیکن پر شکوہ،
جولائی کے مہینے نے تجھے تیرے ہنستے ننھے سے جھونپڑے میں اچانک آلیا
تیرے گلی کوچے روشن تھے
اور تیرے خواب بھی روشن تھے

جرنیلوں کی دھواں دار دھاڑیں
غیظ و غضب میں ڈوبی ہوئی سیاہ وردیاں،
کیچڑ سے بھرے ہوئے گندے پانیوں کے طوفان
منہ کی کف کے دریا
ان طوفانوں سے تیرے قدم اکھڑ گئے

اُن آنکھوں کے ساتھ جو ابھی خواب آلود تھیں
پتھروں اور بندوق سے، میڈرڈ! اے تازہ مجروح
تونے اپنا دفاع کیا
تو گلیوں میں اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا
تیرا قیمتی لہو ندیوں کی طرح بہہ رہا تھا
تو اوقیانوس کی موجوں کے ساتھ مل کر پکارا

تیرا چہرہ (خون جیسا درخشاں)
اب ہمیشہ کے لئے بدل چکا تھا
اب وہ ایک انتقام جو پہاڑ کی طرح سیاہ تھا
اب وہ کھنکھناتی ہوئی چھریوں کی مانند تھا
جب تیری آتشیں تلوار
ظالموں کی لشکر گاہوں اور بد دیانت کلیساؤں کے سروں پر اُتری
تو ہر سمت خاموشی چھا گئی
بس صبح کی سفیدی اور پرچم کچھ کہہ رہے تھے
اور تیرے مسکراتے لبوں پر خون کے افتخار آمیز قطرے تھے

زبگینوہربرٹ (پولینڈ)

ترجمہ:۔ سہیل احمد

مرغی

مرغی، بہترین مثال ہے کہ انسانوں کے ساتھ مستقل رہنے سے کوئی کیا بن جاتا ہے۔ اس نے پرندے کی نفاست اور شان مکمل طور پر گم کردی ہے۔ اس کے باہر کو نکلے ہوئے پٹھے پر اس کی دم ایک بڑے، ہیٹ کی طرح بدذوقی کا نمونہ، کبھی کبھی وارد ہونے والے اپنے وجد کے لمحوں میں بھی (جب وہ ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر اپنی گول آنکھیں اپنی جھلّی نما پلکوں کے ساتھ چپکاتی ہے) وہ تکلیف دہ حد تک بیزار کُن ہی رہتی ہے اور اس پر مستزاد، اس کا گانا، نغمے کی پیروڈی، گلا پھاڑ کر اس کی التجائیں ایک ناقابلِ بیان حد تک مضحکہ خیز چیز گول، سفید، داغ دار انڈے کے لئے مرغی سے بعض شاعروں کا خیال آتا ہے۔

ھانس ماگنس انیسینزبرگ

جرمن سے ترجمہ: ڈاکٹر مُنیر الدین احمد

مڈل کلاس کا ترانہ

ہمیں کوئی شکایت نہیں
ہم برسرِ روزگار ہیں
ہمارے شکم پر ہیں
ہم کھاتے ہیں

گھاس بڑھ رہی ہے
قومی سرمایہ بھی
انگلی کا ناخن بھی
ماضی کا زمانہ بھی

راہیں سنسان ہیں
معاہدات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں
بگل خاموش ہیں
یہ سماں بھی لد جائے گا

مرنے والوں نے اپنی نصیحتیں کر دی ہیں
بارش دھیمی ہو گئی ہے
اعلانِ جنگ ابھی نہیں ہوا
اس کی جلدی بھی کیا ہے

ہم گھاس کھاتے ہیں
ہم قومی سرمایہ کھاتے ہیں
ہم ناخن کھاتے ہیں
ہم زمانۂ ماضی کو کھاتے ہیں

ہمیں کچھ بھی تو نہیں چھپانا ہے
ہیں کچھ بھی تو نہیں گنوانا ہے
ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں
ہمارے پاس سب کچھ ہے

گھڑی کو چابی دے دی گئی ہے
معاملات سدھرے ہوئے ہیں
تھالیاں دھلی ہوئی ہیں
آخری بس گزر رہی ہے
وہ خالی ہے

ہمیں کوئی شکایت نہیں

ہمیں انتظار آخر کا ہے کا ہے

سیاہ فام کی سوچ

تم سمجھتے ہو کہ
کالے آدمی کے ذہن میں کوئی سوچ اور روشن خیالی نہیں ہے
سوائے تاریکی اور مایوسی کے
لیکن —— ہم کالے لوگ تمہیں بتانے کی جرأت کرتے ہیں
کیونکہ ہم نے وہ علم حاصل کیا ہے
جو تم نے نہ سنا اور نہ جانا ہے
یہ علم —— جو کہ کالے آدمی کی سوچ ہے
تمہارے لئے دہشت ہے

(۲)

لو سنو!
سیاہ فام تمہارے ظلم کو بے نقاب کر دے گا
اس طرح —— جس طرح ہڈی پر سے گوشت نوچ لیا جاتا ہے
ہم تمہیں کسی آنے والے طوفان سے پہلے کی طرح پرسکون نظر آتے ہیں
تو شاید! ہم اس ظلمت بھری رات کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پھٹ پڑیں

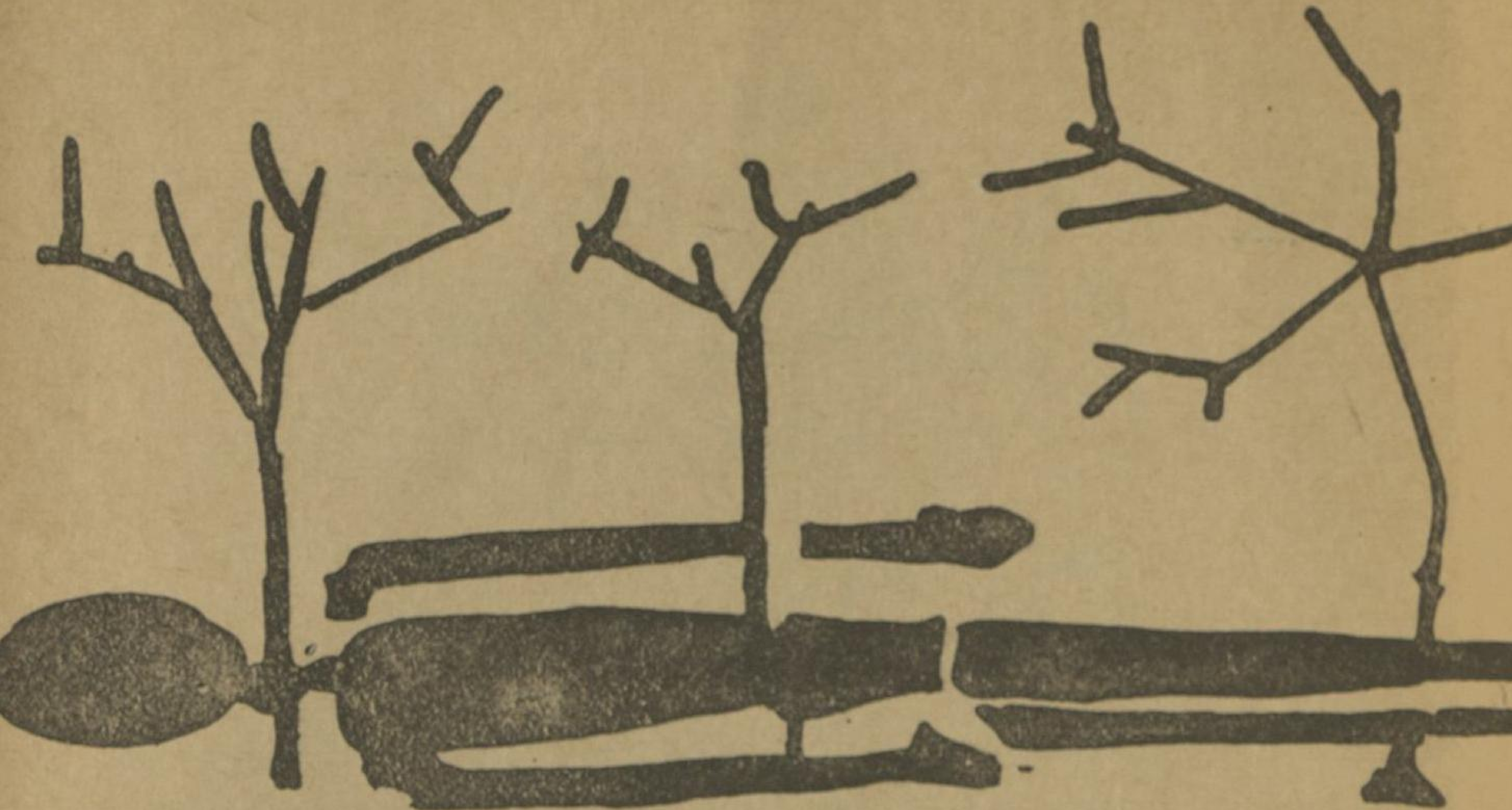
(۳)

لیکن یہ مت بھولو —— اب ہمارے دن ہیں —— یقیناً اب ہمارے دن ہیں
کوئی ظلم، جبر یا طاقت ہمیں دبا نہیں سکتی
تم کالے آدمی کو روٹی کھانے والا جانور مت جانو
اسے زندہ انسان، قوم، طاقت کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہوگا

بلاگا دمتروودا
احمد سلیم

ویت نام

میں نے ایک طویل مسافت طے کی ہے
آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک!
ایک شام —— کافی کے رنگ جیسی
میں نے وہ دہلیز پار کی تھی —— جو امن کو جنگ سے بہتر سمجھتی ہے
ایک ڈر تھا کہ میری آنکھیں آنسوؤں کے کنوئیں میں گر پڑیں گی
اور لاشوں کی کھلی آنکھوں میں دیکھیں گی
لیکن جب صبح پھوٹی —— ایک دستی بم کی طرح
ایک تھکی ہوئی عورت مسکرائی: او پردیسی ملاقاتی
اور اس کی مسکراہٹ میں اور سولی پر ٹنگے ہوئے ویت نام:
میں نے تیرا درد دیکھا، تیری نرمی اور تیری طاقت،
اس کی مسکراہٹ کا بلاوا ——
زندگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک!



دریازِ ہوا

"ادب، ایک وسیع و عریض دریا کی طرح ہے کہ جو اپنے گھاٹ سے بہتا ہوا۔
راستہ بناتا سمندر میں جا ملتا ہے۔ اس سارے راستے میں ہر مشکل
کو زیر کرتا ہر سنگِ رہ کو نابود کرتا اور منزل کی جانب پہنچنے والے
ہر اثبات کی ہمراہی کرتا ہے۔ جابر کا جبر اور ظالم کی مطلق العنانی
ادب و فن کے راستے میں حائل کی جانے والی وہی کمزور
چٹانیں ہیں جو دریا کے پانی کی یورش میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں
قاری اور صنف کے درمیان، ان سنگریزوں کا کوئی اہمیت
نہیں۔"

طٰہٰ حسین ـــــــــ مصر

عبداللہ ملک

امریکی کمیونسٹ پارٹی کا خط

بنام

چینی کمیونسٹ پارٹی

پیارے رفیقو! چند سال گزرے جب آپ کی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایک طویل تار ہماری پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو روانہ کیا تھا جس میں ہماری پارٹی کی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی اور ہم پر الزام لگایا گیا تھا "امریکی سامراج کے خلاف امریکی کمیونسٹ پارٹی کا رویہ بہت نرم ہے" لیکن اس تار میں اس الزام کی صحت میں آپ نے کوئی شہادت پیش نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ صاف تھی۔ آپ کا الزام صحیح حقائق پر مبنی نہیں تھا اور آپ کا مقصد ہماری پارٹی کی کردار کشی تھی۔

اس بات کو چند سال گزر گئے ہیں لیکن آج تو ہم پورے وثوق کے ساتھ وہی الزام آپ پر لگا رہے ہیں کہ چینی کمیونسٹ پارٹی نہ صرف امریکی سامراج کی حاشیہ بردار بن گئی ہے بلکہ وہ اس گھناؤنے سامراج کو بہت ہی دیدہ زیب بنا کر پیش کر رہی ہے۔

ہم یہ تنقید اس لئے نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کی پارٹی کی پالیسیاں اور عمل سامراج کی بالعموم امداد کر رہی ہیں۔ سامراج کو پرامید بناتی ہیں اور اس کو طاقت مہیا کر رہی ہیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ پالیسیاں بہت مہلک ثابت ہو رہی ہیں۔ کیونکہ یہ براہ راست امریکی سامراج کو مضبوط بنا رہی ہیں۔ اس لئے ہمارا متشوش ہونا قدرتی امر ہے۔ کیونکہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیاں براہ راست ہماری اندرونی زندگی کو متاثر کر رہی ہیں۔

ہم اس دستاویز میں اپنے کو چینی کمیونسٹ پارٹی کی صرف ان پالیسیوں کی نکتہ چینی تک محدود رکھیں گے جن کا امریکی سامراج کے خلاف ہماری جد وجہد پر براہ راست اثر پڑتا ہے کیونکہ ہمارے لئے، ہمارے محنت کشوں کے لئے اور امریکی عوام کے لئے یہ سب سے زیادہ اہم ہے اور اس طرح سے آپ کی پارٹی کی پالیسیاں براہ راست ہمارے اندرونی حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

یقین کیجئے ہم یہ نکتہ چینی بادل ناخواستہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اور یہ الفاظ رقم کرتے ہوئے ہم شدید کرب میں مبتلا ہیں۔ ہم کافی دنوں تک یہ مکتوب بھیجنے سے گریزاں رہے اور ہم اس تلخ فریضہ کی ادائیگی کو اس خیال سے ٹالتے رہے کہ زندگی کی تلخ حقیقتیں اور تجربے آپ کی پارٹی کو اپنی اس پالیسی کو جس پہ آپ آجکل گامزن ہیں ترک کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ لیکن اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کے موجودہ اقدام سہواً یا غلط تجزیے کی بنا پر مبنی نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہیں غلط نظریات کا جن کو چین کی کمیونسٹ پارٹی ایک طویل عرصہ سے اپنائے چلی آ رہی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کی پارٹی نے محنت کش طبقے کے انقلابی راستے کو ترک کر دیا ہے۔

آپ کے اس عمل کی نشان دہی اور اس کے ثبوت میں دستاویزی شواہد کا سلسلہ ہم خاصے ماضی بعید سے شروع کر سکتے ہیں لیکن طوالت سے گریز کی خاطر ہم اس دورے سے شروع کرتے ہیں جب صدر کینیڈی کے دورِ حکومت میں دفاعی میزائل کی تنصیب کے سلسلے میں ایک عالمی بحران کو جنم دینے کی کوشش کی گئی

کیوبا

۱۹۶۲ء میں جب اس عالمی بحران کی ابتداء ہوئی تو آپ کی پارٹی نے برملا بیان دیا اور سوویت یونین پر کیوبا میں ان میزائل کو نصب کر کے "اشتعال انگیز" اقدام کرنے کا الزام عائد کیا۔ ہمارے لئے یہ باور کرنا قریب قریب ناممکن تھا کہ ایک سوشلسٹ ملک کے قائدین جنہوں نے سامراج کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی ہو وہ ایک سامراجی ملک کی جارحیت کی حمایت کریں گے اور سوشلسٹ کیوبا کو فوجی امداد دینے کے عمل کو "اشتعال انگیزی" قرار دیں گے۔

لطف یہ ہے کہ جب آپ کی پارٹی کے قائدین سوویت یونین کے خلاف اس سلسلے میں بیان بازی کر رہے تھے تو اس امر پر آپ کے قائدین نے ایک لفظ نہیں کہا کہ کیسے امریکی سامراج اس زمانے میں کیوبا پر بھرپور حملہ کرنے کی تیاریوں کے آخری مراحل میں تھا یہ کوئی بہت ہی راز کی بات نہ تھی بلکہ ہر شخص کو ان ریشہ دوانیوں اور اس جارحیت کا علم تھا ——— کیونکہ امریکہ جو نتائج Bay of Pigs پر حملہ سے حاصل نہ کر سکا تھا وہ اب کھلی جارحیت کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ امریکہ اس پورے خطے میں سوشلسٹ کیوبا کو ایک نقب تصور کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے لیکن امریکہ کو سوشلسٹ کیوبا پر حملہ کرنے کے لئے ایک ظاہری بہانہ درکار تھا اور آپ کی پارٹی نے سوویت یونین پر "اشتعال انگیزی" کی تہمت لگا کر یہ بہانہ مہیا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی پارٹی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ عالمی بحران کیوبا اور سوویت یونین کا پیدا کردہ ہے نہ کہ امریکی جارحیت اس کی ذمہ دار ہے۔

بالآخر جب یہ بحران ختم ہوا اور امریکی سامراج اور کینیڈی انتظامیہ کیوبا پر حملے کرنے کے منصوبے کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں سوویت یونین نے میزائل ہٹا لینے کا فیصلہ کیا تو آپ کی پارٹی نے پھر سوویت یونین پر "بزدلی اور غداری" کا الزام عائد کر دیا اور آپ کی پارٹی نے اپنے بیانات میں اس امر پر اصرار کیا کہ امریکہ نے حملہ نہ کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا اور جیسے ہی سوویت یونین اپنے میزائل کیوبا سے ہٹائے گا تو امریکہ کیوبا پر حملہ کر دے گا اس طرح پھر آپ کی پارٹی اور قائدین نے اس تاثر کو تقویت دی اور اس کی تائید کی جو تاثر امریکی سامراج اور اس کا سربراہ کینیڈی عالمی رائے عامہ کو دینا چاہتا تھا کہ امریکہ کو اس عالمی محاذ آرائی میں فتح حاصل ہوئی ہے اور سوویت یونین کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی ہے چینی کمیونسٹ پارٹی اور اس کے قائدین کے بیانات نے کیوبا کے بہادر عوام کی بھی توہین کی کیونکہ اس پورے بحران میں کیوبا کے عوام کا عزم جہاد اور اپنے سوشلسٹ ملک کے تحفظ اور دفاع کا جذبہ ہی تھا جس نے کینیڈی انتظامیہ کو ان جارحانہ اقدام کو ترک کرنے کے سلسلے میں سب سے اہم رول ادا کیا اور یہ یقینی طور پر امریکی سامراج کی واضح شکست تھی۔

سوڈان

۱۹۷۱ء میں نو آزاد سوڈان سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ لیکن یہ اقدام امریکی سامراج کو قطعاً پسند نہیں تھا اور اس نے اس عمل کو روکنے کے لئے ....

ریشہ دوانیاں شروع کردیں اور اب تو ایک عالم اس امر سے واقف ہے کہ کس طرح بدنام زمانہ "سی آئی اے" نے سعودی عرب کے رجعت پسندوں کے تعاون سے وہاں پانسہ پلٹ دیا۔ انہوں نے وہاں اشتعال انگیزیاں کیں جس کے نتیجے میں وہاں انقلاب دشمن طاقتیں کامیاب ہوگئیں اور جب فوجی آمریت وہاں کمیونسٹوں اور انقلابیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی تھی۔ تو آپ کی پارٹی براہ راست ماوزے تنگ کی ہدایت پر سوڈانی فوجی آمریت کو کمیونسٹوں اور انقلابیوں کی حمایت ہی نہیں کر رہی تھی بلکہ فوجی آمریت کی تائید کر رہی تھی اور اس کو شہ دے رہی تھی اور فوراً ہی چینی حکومت نے ایک تجارتی وفد سوڈان روانہ کر دیا۔

سوڈان میں انقلاب دشمن طاقتوں کی فتح اصل میں سامراج کی فتح تھی۔ گو یہ عارضی شکست تھی لیکن اس کے باوجود ترقی پسند اور انقلابی طاقتوں کو اس خطے میں زبردست دھکا لگا تھا۔ چنانچہ امریکی سامراج کے بدترین عناصر نے اس موقعہ پر آپ کی پارٹی کی حمایت کو بہت ہی سراہا تھا اور کہا تھا "سوڈان میں جو استحکام پیدا ہوا اس کو خوش آمدید کہنا چاہیئے" آپ نے اپنے عمل سے اپنے کو انقلاب دشمن طاقتوں کو حامی و مددگار ثابت کیا اور اس نام نہاد استحکام پیدا کرنے والی صورتِ حال میں مہرہ ثابت ہوئے اور مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کو تحفظ بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

بنگلہ دیش

صرف یہی ہی نہیں ہوا بلکہ ۱۹۷۱ء میں جب ایک عام جانتا تھا کہ امریکی سامراج کی تائید سے پاکستان کی فاشسٹ فیوڈل حکومت بنگلہ دیش کے عوام کے قتل و غارت میں مصروف تھی اور ان کی نسل کشی کر رہی تھی اور تمام دنیا اس قتل و غارت اور نسل کشی کے خلاف احتجاج کر رہی تھی تو اس دَور میں آپ کی پارٹی اور امریکی سامراج ہی تھی جو اس رجعت پسند اور انقلاب دشمن اقدام کے حق میں آواز بلند کر رہے تھے اور آپ کی پارٹی نے یہ حمایت صرف بیانوں تک ہی محدود نہیں رکھی بلکہ آپ نے باقاعدہ وفد روانہ کئے اور پاکستان کے وفود کو اس زمانے میں خوش آمدید کہا اور آپ کے ان تمام اقدام کی حمایت امریکی سامراج کرتا رہا۔ دنیا بھر کے ترقی پسند اور سوشلسٹوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک سوشلسٹ ملک قومی آزادی کی تحریک کی اس طرح مخالفت کر سکتا ہے۔

چلی

امریکی سامراج کی وحشت و بربریت کی واضح اور کھلم کھلا حمایت کی سب سے بڑی مثال تو چینی کمیونسٹ پارٹی اور اس کی مرکزی کمیٹی نے اس وقت قائم کی جب آپ نے چلی کی فوجی آمریت کے انقلاب دشمن اقدام کی حمایت کی اور الانڈے کی موت اور جمہوری حکومت کے تختہ اُلٹے جانے پر خاموشی سادھ لی اور اب بھی جب چلی کی یہ بدنام عالم فوجی آمریت مشکلات میں گھِری ہوتی ہے تو آپ کی پارٹی ہے جو چلی کی اس ظالم حکومت کو مالی اور اخلاقی امداد دے رہی ہے حالانکہ یہ کبھی بھی راز کی بات نہ تھی لیکن اب تو ایک دنیا جان گئی ہے کہ کن طاقتوں نے الانڈے کے ترقی پسند متحدہ محاذ کی حکومت کا تختہ اُلٹا اور کس نے انقلاب دشمن طاقتوں کو منظم کیا اور اس کے اخراجات کس نے برداشت کئے۔ آج واقعات نے ثابت کر دیا ہے اور یہ حقائق اس وقت بھی ایک دنیا کو معلوم تھے۔ کہ انقلاب دشمن تحریک امریکی سامراج کی پروردہ تھی اور اس پوری انقلاب دشمن تحریک کو سی آئی اے امریکہ کی بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشنوں نے اور چلی کے فوجی جرنیلوں نے ہی آپ کی پارٹی کی قیادت اس جنگ میں غیر جانب دار رہی۔ بلکہ جب انگولا کے عوام نے یہ جنگ

آزادی جیت لی تو آپ کی پارٹی اور اس کے قائدین نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت اور امریکی سی آئی اے اور بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشنوں کے تعاون سے انگولا کی اس انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کی بھرپور کوشش کی اور آپ آج کے دن تک امریکی سی آئی اے کے ساتھ مل کر افریقہ میں اس انقلابی دھارے کا رُخ موڑنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اب اس امر سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کی پارٹی انگولا، ایتھوپیا، افغانستان، برما، یمن اور دوسرے ممالک میں امریکی سامراج کے ساتھ مل کر انقلابی عمل کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے اور یہ تلخ حقیقت ہے کہ سامراج کے خلاف جہاں بھی جنگ شروع ہوتی ہے اور سامراج پسپا ہونے لگتا ہے تو آپ کی پارٹی بڑھ چڑھ کر سامراج کو سہارا دینے کی کوشش کرتی ہے اور یہ سہارا اخلاقی، نظریاتی اور مادی سبھی میدانوں میں ہوتا ہے۔

ویت نام

اب آپ جو جارحیت ویت نام کے خلاف روا رکھے ہوئے ہیں اس کے پیش نظر آپ کیسے اس امر سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کے دماغ میں بڑی طاقتوں کا سودا نہیں سمایا ہوا ہے جو آپ کو جارحیت پر اکسا رہا ہے آپ ایک سامراجی ملک کی مانند اپنے بحری جہاز ویت نام کے پانیوں میں روانہ کر رہے ہیں آپ روزانہ ویت نام کے خلاف تمام وہی اقدام کر رہے ہیں۔ جو سامراج ایک مدت تک خود چین کے خلاف کرتا رہا ہے آپ آج سوشلسٹ جمہوریہ ویت نام سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنے ملک میں بسنے والے چینی نژاد سرمایہ دار طبقے کو سوشلسٹ قوانین سے مستثنیٰ رکھیں اور ویت نام اپنے ملک میں سوشلزم تعمیر کرنے کے لیے جو قوانین بنا رہا ہے اور جو اقدام کر رہا ہے ان کا ان چینی عناصر پر کوئی اطلاق نہ ہو اور اس طرح سے ویت نام کے چینی باشندوں کو ویت نامیوں کو لوٹنے کھسوٹنے اور استحصال کرنے کی پہلے کی طرح عام اجازت ہو۔ اس قسم کا رویہ آپ نے انڈونیشیا میں روا رکھا اور یہی پالیسی اب دوسرے ممالک بھی جاری رکھ رہے ہیں۔

آپ دوسرے ممالک میں رہنے والے چینی مزدوروں اور کسانوں کے لیے نہ تو تشویش ہے، نہ پریشانی، گو اپنے پروپیگنڈے کے ذریعے آپ ایک عالم کو یہی باور کرانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ویت نام کے کھاتے پیتے سرمایہ دار چینیوں کے لیے پریشان ہیں۔ وہ آپ سرمایہ دارانہ قوم پرستی جو آپ اپنے ملک میں پروان چڑھا رہے ہیں اسے آپ دوسرے ممالک میں بھی پھیلانا چاہتے ہیں اس طرح آپ نے محنت کشوں کے نظریات اور فلسفے کی بجائے سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظریات کو اپنانا شروع کر دیا ہے اور یہ کتنا زبردست المیہ ہے کہ ویت نام کے عوام جو کئی نسلوں سے امریکہ، فرانس اور جاپان کی سامراجی جارحیت اور اپنے اندر کی جاگیرداری کا مردانہ وار مقابلہ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں ان کو آج عوامی جمہوریہ چین کی جارحیت کا شکار ہونا پڑ رہا ہے اور آج ایک بار پھر ویت نامی عوام کو عوامی جمہوریہ چین کی فوجوں کا سامنا ہے یہ اس روئے زمین سے مل کر منظم کیا تھا اور ہٹلر کے زمانے سے اب تک شاید ہی کسی ملک میں کمیونسٹوں اور ترقی پسند انسانیت کا اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت ہوا ہو جتنا کہ چلی کی اس فوجی آمریت کے دور میں دیکھنے میں آیا ہے۔ اور آج بھی

ان کمیونسٹ شہیدوں کی ہڈیاں چونے کی بھٹیوں سے مل رہی ہیں ۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہٹلر کے مظالم کے بعد اب تک ان مظالم کے خلاف اتنی زبردست احتجاجی تحریک دیکھنے میں نہیں آئی جتنی کہ چلی کے ان فوجی آمروں کے مظالم کے خلاف دیکھنے میں آ رہی ہے ۔آج چلی کی فوجی آمریت کے خلاف دیس بدیس میں آواز بلند ہو رہی ہے ۔اس حکومت کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے ۔چلی کی یہ فوجی حکومت آج یکہ وتنہا رہ گئی ہے اور یہ دنیا بھر کے جمہوریت پسندوں کا عظیم متحدہ محاذ وجود میں آ رہا ہے ۔جو اس فاشزم اور بربریت کے خلاف مؤثر جدوجہد کر رہا ہے امریکی سامراج اس متحدہ محاذ کو ناکام بنانے میں اور اس عالمی متحدہ محاذ میں پھوٹ ڈالنے کے لئے زبردست کوششوں میں مصروف ہے اور جہاں وہ ناکام ہو رہا تھا ۔وہاں آپ کی پارٹی نے اس عالمی متحدہ محاذ میں پھوٹ ڈالی اور آپ نے فوراً چلی کی اس فوجی حکومت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ابھی الاندے کی میت دفنائی بھی نہ گئی تھی کہ آپ نے اس کی حکومت کے سفیر کو جسمانی طور پر چلی کے سفارت خانے واقعہ پیکنگ سے باہر نکال دیا اور آپ نے چلی کے عوام کے قاتلوں سے دوستی اور تعاون کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے اگر یہ تمام اقدام امریکی سامراج کی حمایت اور تائید نہیں ہیں تو پھر یہ کیا ہیں، ان کو کن لفظوں میں بیان کیا جائے اور یہ اقدام آپ ایسے وقت میں کر رہے ہیں جب کہ کوئی سرمایہ دار ملک بھی اتنے کھلم کھلا طور پر چلی کی اس وحشی حکومت کی حمایت کی جسارت نہیں کر رہا ۔

یہ ایک عالم کے لئے معمہ بنا ہوا ہے کہ ایک ایسے ملک کے لیڈر اور قائدین جنہوں نے خود سامراج کے خلاف ایک طویل اور شاندار جنگ لڑی ہو وہ کیسے سامراج کے وحشیانہ مظالم کی حمایت کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں تو ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں ہے کہ چلی میں مظالم کی حمایت امریکی سامراج کی حمایت اور تائید ہے اور آپ کی چلی کو اخلاقی اور مادی امداد کی مطلب یہی کہ آپ اس فوجی آمریت کو اقتدار میں قائم رکھنا چاہتے ہیں ۔

انگولا کے عوام نے پرتگیزی سامراج اور نسل پرستوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی ہے لیکن چینی کمیونسٹ پارٹی نے ان کی حمایت میں انگلی تک نہیں اٹھائی ۔جب کہ دوسرے تمام سوشلسٹ ممالک اور سوویت یونین نے انگولا کی آزادی کے لئے مسلسل حمایت ہی نہیں کی بلکہ امداد بھی دی ۔آپ زبانی تو قومی آزادی کی جدوجہد کی باتیں کرتے ہیں ۔لیکن عملاً آپ سامراج کی حامی طاقتوں کی حمایت وتائید کرتے ہیں ۔

انگولا کے عوام جب اپنی جنگ میں کامیاب وکامران ہو گئے اور قومی آزادی حاصل کر لی تو ان کی انقلابی حکومت کو دنیا کے کئی ممالک نے تسلیم کر لیا لیکن اگر کسی نے اس جمہوری اور انقلابی حکومت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے تو امریکی سامراج ہے ۔جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت ہے اور آپ کا ملک عوامی جمہوریہ چین ہے ۔لیکن بات یہیں پر ہی نہیں رکتی بلکہ انگولا کے عوام کی شاندار جنگ آزادی میں نہ امریکی سامراج، نہ مغربی افریقہ کی نسل پرست حکومت غیر جانبدار ہے اور نہ کروڑوں عوام کے لئے زبردست المیہ ہے اور کروڑوں امریکی عوام کے لئے بھی چینیوں نے خود امریکی سامراج کی ویت نام کے خلاف جارحیت کی زبردست مزاحمت کی تھی ۔آج اسی ویت نام کو چینی فوجیں مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس طرح سے کل کی امریکی فوجوں کی جگہ آج چینی فوجوں نے لے لی ہے اور

اس طرح سے آج آپ نے پرانے چینی شہنشاہوں اور سرمایہ دار قوم پرستوں کا یہ نظریہ "جہاں بھی چینی بستے ہیں وہ چین کا علاقہ ہے" اپنا لیا ہے۔

ویت نام کے کمیونسٹوں نے ایک بہت ہی چبھتا ہوا سوال آپ سے پوچھا ہے اور آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا سوال یہ ہے کہ آیا یہ سوال درست ہوگا کہ سوشلسٹ انقلاب کے ناقابل تنسیخ اصولوں کو کچھ سرمایہ دار طبقوں پر صرف اس لئے لاگو نہ کیا جائے کیونکہ وہ چینی نژاد ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اپنے کارخانے، اپنی جائیدادیں اور پوری املاک ویت نام کے محنت کشوں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے حاصل کی تھیں اور ساتھ ہی ان ہزاروں لاکھوں چینی تارکین وطن محنت کشوں کا خیال نہ کیا جائے جو مختلف ممالک میں شدید قسم کی لوٹ کھسوٹ اور جبر و تشدد کا شکار ہو رہے ہیں حتیٰ کہ ان ممالک میں ان کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے

آپ دو سوشلسٹ ممالک سوویت یونین اور سوشلسٹ ویت نام کے مابین دوستی کے معاہدے پر بھی نکتہ چینی کر رہے ہیں حالانکہ آپ نے اس زمانے میں سامراجی جاپان سے دوستی کا معاہدہ کیا ہے ہمیں یقین ہے کہ آپ اس امر سے بے خبر نہیں ہیں کہ چین اور جاپان کے اس دوستی کے معاہدے کو امریکی سامراج کی پوری پوری اشیرباد حاصل ہے کیونکہ وہ اس معاہدے کو مشرقِ بعید میں اپنی سرپرستی میں ایک نئے گٹھ جوڑ کی بنیاد سمجھتا ہے اور جاپان اس معاہدے کو مشرقی ایشیا میں اپنے اثر و رسوخ کے پھیلاؤ کے پرانے خوابوں کی تکمیل کی طرف ایک اہم قدم تصور کرتا ہے بنیادی طور پر چین جاپان معاہدہ اصل میں سوویت یونین (یعنی نام روس) اور پوری قومی آزادی کی تحریکوں کے خلاف ایک حملہ ہے۔

براعظم افریقہ

اسی طرح سے امریکہ، نسل پرست، جنوبی افریقہ اور چین کے تعلقات کی خبریں روز بروز پریشانی کا موجب بن رہی ہیں۔ اس صدی کی ساتویں دہائی کے آخری سالوں میں جب نائیجیریا میں بیافرا کے علیحدگی پسندوں نے جنگ چھیڑ دی کیونکہ امریکی سامراج ایک متحد اور مکمل طور پر آزاد نائیجیریا کو اپنے مفاد میں نہیں سمجھتا تھا تو آپ کی پارٹی کی قیادت اور امریکی سامراج دونوں نے بیافرا کے علیحدگی پسندوں کو اسلحہ مہیا کیا تھا۔ اسی طرح زائرے میں آپ نے نیٹو کی افواج کی پوری پوری تائید کی جو انقلاب دشمن طاقتوں کی امداد کے لئے اس ملک میں بھیجی گئی تھیں اور آپ نے صومالیہ کو اس وقت اسلحہ مہیا کرنا شروع کیا جب اس نے سامراج کے کیمپ میں شرکت کا فیصلہ کر لیا اور اس نے ایتھوپیا کے انقلاب کو کچلنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

نسل پرستی، سامراجی جبر و تشدد کی مظہر ہے اور اس کی سب سے واضح مثال افریقہ ہے اور آپ کی پارٹی نسل پرست جنوبی افریقہ اور امریکہ کی پالیسیوں کی تائید کر کے نسل پرستی کے فلسفے کو قبول کر رہی ہے

ان تمام واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ غلط راہ پر چل رہے ہیں اور آپ کی تمام پالیسیاں سامراج کی تائید کر رہی ہیں آپ قومی آزادی کی تحریکوں کی مخالف سمت میں کھڑے ہیں۔ آپ قومی جبر کرنے والوں کی صف میں شریک ہیں آپ سوشلزم کے لئے مصروف پیکار عوام کے مخالفوں کا ساتھ دے رہے ہیں اس سے عیاں ہے کہ مجموعی طور پر طبقاتی جنگ میں آپ کی ہمدردیاں اور تائید ظالم و جابر عناصر کو حاصل ہیں اور اس طرح سے آپ اس جہان رنگ و بو میں جو انقلابی عمل جاری و ساری ہے۔ اس کو

ناکام بنانے میں مصروف ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کی یہ تمام پالیسیاں ، یہ تمام اقدام عملاً ہر ملک میں لڑی جانے والی قومی آزادی کی تحریکوں کی مخالفت اور مزاحمت کر رہی ہیں اور آپ کے یہ اعمال سوشلزم کی تعمیر کے خلاف ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔

جنگ

اس سے بڑھ کر آپ کی پارٹی ایک اور ستم ظریفی کر رہی ہے کہ وہ یہ نظریہ پھیلا رہی ہے کہ ہر نسل کو اپنی جنگ لڑنی ہوتی ہے اس طرح سے آپ جنگ کے لئے فضا تیار کر رہے ہیں اور آپ کی پارٹی کی گیارہویں کانگرس منعقدہ ۱۹۷۷ء میں یہ سوال ایجنڈے میں شامل تھا اور پھر ۱۹۷۸ء میں پانچویں نیشنل پیپلز کانگرس میں بھی اس سوال پر بحث کی گئی اس کانگرس میں ہوا کو فنگ نے کہا تھا۔

"ہمیں جنگ کی تیاری کے لئے اپنی فوج کی فنی اور جنگی استعداد کو بڑھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے اور اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیئے"

عوامی جمہوریہ کی اس سالگرہ کے موقع پر آپ کے وزیر دفاع جو آپ کی مرکزی کمیٹی کے رکن ہیں۔ نے اپنے ایک مضمون میں کہا تھا، "کہ جنگ ایک اخلاقی ضرورت ہے اور تیسری جنگ عظیم کسی دن بھی شروع ہو سکتی ہے"۔ اس طرح آپ کی افواج کے ڈپٹی چیف آف سٹاف نے [illegible] میں کہا ہے کہ چین کو ایک ہولناک جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے کیا یہ حیرانی کی بات نہیں کہ آپ کی پارٹی کی قیادت غالباً اس پوری دنیا کا واحد سیاسی گروہ ہے جو جنگ کی ضرورت کو ایک اصول کے طور پر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر نسل کو اس کا تجربہ ہونا چاہیئے۔

جنگ کے متعلق یہ تمام نظریے اور فلسفے اصل میں چین کی جنگی تیاریوں کا جواز ہیں - یہ جنگ اپنے ہمسایوں کے خلاف لڑنے کے لئے ان فلسفوں اور نظریوں کو ایک نقاب کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ مقصد عظیم اور مزید وسیع چین کے خواب کی تکمیل ہے اور جنگ کے لئے یہ تمام تیاریاں اور سوویت یونین کے خلاف الزام تراشیوں کی مہم کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور آپ نے سامراج کے خلاف جدوجہد کے نظریے کو سامراج سے دوستی اور تعاون میں بدل دیا ہے آپ نے سرد جنگ کو ختم کرنے، دیتانت قائم کرنے اور عالمی کشیدگی کے خاتمے کے نظریے کی بجائے عالمی کشیدگی میں اضافہ اور جارحیت کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا ہے۔

ایٹمی ہتھیار

آپ چین کی نئی نسل کو جنگ کے جنون میں پروان چڑھا رہے ہیں اور آپ اس نسل کو یہ سبق ازبر کرا رہے ہیں کہ وہ ایک ہولناک جنگ کے لئے تیار رہے اور یہ جنگ دوسرے سوشلسٹ ممالک کے خلاف ہوگی کتنا خطرناک نظریہ ہے اور یہ ہر قسم کے سیاسی اور اخلاقی نظریات کا ایک دیوالیہ پن ہے اور اب آپ نے سامراج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور اس سے دوستی اور الفت کی جو پینگیں بڑھا رہے ہیں اس سے آپ نے ایک خطرناک اور تباہ کن دور میں قدم رکھا ہے۔

آپ نے سامراج کے ساتھ فوجی معاہدوں اور تعاون کا جو سلسلہ شروع کیا ہے جنگ کے حق میں

آپ نے جو فضا تیار کرنی شروع کی ہے یہ نئے خطرات ہیں جو ایٹمی محاذ آرائی اور عالمی تباہی پر منتج ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ایٹمی جنگ کو انسانیت کے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتے کیونکہ اسلحہ بندی کے سلسلے میں ماؤزے تنگ کے پہلے بیانات کو دہراتے ہوئے آپ کے وزیر خارجہ نے یہ لکھا تھا "چینی عوام ایٹمی جنگ کے بارے میں ان ڈرانے والی باتوں میں متفق نہیں ہیں۔ کہ ایٹمی جنگ سے انسانیت تباہ ہو جائے گی" امریکی سامراج کے کچھ نمائندے بھی آپ کے اس موقف سے متفق ہیں چنانچہ برزنسکی جو امریکی صدر کا سلامتی کا مشیر ہے نے پیکنگ کے دورے سے واپسی پر کہا تھا۔ کہ ایٹمی جنگ کو پوری انسانیت کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانا بے وقوفی کی بات ہے" اس نے کہا تھا

"یہ سمجھنا کہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے انسانی نسل ختم ہو جائے گی زبردست غلطی ہے اس قسم کے نظریات انسانی انا کا اظہار ہیں اور کچھ نہیں۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے اگر امریکہ اپنے تمام ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ سوویت یونین پر حملے کے دوران ختم بھی کر دے اور اس طرح سے سوویت یونین اپنے تمام ایٹمی ہتھیاروں کو امریکہ پر استعمال کر ڈالے۔ تو یہ انسانیت کا خاتمہ نہیں ہوگا یہ اظہار ہے خوف کا اور انسانی انا کا۔ (یکم مئی ۱۹۷۸ء نیویارک صفحہ ۱۲۶)

ایسا اندازِ فکر سرے سے ہی مجنونانہ ہے اور یہ ایٹم پرست صدر کارٹر کا قومی سلامتی کا مشیر ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس قسم کی مجنونانہ باتیں ماؤزے تنگ نے ۱۹۵۷ء سے ہی شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

"کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کتنی انسانی جانوں کی تلفی کا باعث بن سکتی ہے" خیال ہے دنیا کی آبادی جو دو ارب ۷۰ کروڑ پر مشتمل ہے ایک تہائی یعنی ۹۰ کروڑ انسانی زندگیاں اس جنگ میں ضائع ہو جائیں گی۔ لیکن میرے خیال میں اگر ایٹم بم استعمال ہو تو یہ اندازہ بہت کم ہے۔ یقینی طور پر تصویر کا یہ بہت ہی ہولناک رُخ ہے لیکن اگر دوسری طرف انسانوں کی نصف آبادی بھی ختم ہو جاتی ہے تو یہ کوئی اتنی افسوسناک بات نہیں ہوگی۔ آدھی انسانیت پھر بھی باقی بچ رہے گی اور نصف صدی یا ایک صدی بعد یہ آبادی پہلے سے بھی بڑھ جائے گی"

اس لئے جب آپ کے وزیر خارجہ ایٹمی جنگ کے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ کوئی سرسری بات نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جاتی ہے چنانچہ انہوں نے پہلی تقریروں میں کہا تھا

"اسلحہ بندی کے متعلق ہمیں ویسے ہی خیالی قلعے نہیں بنانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے خوابوں پر انحصار کرنا چاہیئے کیونکہ بالآخر نیوٹرون بم کوئی ایسا خراب ہتھیار نہیں ہے"

ایسے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے امریکی سامراج کے انداز بیان کو کلیتاً اپنا لیا ہے اور آپ کے موقف اور امریکی محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع کے موقفوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا یہی وجہ ہے کہ کارٹر انتظامیہ نے چین کو اسلحہ اور فوجی ٹیکنالوجی مہیا کرنے کے فیصلے میں اتنی سرعت دکھائی ہے اور اس کا مقصد کلیتاً جارحانہ مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے اس لئے امریکی سامراج کے نمائندے مغربی یورپ کو بھی ترغیب دے

رہے ہیں کہ جاپان کو زیادہ سے زیادہ اسلحہ مہیا کیا جائے۔ چنانچہ نیٹو کی رابطہ کمیٹی نے حال ہی میں چین کو پیچیدہ اسلحہ فروخت کرنے کی منظوری بھی دے دی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ کی حکومت نے اسلحہ کے لئے نیٹو کی فہرست بھی پیش کر دی ہے۔ جس میں لڑاکا جہاز، ہیلی کاپٹر، ٹینک، میزائل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فہرست اور فوجی ساز و سامان کی فراہمی آپ کی اور سامراج کی ملی بھگت کا واضح ثبوت ہے اس سلسلے میں کوئی دور کی کوڑی لانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس تمام خریداری کا مقصد واضح ہے اور آپ نے اپنے عزائم کا کھلم کھلا اظہار بھی کیا ہے۔ اور سامراجیوں کو اندرون خانہ اس امر کی یقین دہانی بھی آپ نے کرا دی ہے۔ کہ آپ کی یہ تمام فوجی تیاریاں سوویت یونین، ویت نام، منگولیا اور دیگر سوشلسٹ اور تیسری دنیا کے ان ممالک کے خلاف ہیں جن کی سرحدیں چین کے ساتھ ملتی ہیں۔ آپ مسلسل امریکی سامراج کو یقین دہانیاں کرا رہے ہیں کہ آپ کی تمام فوجی تیاریاں سوویت یونین کے خلاف ایک تباہ کن جنگ لڑنے کے لئے ہیں۔

اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ نے جنگ بالخصوص ایٹمی جنگ کی مخالفت کا راستہ ترک کر کے جنگ اور بالخصوص ایٹمی جنگ کے لئے فضا تیار کرنے کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ جنگ کی وکالت کر رہے ہیں بلکہ آپ نے جنگ کی زور سے تیاریاں شروع کر دی ہیں اور دراصل آپ کی طرف سے جنگ کی یہ وکالت، یہ تیاریاں سب ایک ڈھال ہیں۔ جن کے پس پردہ امریکی سامراج اور ان کے ہمنوا جنگ کے لئے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لینن نے یہ درست کہا تھا کہ عالمی سیاست میں سب سے اہم سوال یہی ہوتا ہے کہ کون کس کو استعمال کر رہا ہے؟ آپ ممکن ہے اس غلط فہمی کا شکار ہوں کہ آپ عالمی سامراج بالخصوص امریکی سامراج کو استعمال کر رہے ہیں اور یہ کھیل آپ کے فائدے میں ہے۔ عالمی سامراج کے تضادات کو سامراجی دنیا میں ابھارا بھی جا سکتا ہو۔ لیکن آپ یہ کھیل نہیں کھیل رہے بلکہ اس کے بالکل الٹ عالمی سامراج کو سوشلسٹ دنیا میں نفاق سے فائدہ اٹھاتے قومی آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے مواقع مہیا کر رہے ہیں۔ اصل میں آپ ہی وہ مہرہ ہیں جسے اس تمام انقلابی تحریکوں اور محنت کشوں کی صفوں میں پھوٹ اور نفاق کا کھیل کھیلنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے آپ اس مغالطے میں ہیں کہ آپ اس کھیل میں امریکی اور عالمی سامراج کو غچہ دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح سامراج بالخصوص امریکی سامراج سے مراعات حاصل کر لیں گے۔ عالمی واقعات جس انداز سے رونما ہو رہے ہیں ان کے اور سامراجی درندے کی ہوس ملک گیری اور جہانبانی کے پیش نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آپ کے سامراج کو غچہ دینے کے تمام مغالطے، خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی آپ تھوڑی بہت مراعات یقیناً حاصل کر لیں گے لیکن اصل فوائد سامراج کو ہی حاصل ہوں گے اس سے بڑی بھول کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی ملک یہ سمجھے کہ وہ امریکی سامراج کو اس طور سے غچہ دے سکتا ہے کہ امریکی سامراج سوشلزم کی تعمیر میں ممد و معاون ہو گا۔

امریکی کمیونسٹ پارٹی ہمیشہ امریکہ اور چین کے درمیان بہتر تعلقات کی حامی رہی ہے لیکن ہم بد دیانتی کر رہے ہوں گے اگر یہ بات ہم آپ کو برملا نہ کہیں کہ آج جن حالات میں امریکہ اور چین کے مابین

سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم ہو رہے ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ کے ملک کی پالیسیاں امریکی مفادات کی تائید کر رہی ہیں اس لئے یہ بات ایک عالم سمجھ رہا ہے کہ کیوں کارٹر انتظامیہ اس وقت چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر رہی ہے۔ کارٹر انتظامیہ کو اس امر کا پختہ یقین ہے کہ امریکی سامراج کی سوشلسٹ ممالک اور قومی آزادی کی تحریکوں کے خلاف جارحیت ہیں چین نہ صرف امداد دے گا بلکہ اس جارحیت کا جواز بھی مہیا کرے گا۔

امریکی سامراج کی تمام جارحانہ پالیسیوں خواہ وہ سیاسی میدان میں ہوں یا اقتصادی یا نظریاتی یا پھر فوجی میدان میں ہوں، کی اصل بنیاد سوویت دشمنی ہے پہلے آپ دیتانت کے خلاف مہم اس بنا پر چلا رہے تھے کہ یہ سامراج سے دوستی اور اس کو خوش کرنے کے مترادف ہے لیکن اب آپ کی پالیسی بالکل اُلٹ ہے اب آپ امریکی سامراج اور نیٹو کے ممالک سے اپیل کر رہے ہیں کہ دیتانت سے منہ پھیر لیں۔ صلح کی کوئی گفتگو نہیں ہونی چاہیئے اسلحہ سازی پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ "اس سے نیٹو کے ممالک کمزور ہونگے" نومبر ۱۹۷۷ء میں آپ کے ڈپٹی پرائم منسٹر لی سین نین نے کہا تھا

ہم یورپ کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کا سوویت یونین کے مقابلے دفاع زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے چین اور امریکہ کو ایک دوسرے کے تعاون کی اشد ضرورت ہے تاکہ شمالی ریچھ کو قابو میں رکھا جا سکے "۔

یہ بھی دن آنا تھا کہ ایک سوشلسٹ ملک کا قائد اس بات پر آنسو بہا رہا ہو کہ سامراج کہیں کمزور نہ ہو جائے اور آپ سامراج کو اور زیادہ مضبوط اور مسلح دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ آپ کی یہ سامراج دوستی صرف اس واہمہ پر مبنی ہے کہ سوویت یونین، چین پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر سوویت یونین کا یہی ارادہ ہوتا تو اسے اب تک انتظار کس بات کا تھا آپ اس امر سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ ان تمام سالوں میں سوویت یونین اور اس کی کمیونسٹ پارٹی چین سے تمام مسائل پر گفتگو کرنے اور دوستی کرنے کی خواہاں رہی ہے اگر سوویت یونین کو ملک گیری کی ہوس ہوتی تو دوسری جنگ کے بعد کی صورتِ حال مختلف ہوتی اور سوویت یونین نے جاپان کو شکست دینے کے بعد مانچوریا کے وسیع و عریض علاقے معہ فوجی ساز و سامان کے چین کی کمیونسٹ فوجوں کے حوالے کر دیا تھا اور یہی نہیں بلکہ آپ کی پندرہ لاکھ فوج کو سالہا سال تک ہر قسم کا فوجی سامان سوویت یونین نے مہیا کیا اور اسی تیاری نے آپ کے انقلاب کو کامیاب بنایا اور چیانگ کائی شیک کی فوجوں کو شکست ہوئی جو ملک ہوس گیری میں مبتلا ہو تو وہ اس انداز سے تو عمل نہیں کرتا۔ گو ماؤزے تنگ نے تاریخ کے ان واقعات کو بعد میں توڑنے مروڑنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ چین کی تعمیر میں سوویت یونین اور تمام دوسرے سوشلسٹ ممالک نے لاکھوں کروڑوں ڈالر کی امداد دی ہے انہوں نے پورے کے پورے کارخانے نصب کئے ہیں کان کنی کا تمام سامان مہیا کیا اور اس چیز سے بے نیاز ہو کر یہ امداد دی کہ چین ادا بھی کر سکے گا یا نہیں کیا فاتح ممالک اس انداز سے ان ممالک سے سلوک کرتے ہیں جن کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔

بہرحال یہ تلخ حقیقت موجود ہے کہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی غیر ذمہ دارانہ سوویت دشمن مہم اس کو سوشلزم

اور محنت کش طبقہ کے بدترین دشمنوں کی صفوں میں لے جارہی ہے اور آج سامراج اور چینی کمیونسٹوں کے نظریات اور فلسفے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا آپ آج اس سامراج سے دوستی اور تعاون کر رہے ہیں جو سوشلسٹ ممالک کے خلاف ایٹمی جنگ کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے جو قومی آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے کسی قسم کے اقدام سے نہیں ہچکچاتا۔ آج آپ میں اور امریکہ کے بریزنسکی اور سینیٹر جیکسن جیسے متعصب جنگ بازوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اور آج آپ جنگ بازی کے نظریات اور فلسفے میں سوشلزم اور محنت کش طبقے کے بدترین دشمنوں کو بھی پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اب تمام ترقی پسند اور انقلابی تحریکوں میں حصہ لینے والے افراد آپ کے نعروں کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ آپ جب "دو سپر پاورز" یا عظیم طاقتوں" اور "بالادستی" کی مخالفت میں آواز بلند کرتے ہیں تو در اصل آپ اپنی بالادستی اور توسیع پسندی کی خواہشات پر پردہ ڈالنے اور اس سلسلے میں امریکی سامراج کی امداد و تائید حاصل کرنے کی خواہش کو چھپا رہے ہوتے ہیں۔

سامراج دوستی

آپ امریکہ، جاپان اور نیٹو کے ممالک کو سوشلزم کی تعمیر کے خلاف اور قومی آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے سلسلے میں جو امداد و تائید دے رہے ہیں اور اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ اس کے بدلے میں سامراجیوں میں اس امر کی ضمانت اور تائید چاہتے ہیں کہ ایشیا کے چھوٹے ممالک پر آپ کی بالادستی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ آپ کی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جو اجلاس ابھی پچھلے دنوں دسمبر میں منعقد ہوا تھا تو اس میں آپ نے اپنی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا

"بالادستی کے خلاف بین الاقوامی متحدہ محاذ کے قیام میں بہت ہی نئی اور اہم کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ان میں چین جاپان میں معاہدہ اور امریکہ اور چین کے درمیان سفارتی تعلقات کا قیام شامل ہے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا متحدہ محاذ سامراج کے ساتھ ہے اور سوویت یونین اور سوشلسٹ ممالک کے خلاف اسی طرح آپ کا یہ متحدہ محاذ قومی آزادی کی تحریکوں کے بھی مخالف صفوں میں کھڑا ہے چنانچہ یورپ میں نیٹو کے فوجی معاہدے کی آپ حمایت کر رہے ہیں اور آپ دنیا کے ہر خطے میں انقلاب دشمن عناصر کو شہ دے رہے ہیں تاکہ وہ انقلابی قوتوں کو شکست دے سکیں۔ یہی نہیں بلکہ مجلس اقوام متحدہ میں آپ مسلسل امن اور اسلحہ کی دوڑ پر پابندیوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

آخر کیوں

آپ نے یہ راہ کیوں اختیار کی؟ آپ کی پارٹی کی قیادت کو کون سا جذبہ اس خطرناک انقلاب دشمن راہ پر چلنے کے لئے اتنی مدت سے اکساتا چلا آرہا ہے؟ سامراج دوستی اور انقلاب دشمن پالیسیوں کو اپنانے کا آپ کے پاس کیا جواز ہے؟ کیونکہ آپ کی تمام پالیسیاں محنت کش طبقہ کی پالیسی اور مفادات کے منافی ہیں یہ پالیسیاں مارکسزم، لینزم کے بنیادی نظریات کی نفی کرتی ہیں آپ کی پالیسیاں سوشلزم اور قومی آزادی کی تحریکوں کی مخالفت کرتی ہیں۔ اس لئے ہر کوئی حیران ہے کہ آپ یہ ابن الوقتی کی پالیسی کو کب تک اپناتے رہیں گے؟ چند سال پہلے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ کہ ماؤزے تنگ سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اور چین کے دوسرے سوشلسٹ ممالک کے ساتھ داؤ پیچ کے مسئلے پر اختلافات بھی کسی حد تک سمجھ میں آتے تھے۔ لیکن آج تو ان مہلک پالیسیوں کا کوئی جواز سمجھ میں

نہیں آتا۔

یہ ہمارا سب کا موقف ہے کہ جہاں تک مارکسزم لیننزم کی سائنس کے اطلاق کا تعلق ہے یہ ہر کمیونسٹ پارٹی کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور اپنی سماج میں مختلف سیاسی اور سماجی عوامل کی روشنی میں اپنی پالیسی اور اس کے اطلاق کے لئے داؤ پیچ متعین کرے۔ اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن آپ جو پالیسیاں اپناتے ہوتے ہیں تو وہ آپ کے مخصوص حالات اور داؤ پیچ کی متعین کردہ ہی ہیں۔ آپ ایک ایسی عمومی سیاسی لائن اور پالیسی اختیار کئے ہوتے ہیں جس کا آپ کی قومی ضرورتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے کن عوامل نے آپ کی پارٹی کو اس دلدل میں پھنسا دیا ہے یہ ہے اہم ترین سوال!

آپ کو بخوبی علم ہے کہ آپ کی پارٹی کے اندر ہمیشہ سے طبقاتی جدوجہد کے بنیادی سوال پر بحث و تمحیص اور کش مکش جاری رہی ہے۔ ماضی میں آپ کی پارٹی کے بہت نامور مارکسی لیننی قائدین اس امر پر اصرار کرتے رہے ہیں کہ مزدور طبقہ ہی کسی موجودہ سماج میں سب سے زیادہ انقلابی طبقہ ہے وہ یہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ جس وقت مزدور طبقہ کو سب سے انقلابی طاقت کہا جاتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ مزدور طبقہ گنتی میں بہت زیادہ ہو یا چین میں مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے یا نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ سماج میں جدوجہد محنت کش طبقے کے فلسفے، نظریے اور اصولوں کے مطابق کی جائے اس لئے یہ جان لینا چاہیئے کہ آپ کی پالیسیوں کے ڈانڈے آپ کی پارٹی کی تاریخ میں دور تک جا پہنچے ہیں اور ان پالیسیوں کے جراثیم ماؤ کی تحریروں میں بہت واضح اور واشگاف انداز میں ملتے ہیں اور یہ کجرویاں انقلاب سے پہلے ہی موجود تھیں حقیقت میں یہ کجرویاں شروع دن سے جب سے ماؤ کمیونسٹ پارٹی میں سرگرم عمل ہوا موجود تھیں اور آج یہ کہنا "ماؤ ۷۰ فیصد ٹھیک تھا" دراصل غلط بیانی سے کام لینا ہے یہی وجہ ہے کہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کی پوری تاریخ دو پالیسیوں، دو لائنوں اور دو نکتہ نظروں کی کش مکش پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک لائن ہے ان مارکس وادیوں کی جو محنت کش طبقے کی بنیاد سے سوچتے ہیں چنانچہ اس نکتہ نظر کے لئے بہت سے چینی کمیونسٹوں نے جدوجہد جاری رکھی ان میں لی۔ ٹا۔ چاؤ، چو چی ہو، پکینگ پائی، چینگ تائی لے سو چاؤ چینگ، جو ڈے اور بہت سے دوسرے قائدین شامل ہیں۔ اور انہوں نے سالہا سال تک پارٹی کے اندر مسلسل جدوجہد کی ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرا نکتہ نظر اور پالیسی ان ڈھلمل افراد، جو غیر طبقاتی پیٹی بورژوا اور تنگ نظر قوم پرستی کے انداز میں سوچتے تھے، کی طرف سے چلائی جا رہی تھی۔ اس گروہ کے نزدیک طبقاتی جدوجہد اور سماج میں طبقاتی تقسیم کا نکتہ نظر کبھی بھی اہم نہیں رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ان کے نزدیک محنت کش طبقے کے ساتھ حقیقی جانبداری کا کبھی صحیح طریقے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ ماؤزے تنگ کا تعلق اسی گروہ اور اسی نکتہ نظر سے ہمیشہ رہا ہے اصولی طور پر یہ نکتہ نظر ان تمام لوگوں کے لئے جاذب نظر ہوتا ہے جن کی طبقاتی بنیادیں بنی ہوتیں جو تنگ نظر قوم پرستی کا شکار ہوتے ہیں اور یہی وہ نکتہ نظر ہے جو ماؤ کے افکار' کہلائے۔

آپ کی پارٹی کی پوری تاریخ بے مثال جدوجہد اور قربانیوں سے اٹی پڑی ہے کیونکہ آپ کے طبقاتی دشمن نے اپنی پوری توجہ شہروں پر مرکوز رکھی تھی اور اس طرح سب سے زیادہ ظلم و ستم مزدور طبقے کو برداشت کرنا پڑا چنانچہ مزدور طبقہ کے ان گنت قائدین اس جدوجہد میں اپنی جان ہار بیٹھے اور یہ وہی قائدین تھے جن کا مزدور طبقے کے انقلابی فلسفے پر اعتماد اور اعتقاد تھا اور یہی اعتماد اور اعتقاد ان کو دشمن کے خلاف لڑنے پر اکسا تا تھا۔ یہی بہترین قائد تھے جو مارکسزم لینزم کے فلسفے پر پورا یقین رکھتے تھے اس تمام جبر و ظلم کا نتیجہ کیا ہوا کہ پارٹی میں مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اور قائدین کی تعداد کم ہونی شروع ہوگئی اس پورے عمل کا اثر آپ کی پارٹی کی اندرونی کش مکش پر بھی پڑا اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ چینی انقلاب میں کامیابیاں مارکسی سوچ رکھنے اور مزدور طبقے کے فلسفے پر اعتماد رکھنے والوں کی جدوجہد کی وجہ سے حاصل ہوئیں اور جو ناکامیاں اب تک ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کا منبع وہی درمیانہ طبقے اور عدم طبقاتی سوچ رکھنے والے ڈھلمل عناصر ہیں۔

افکار ماؤزے تنگ

سب سے زیادہ بنیادی خامی جو ماؤزے تنگ کے افکار کی اساس بنی ہے وہ یہ ہے کہ، نہ تو ماؤزے تنگ نے طبقاتی جنگ کے فلسفے کو سمجھا ہے اور نہ ہی اس کو دل و جان سے تسلیم کیا ہے اس طرح سے اس نے مارکس کے اس بنیادی اصول کو "آج تک تمام سماجوں کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے" اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اس سے ماورا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبقاتی جدوجہد، ماؤزے تنگ کے لئے کبھی بھی اہم نہیں رہی اس کے نزدیک طبقاتی کش مکش بھی دوسرے عوامل جتنی ہی اہم ہے حقیقت میں تو ماؤزے تنگ نے اس بنیادی سچائی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا کہ سرمایہ دار طبقے اور مزدور طبقے کے تضادات، موجودہ سماج میں بنیادی تضادات ہیں۔ اس نے پوری دنیا کو مختلف تضادات کا مجموعہ گردانا ہے۔ نتیجہ کیا نکلا ہے کہ ماؤزے تنگ نے کبھی بھی مزدور طبقے کو جو موجودہ سرمایہ دار نظام کے بنیادی تضاد کی سب سے اہم تخلیق ہے ایک مستقل انقلابی طبقے کے طور سے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا ہے اس طرح سے وہ مزدور طبقے کے تاریخی رول کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے طبقاتی جدوجہد اس کے نزدیک بنیادی اہمیت کی حامل نہیں۔ اس کے افکار میں یہ طبقاتی جنگ تاریخ کا محور نہیں ہے۔ وہ عدم طبقاتی قوم پرستی کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی خامی کہ ماؤ یا تو طبقاتی جدوجہد کو سمجھ ہی نہیں سکا یا اس نے سماج کی طبقاتی نوعیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہی نکتہ نظر اس لئے پورے افکار اور سماجی رد و بدل کے متعلق "ماؤ ازم" کے داخلی رد عمل کی اساس بنا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان اپنے ارد گرد کے حالات کو طبقاتی جدوجہد کے نکتہ نظر سے جاننے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ پھر وہ کسی ایک طبقے کا حامی کیسے بن سکتا ہے اور اس کش مکش میں وہ محنت کش طبقے کا ساتھی کیسے بن پائے گا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے عدم طبقاتی نکتہ نظر میں مزدور طبقے کی حمایت صرف ایک خالی خولی نعرہ رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب طبقاتی جدوجہد پر ہی اعتقاد نہیں ہوگا یا مزدور طبقے کے بین الاقوامی کردار اور بین الاقوامی بھائی چارے پر کیسے یقین آئے گا کیونکہ جب آپ مزدور طبقے

کو اپنا طبقہ نہیں تسلیم کریں گے تو پھر ان حالات میں سرمایہ دار طبقے کو آپ اپنا دشمن طبقہ کیسے سمجھیں گے چنانچہ ماؤ کے درمیانی طبقہ کے تنگ نظر قوم پرستانہ افکار میں کبھی بھی طبقاتی جدو جہد کو بنیادی رہنما اصول تسلیم نہیں کیا گیا اس لئے ماؤ کا فکر کبھی بھی مزدور طبقہ کا فکر نہیں بن سکتا کیونکہ اس کی اساس طبقاتی پر ہے ہی نہیں ماؤ نے ۱۹۴۴ء میں ہی ایک امریکی نامہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم کسی صورت میں بھی پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ قائم نہیں کرنا چاہتے۔ جہاں تک ہماری حکومت کا تعلق ہے ہماری جمہوری حکومت میں زمیندار، سرمایہ دار، تاجر، کسان اور مزدور سبھی شامل ہوں گے"۔

اب یہ موقف کوئی ایسا آدمی نہیں رکھ سکتا جو طبقاتی جدوجہد میں یقین رکھتا ہو۔ اس موقف میں اور مزدور کے الفاظ میں شامل کر کے ماؤزے تنگ نے ایک طبقاتی نقطۂ نظر رکھنے والے عناصر کو ایک رعایت دی ہے۔

ماؤ کی اکثر تحریروں میں طبقاتی جدوجہد اور سماجی تضادات کا کوئی ذکر نہیں۔ چنانچہ ماؤ کہتا ہے

"دوسری خصوصیتوں کے علاوہ چین کے ساٹھ کروڑ باشندوں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ غریب اور کوڑے ہیں! ظاہراً یہ خرابی نظر آئے گی۔ لیکن حقیقت میں یہ بہت اچھی بات ہے کیونکہ کوڑے کاغذ پر جس پر کوئی نشان نہ ہو اس پر جون سی تصویر چاہیں بنا سکتے ہیں"

اس طرح سے ماؤ کے نزدیک چین ایک عدم طبقاتی کورا کاغذ تھا جس کی تاریخ میں نہ کوئی طبقے تھے، نہ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ۔

یہ درست ہے کہ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندوں کے تاثرات کی صحت محل نظر ہو سکتی ہے۔ لیکن حال ہی میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے جو خفیہ دستاویزات شائع کی ہیں۔ ان میں مسلسل سوویت دشمن پالیسی اور طبقاتی جدوجہد سے انکار نمایاں نظر آتا ہے مثال کے طور پر ۱۹۴۴ء میں ڈیوڈ بارینٹ نے ماؤزے تنگ سے ملاقات کے بعد ماؤ کی گفتگو کو ماؤ کے الفاظ میں یوں قلم بند کی ہے۔

"ہم ہر وقت آپ کی مدد، شکریے کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم دل و جان کے ساتھ بغیر کسی شرط عائد کئے امریکی جنرل کے تحت کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ہیں آپ کی طرف ہمارے جذبات"۔

اور

"چین میں ہر امریکی فوجی جمہوریت کا چلتا پھرتا اشتہار ہے اس کو ہر چینی سے اس ضمن میں گفتگو کرنی چاہیئے اسی طرح امریکی فوجی افسروں کو چینی فوج کے افسروں سے بھی اس موضوع پر گفتگو کرنی چاہیئے کیونکہ ہم امریکیوں کو بہترین جمہوریت کا مظہر سمجھتے ہیں"۔

آخر میں ماؤ کہتا ہے۔

"چین کو ہر حال میں صنعتی ملک بننا چاہیئے۔ یہ آزادانہ سرمایہ کاری اور بیرونی سرمایہ سے

ہی ہو سکتا ہے۔ چین اور امریکہ کے مفادات یکساں اور ایک دوسرے سے گتھے ہوتے ہیں"
اس دور میں ان تمام عناصر سے تعاون ضروری تھا جو عالمی فاشزم کے خلاف مصروف پیکار رہتے لیکن اس رپورٹوں سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ماؤ نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی کوئی ضرورت نہ تھی یہ رپورٹیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں سوویت دشمنی کے رجحانات جگہ جگہ ملتے ہیں یہ درست ہے کہ لینن نے کہا تھا کہ سامراجی ممالک کے درمیان تضادات کو استعمال کرنا چاہیئے اور مزدور کسی ایک ملک کے اجارہ دار سرمایہ داروں کے تضادات کو بھی استعمال کرنا چاہیئے لیکن یہ تضادات اپنے طبقاتی دشمنوں کے درمیان استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ماؤ یہ نہیں کرتا بلکہ ماؤ ازم سامراج اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان جو تضادات ہیں ان کو پوری ابن الوقتی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ سامراجی امریکہ اور سوشلسٹ روس کے تضادات سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یقینی طور پر کوئی بھی سوشلسٹ جو طبقاتی جدوجہد میں یقین رکھتا ہو اور مزدور طبقے کا حامی ہو وہ یہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔

ماؤ ازم کی ابن الوقتی

تاریخ کے ایسے دور میں جب ایک طرف سرمایہ دار ممالک ہوں دوسری طرف سوشلسٹ ممالک ہوں تو سوشلسٹ ممالک کی قیادت کے پاس دو ہی راستے ہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک طبقے کی حمایت کا فیصلہ کیا جاتے لیکن ماؤ ازم نو طبقاتی جدوجہد میں یقین ہی نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ اس طبقاتی دنیا میں وہ اس کو راہنما اصول تسلیم کرتا ہے کہ دنیا دو کیمپوں اور دو طبقوں" سوشلسٹ دنیا اور سرمایہ دار دنیا میں منقسم ہے۔

دوسری انٹرنیشنل میں شامل سوشلسٹ پارٹیوں کی ابن الوقتی پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اس وقت آشکارا ہوئی جب کہ اس دنیا پر سامراج حاوی تھا اور اس کا تسلط ایک حقیقت تھی اس لئے اس زمانے میں سوشلسٹ پارٹیوں کو اپنے ملکوں کے حکمران طبقوں کے دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑتے تھے۔ لیکن ماؤ ازم کی ابن الوقتی اس وقت آشکارا ہو رہی ہے جب کہ دنیا دو متحارب سماجی نظاموں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس لئے ماؤ ازم سرمایہ داری سے سوشلزم کے عبوری دور کا فلسفہ ابن الوقتی ہے۔ بنیادی طور پر ماؤ ازم مزدور طبقے کے مفادات اور سوشلزم سے غداری کا فلسفہ ہے تاکہ امپیریل ازم کے دسترخوان سے کچھ ہڈیاں ان کے حصے میں آجائیں۔ ماؤ ازم اصل میں سامراج کے مفادات کے لئے بالخصوص سامراج کے راستہ امریکی سامراج کے لئے فضا سازگار بناتا ہے اور ماؤ ازم کے لئے یہ ابن الوقتی اس لئے اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ تمام دوسرے سوشلسٹ ملک سامراج کے خلاف جدوجہد کی پختہ پالیسی پر کاربند ہیں بالکل اسی طرح جیسا کہ جب مزدور طبقہ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے خلاف شدید جنگ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت مزدور طبقہ کا دھلمل اور ہڑتال توڑ عناصر اپنی خدمات اجارہ دار سرمایہ دار اور کارخانہ داروں کو اس لئے فروخت کر دیتا ہے۔ کیونکہ جب کہ مزدور طبقہ شدید جنگ میں مصروف ہوتا ہے ماؤ ازم اس دور کا فلسفہ اور ابن الوقتی ہے جب

سرمایہ داری نظام روبہ زوال ہے اور وہ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو رہا ہے اور اس دور میں ماؤازم اس پسپائی کے عمل کو روکنے کے لئے انقلابی عمل کی عالمی طاقتوں میں نفاق اور پھوٹ ڈال کر اس کو کمزور کرنے کا جتن کرتا ہے۔ ماؤازم اپنی خدمات کو آج سامراج کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے۔ ماؤازم کے نزدیک آج دو سماجی نظاموں کے تضادات کو صرف اسی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے کہ چین جیسا سوشلسٹ ملک سامراج کا کھیل کھیلے اس کے مہرے چلے اور اس کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے ایسے سوشلسٹ ملک کے لئے سامراج کے ہاتھ میں کھیلنا اور اس کے عوض میں امداد حاصل کرنا سامراج کی خدمت نہیں تو کیا ہے؟ اور سامراج کی یہ خدمت مزدور طبقہ سے غداری نہیں تو کیا ہے! یہ درست ہے کہ سامراج کچھ ادائیگیاں کرنے کے لئے تیار ہے لیکن یہ ادائیگیاں مزدور طبقے کے عالمی مفادات سے غداری، قومی آزادی کی تحریکوں کی پشت میں خنجر گھونپنے اور سوشلزم کے خلاف محاذ قائم کرنے کی قیمت پر قائم کی جاتی ہیں۔

سامراجی مقاصد

آپ کی پارٹی کی تمام پالیسیاں سامراج کے مفاد میں ہیں کیونکہ یہ پالیسیاں انقلابی تحریکوں کو کمزور کرتی ہیں اور سامراج کو اس دور میں اس سے زیادہ اور کسی بات کی خواہش ہو سکتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ آپ کی پارٹی کی پالیسیاں قومی آزادی کی تحریکوں میں پھوٹ ڈال رہی ہیں۔ ان کو سوشلزم کی تحریک سے الگ کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہیں اور عالمی کمیونسٹ تحریک کے اندر پھوٹ ڈالی جا رہی ہے اور ریشہ دوانیاں کی جا رہی ہیں ان تمام اقدامات اور پالیسیوں پر سامراج جتنا بھی خوش ہو اتنا ہی کم ہے تاریخ ایک اور طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ سامراج بڑی بڑی ادائیگیوں کے وعدے وعید ضرور کرتا ہے۔ لیکن عملاً یہ وعدے بہت ہی کم پورے کئے جاتے ہیں اور ان کے فوائد بہت ہی محدود ہوتے ہیں امریکی سامراج اس وقت تک چین کو قرض بھی دیتا رہے گا۔ اس کے ہاتھ فوجی اسلحہ بھی فروخت کرتا رہے گا جب تک کہ چین کی پالیسیاں سامراج کے مفادات پر پوری اترتی ہیں۔ اس وقت امریکی سامراج کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ چین اور سوویت یونین کے مابین جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں۔ امریکی سامراج کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ چین کو اپنی صنعت کی سوشلسٹ بنیادوں کو تعمیر کرنے کی راہ سے دور ہٹا دے اور اس کو غیر پیداواری فوجی طاقت بڑھائے اور اسلحہ کے انبار لگانے میں مصروف کر دے۔

ابن الوقتی کی راہ ایک ایسی راہ ہے جو کبھی منزل تک نہیں پہنچاتی لیکن تاریخ بھی بہت ظالم شئے ہے اور تاریخ نے مزدور طبقہ کو یہ سکھایا ہے کہ اپنی جد و جہد میں کامیابی کے لئے اتحاد اور انتھک جد و جہد پہلی شرط ہے، سرمایہ داروں، کارخانہ داروں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے تلوے چاٹنے سے کبھی حتمی فتح حاصل نہیں ہوتی اور عالمی سرمایہ داری نظام اور عالمی سوشلسٹ نظام کے درمیان جو عالمی کشمکش جاری ہے وہ بھی ان کلیوں سے مستثنیٰ نہیں ہے آپ کی پارٹی کے

کمی ایک فائڈین نے آپ کو اس ابن الوقتی کی پالیسیوں کے مہلک نتائج کے بارے میں متنبہ کیا تھا اور لیو شاؤچی کا اسی طرف اشارہ تھا جب اس نے کہا تھا۔

" اگر کوئی شخص قوموں کے سرمایہ دارانہ تصور اپنائے اور سوویت یونین سے اتحاد و تعاون کرنے کی بجائے اس کی مخالفت کرے، عوامی جمہوریتوں سے اتحاد کی بجائے ان کی مخالفت کرے تمام ممالک کے کمیونسٹوں، مزدور طبقوں اور جمہوری طاقتوں کے ساتھ اتحاد کی بات کرنے کی بجائے ان کے خلاف دشمنی کی راہ اپنائے، اسی طرح قومی آزادی کی تحریکوں اور مظلوم قوموں کی حمایت کی بجائے ان تحریک اور مظلوم قوموں کے خلاف قدم اُٹھائے تو اس صورت میں کوئی اور راستہ باقی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ امریکی سامراج اور دوسرے سامراجی ممالک سے دوستی اور اتحاد کی پینگیں بڑھائی جائیں اور بالآخر یہ راستہ صرف سامراجی کیمپ میں لے جائے گا اور یہ راستہ اپنی قومی آزادی سے دور کر دے گا۔ سوشلزم سے دور لے جائے گا اور آخر کار خود اپنا ملک امریکی سامراج کے شکنجے میں جکڑا جائے گا اور سامراج کی دھوکہ بازی اس کا مقدر ہوگی اور نتیجتاً یہ ملک اپنی آزادی کھو بیٹھے گا اور سامراجیوں کی نوآبادی بن جائے گا "

سیاسی تجزیہ بہی کھاتہ نہیں ہوا کرتا کہ آمد و خرچ کو متوازن کیا جائے نہ ہی سیاسی تجزیہ مثبت اور منفی کا توازن ہوتا ہے۔ سچ کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ غلط اور درست پالیسیوں کے عملی نتائج کا صحیح طریقے سے جائزہ لیا جائے اس لئے ماؤ ازم کا تجزیہ غلط پالیسیوں کے عملی نتائج کا حساب کتاب ہے۔ ماؤ ازم کی وجہ سے اس جہاں رنگ و بُو کے بسنے والوں کو جن مصائب، جن مشکلات اور جتنی قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کا صحیح تخمینہ لگانا تقریب قریب ناممکن ہے صرف اتنا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ماؤ ازم نہ ہوتا، اگر عالمی انقلابی تحریک میں پھوٹ نہ پیدا کی جاتی۔ اگر سوشلسٹ دنیا کی کردار کشی کی مہم ماؤ پرستوں کی طرف سے نہ چلائی گئی ہوتی، اگر قومی آزادی کی تحریکوں میں پھوٹ اور نفاق نہ ڈالا گیا ہوتا تو آج یہ جہان رنگ و بو میں انقلاب کی صورتِ حال ایسی نہ ہوتی اس لئے ماؤ ازم کی جرائم کا صحیح تخمینہ تو صرف تاریخ ہی لگا سکے گی۔ سماجی تبدیلیوں کی رفتار کتنی تیز ہو گئی ہوتی اور دنیا کا رنگ کتنا بدلا ہوتا۔

ماؤ ازم نے ان تمام جرائم کا ارتکاب کیوں کیا؟ صرف چند بے معنی مراعات کی خاطر لیکن عملاً صرف خیالی و خالی خولی وعدوں کی بنیاد پر جو عالمی سامراج نے اس کے ساتھ کئے اس کے مقابلے میں اگر عالمی انقلابی طاقتیں متحد رہتیں تو وہ کہیں زیادہ بامعنی اور بامقصد فتوحات حاصل کر چکی ہوتیں، اور سوشلزم کی تعمیر کہیں آگے پہنچ گئی ہوتیں اور اس سے خود چین بہت حد تک مستفید ہو چکا ہوتا لیکن ماؤ ازم نے دو نظاموں کے درمیان کش مکش سے ابن الوقتی کے انداز میں فائدہ اٹھا کر مزدور طبقے سے غداری کی ہے اور ماؤ پرستوں نے ایسا جوا کھیلا ہے جس میں ہار ہی ہار ہے کیونکہ انقلابی جدوجہد

کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ابن الوقتی ایک ایسی دلدل ہے جس میں اگر انسان ایک دفعہ پھنس جائے تو پھر وہ نیچے ہی نیچے دھنستا چلا جاتا ہے۔

ہم یہ سطور اس بنا پر رقم کر رہے ہیں کہ ہمارے دونو ملکوں کے عوام اور ہماری پارٹیوں نے ماضی میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ عظیم لڑائیاں لڑی ہیں ہماری پارٹی اور ہمارے کروڑوں عوام نے اپنے سامراج کے خلاف اور چین کی حمایت میں شاندار جدوجہد کی ہے ہم نے چین کے خلاف امریکی سامراج کی ملکشدانہ پالیسیوں کی زبردست مخالفت کی ہے ہم نے ان تمام اقدام کی شدید مزاحمت کی ہے ہم نے اس وقت بھی جدوجہد کی تھی جب جاپان، چین کو تختہ مشق بنا رہا تھا۔ ہم نے اس وقت بھی ثابت قدمی کے ساتھ جنرل میکارتھر کے تمام ارادوں کی مزاحمت کی تھی۔ جب وہ چین پر ایٹم بم استعمال کرنا چاہتا تھا۔ جب آپ نے جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف فتح حاصل کی تھی اور امریکہ آپ کے انقلاب کو ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا تو وہ ہم ہی تھے جنہوں نے "چین سے دور رہو" کی زبردست مہم چلائی تھی ہمیں پورا یقین اور اعتماد ہے کہ ہم ان سطور میں جن جذبات کا اظہار کر رہے ہیں وہ دنیا بھر کے انقلابیوں کے جذبات ہیں وہ ان تمام کروڑوں انسانوں کے جذبات ہیں جو سوشلزم کی تعمیر میں مصروف ہیں یہ ان تمام لوگوں کے جذبات ہیں جو سامراجی ظلم وستم کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ ان کروڑوں انسانوں کے بھی جذبات ہیں جو نوآبادیاتی نظام کے خلاف مصروف پیکار ہیں۔ یہ ان کروڑوں انسانوں کے بھی جذبات ہیں جو آج دنیا اور امن عالم کے لئے مصروف جہد ہیں۔ ان کروڑوں انسانوں کے بھی یہی جذبات ہیں جو اس عالم دل فریب کو ایٹمی جنگ کا ایندھن نہیں بننے دینا چاہتے۔

ہم انسانیت کے ایک بہت ہی کثیر حصے کی ترجمانی کرتے ہیں جب ہم یہ کہتے ہیں۔

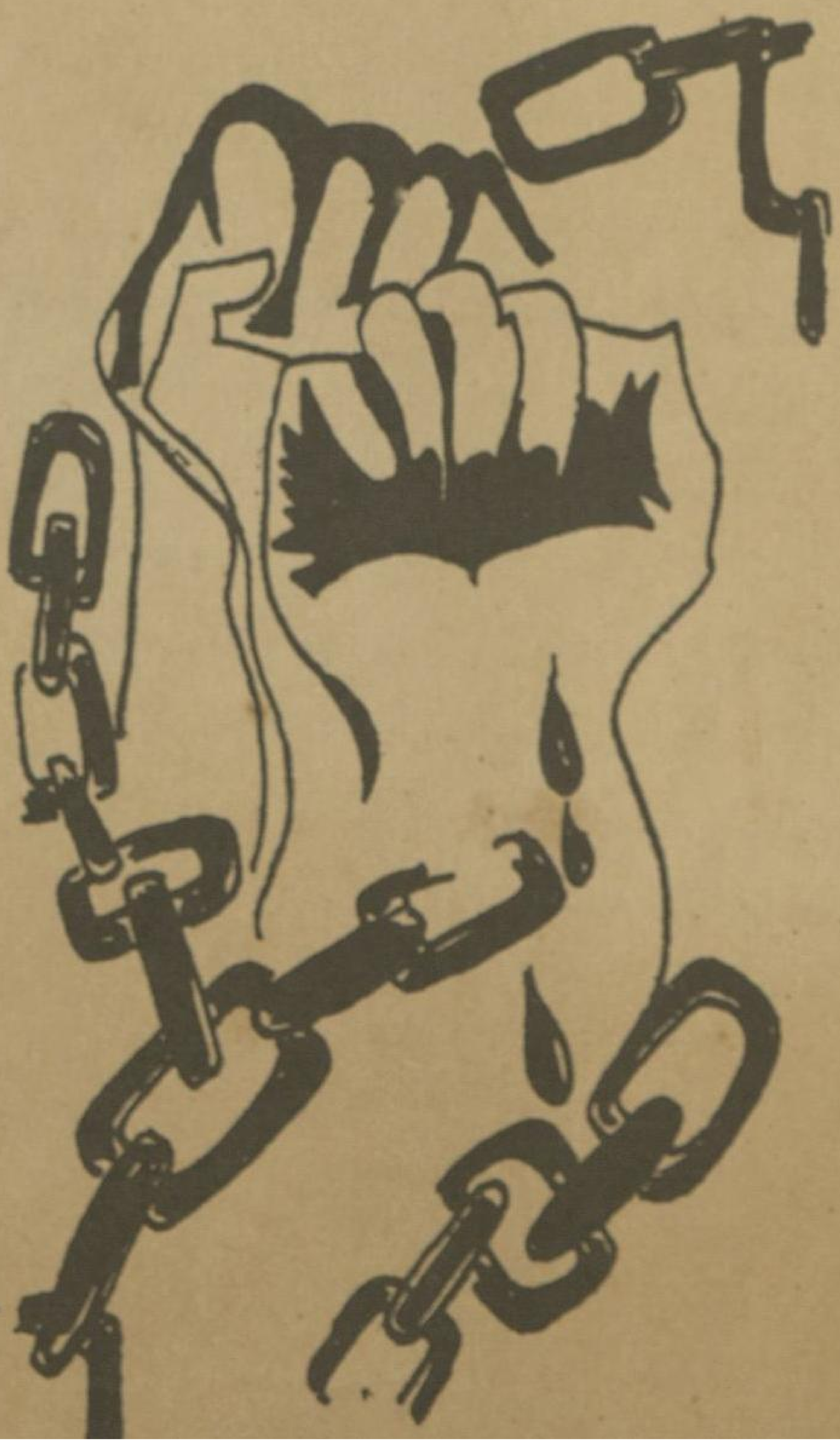
"ذرا خدارا غور کیجئے کہ آپ کس راستے پر چل رہے ہیں! آپ کی منزل کدھر ہے؟ آپ ان طاقتوں کا تجزیہ کریں۔ جن کے ساتھ آپ ناطہ جوڑ رہے ہیں۔ اگر آپ ٹھنڈے دل سے تجزیہ کریں گے تو آپ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آپ نے جو راہ اختیار کی ہے وہ موت کی راہ ہے۔ ہلاکت کی راہ ہے۔ یہ راہ چینی عوام کے مفاد کی راہ نہیں ہے۔ نہ ہی انکی خوشحالی اور درخشاں مستقبل کی راہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آج پوری انسانیت جب عالمی سرمایہ داری سے عالمی سوشلزم کے دور میں داخل ہو رہی ہے تو آپ کی پالیسیاں اس تاریخی دور سے لگا نہیں کھاتیں"

ہم اس امید پر یہ مکتوب رقم کر رہے ہیں کہ اس سے ہماری دونو پارٹیوں کے درمیان ان اٹھائے گئے سوالوں پر بحث وتمحیص شروع ہو سکے گی۔ آج ایٹمی جنگ روکنے، سوشلزم کی تعمیر قومی آزادی کی تحریکوں کی کامیابی اور امریکہ اور چین دونوں کے عوام کی بہتری کے لئے یہ سوالات زبردست اہمیت کے حامل ہیں۔

آپ کا خیر اندیش
گس ہال
جنرل سیکرٹری۔ کمیونسٹ پارٹی۔ امریکہ

"اس دن
میرے ہاتھ، دوسرے ہزاروں ہزاروں ہاتھوں کے ساتھ مل کر
ایک زنجیر بنائیں گے
اور ہم زمین سے اُبھر کر
نیلے آسمان کی جانب روانہ ہوں گے
ہماری بندوقیں دشمن کی سرزنش کریں گی
تاکہ اسے زمین کے نیچے
ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے۔"

تھی بون ——— ویت نام



احتساب

۱۹۶۸ – ۶۹